رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

قیمت عر

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸/ کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

ملنے کا پتہ: منیجر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگار بک ایجنسی، لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ/)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲-افسانے ۱۹۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت چار روپیہ (للعہ/)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ/)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ/)

علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اسکی عہد بعہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مع انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جس میں بسات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں

حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عا/ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت عہ/ علاوہ محصول

نگار

اس اشاعت کا کاپی رائٹ حاصل کر لیا گیا ہے اس لئے کوئی صاحب اس سے نقل یا اخذ و اقتباس نہ کریں

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد-۳۹ | شمارہ-۱-۲

فہرست مضامین

بزم نگار ------ اڈیٹر ------ ۳
آرزو لکھنوی ------ ۹
آسی الدنی ------ ۱۶
اثر لکھنوی ------ ۲۶
احسان دانش ------ ۳۶
علی اختر اختر ------ ۴۲
اختر شیرانی ------ ۴۹
امید امیٹھوی ------ ۵۴
بیخود دہلوی ------ ۶۱
تاجور نجیب آبادی ------ ۶۶
میرزا ثاقب لکھنوی ------ ۷۲
جلیل مانک پوری ------ ۸۰
جگر مرادآبادی ------ ۹۰
جوش ملیح آبادی ------ ۹۸
حسرت موہانی ------ ۱۰۶
حفیظ جالندھری ------ ۱۱۳
ولی شاہجہاں پوری ------ ۱۲۲
روش صدیقی ------ ۱۲۸
پنڈت امرناتھ ساحر ------ ۱۳۲
سیماب اکبرآبادی ------ ۱۳۵
فانی بدایونی ------ ۱۴۵
فراق گورکھپوری ------ ۱۵۰
پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ------ ۱۶۳
تلوک چند محروم ------ ۱۶۶
انند نرائن ملا ------ ۱۷۱
ناطق گلاوٹھوی ------ ۱۷۸
ناطق لکھنوی ------ ۱۸۳
نوح ناروی ------ ۱۸۹
وحشت کلکتوی ------ ۱۹۲
یگانہ چنگیزی ------ ۱۹۶
آزاد انصاری ------ ۲۰۱
افسر میرٹھی ------ ۲۰۹
اردو کا رنگ تغزل ------ نقاد ------ ۲۱۳
بقیہ بزم نگار ------ ۲۲۲

93674

بزمِ نگار

آج قارئینِ نگار کے سامنے جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، وہ غالباً اُردو ادب اور اُردو تذکروں کی دُنیا میں بالکل پہلی چیز ہے۔

اس وقت تک جتنے تذکرے شایع ہوئے ہیں، ان کی نوعیت یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے تذکروں سے کچھ حالات فراہم کرکے اپنی پسند کے چند اشعار لے لیتا ہے اور اُن پر اظہار رائے کر دیتا ہے۔ اس قسم کے تذکروں کی تاریخی اہمیت تو اس لئے ضعیف ہوتی ہے کہ ان کی ترتیب میں تذکرہ نگار خود کوئی مورخانہ جستجو نہیں کرتا اور ان کی انتقادی حیثیت اس لئے کمزور ہوتی ہے کہ ان میں کلام شعراء پر کوئی صحیح نقد و تبصرہ بھی نہیں ہوتا۔ اس قسم کے تذکرے دراصل ایک طرح کی بیاض ہیں جن میں تذکرہ نگار اپنی پسند کے چند اشعار جمع کر دیتا ہے اور خود اپنے ذوق کے لحاظ سے پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے اظہار کو کافی سمجھتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اس قسم کے تذکروں کا دور ختم ہو گیا ہے اور اب جو کچھ لکھا جا رہا ہے، اس میں نسبتاً زیادہ چھان بین سے کام لیا جاتا ہے، لیکن خود شاعر کا ذوق معلوم کرنے کی کوشش اب بھی نہیں کی جاتی، یعنی ہم خود اپنی جگہ تو یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ایک شاعر کا فلاں شعر اچھا ہے اور فلاں شعر بُرا، لیکن خود شاعر کی پسند کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

وہ شعراء جو اس وقت موجود نہیں ہیں، ان کے متعلق تو اب یہ کاوش بیکار ہے کہ وہ اپنے کن کن اشعار کو زیادہ پسند کرتے تھے، لیکن وہ جو ہنوز زندہ ہیں ان کی پسندیدگی کا علم ہم کو ضرور حاصل ہو سکتا ہے اور منجملہ دیگر محرکات کے ایک یہ خیال بھی تھا جس کی بنا پر میں نے عہدِ حاضر کے تمام اکابر شعراء کو تکلیف دی کہ وہ خود اپنے کلام کا انتخاب مرحمت فرمائیں۔ اور غالباً میری یہ کوشش کہ عہدِ حاضر کے تمام خوش فکر اساتذہ کا خود انتخاب کیا ہوا کلام آپ کو ایک جگہ مل جائے، حال و مستقبل دونوں زمانوں کے نقادوں اور تذکرہ نویسوں کے لئے بہت مفید ثابت ہو گی۔ انتخاب کے ساتھ حالات بھی آپ کو نظر آئیں گے اور یہ بھی سب خود شعراء کے فراہم کئے ہوئے ہیں، خواہ انھوں نے خود اپنی طرف سے انھیں لکھا ہو یا دوسری کی طرف سے۔

اول اول یہ خیال میرے دل میں کیوں پیدا ہوا، اسے بھی مختصراً سن لیجئے: یہ امر مسلّم ہے کہ سخن گو ہونا اور چیز ہے اور سخن فہم ہونا دوسری۔ یعنی ممکن ہے کہ ایک شاعر خوش فکر ہو اور خوش فہم نہ ہو اور اس طرف سب سے پہلے میرا

ذہن اس وقت منتقل ہوا جب میں نے میر کا خود انتخاب کیا ہوا کلام دیکھا۔ میر اس لحاظ سے کہ وہ بہت سے نشتر رکھنے والے دیوان کا خالق ہے، یقیناً "خدائے سخن" ہے، لیکن جب میں نے خود اس کا انتخاب دیکھا تو مجھے "شعر فہمی عالم بالا" کی طرف سے سخت مایوسی ہوئی۔ چنانچہ دوسرا محرک یہ خیال بھی تھا کہ اگر اسوقت کے شاعروں کی خوش گوئی اور خوش فہمی دونوں کی مستند دستاویز ہم کو میسر آجائے تو یہ تبصرہ نگاروں کے لئے بڑے کام کی چیز ہوگی، علاوہ ان دو باتوں کے ایک تیسری بات اور بھی تھی جس نے مجھے اس طرف مایل کیا۔

غزل کے آپ جتنے دور چاہیں قایم کریں، لیکن ولی اور میر کے زمانہ سے لیکر چند سال پہلے تک "حسن و جمال" کا ذکر خالص عشق و محبت کی زبان میں، کم و بیش ہر دور میں غرض مشترک کی حیثیت سے پایا جاتا تھا، لیکن اب کچھ زمانہ سے "حسن اس پرپوش" کا ختم ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن "بیاں اپنا" ضرور بدلتا جارہا ہے۔ یقیناً یہ تبدیلی دفعتاً نہیں ہوئی، بلکہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے آہستہ آہستہ ہر دور میں کچھ تغیر ہوا اور اس تغیر کا اثر چونکہ موضوع شاعری پر بھی پڑا، اس لئے غزل کی زبان، اور اس کا اسلوب بیان بھی بدلتا رہا، لیکن اب اس تغیر نے چونکہ انقلاب کی صورت اختیار کرکے غزل گوئی کی طرف سے انحراف و بغاوت کے جذبات لوگوں میں پیدا کر دئے ہیں، اس لئے ہم اب اسے نمایاں طور پر محسوس کرنے لگے ہیں۔

غزل میں سب سے پہلی آمیزش فلسفہ و تصوف کی ہوئی اور اس میں شک نہیں کہ جس نے اول اول غزلگوئی میں یہ مذہب اختیار کیا وہ سخت "ناکافر" انسان تھا جو ہمارے کرۂ زمین کے "دلبرانِ مہوش" کی "کارگاہِ حسن و محبوبی" کو ہمیشہ کے لئے ویران کر گیا۔

اُردو غزل میں فلسفہ و تصوف کیوں آیا؟ اس کے متعدد اسباب بتائے جاتے ہیں، لیکن ایک وہ جس کی طرف لوگوں نے بہت کم توجہ کی ہے، میں بیان کرتا ہوں۔

آپ اگر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ "مجاز" میں "حقیقت کا مشاہدہ کرنے والے اور "دختِ رز" کا رشتہ کوثر و تسنیم سے جوڑنے والے شاعر دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو قدرت کی طرف سے فکر موزوں تو لائے تھے، لیکن چونکہ ان کے دل و دماغ کی ساخت "جرأت رندانہ" کی مقتضی نہ تھی، اس لئے ان کا ملکۂ شاعری بجائے "قامت دوست کے طوبیٰ پر صرف ہونے لگا یعنی جو گناہ وہ یہاں نہ کر سکتے تھے اسے دوسری دُنیا پر اُٹھا رکھا، جہاں دنیا کا ہر گناہ عطیۂ خداوندی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ یا اگر ہم زیادہ مرزایر نگاہِ نقد سے کام لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کا احساس اس قدر لطیف نہ تھا کہ وہ دنیاوی عشق و محبت کو اس دُنیا میں رہتے ہوئے اپنے لئے جایز بنا سکتے۔ بہر حال ایک درد کو چھوڑ کر جن جن شعرا نے اپنی غزل گوئی کا مقصود ابتدا ہی سے فلسفہ و تصوف قرار دیا، ان میں سے ایک قسم تو وہ تھی جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔ دوسری قسم اُن شاعروں کی تھی جنھوں نے ابتدا میں تو سب کچھ وہی کہا جو "فردوس گوش و نظر" تھا، لیکن جب قوا میں کمزوری اور جذبات میں تھکن

پیدا ہوئی تو وہ صرف "فردوس" کی باتیں کرنے لگے، یعنی ان کی شاعری بجائے اس دنیا سے متعلق ہونے کے دوسری دنیا سے وابستہ ہوگئی۔

اس حقیقت کو سامنے رکھ کر جب آپ اس وقت کی غزل گوئی پر نگاہ ڈالیں گے تو اس کے موجودہ رجحان و میلان کی اندرونی تہوں میں بھی زیادہ تر وہی چیز کارفرما نظر آئے گی جس کا ذکر ابھی کیا گیا اور کمتر اس چیز کا فقدان جسے میں اسی دنیا کا "احساسِ بلند و لطیف" کہتا ہوں۔

پچھلے بیس پچیس سال کے اندر ہندوستان اور اس کی آبادی جہاں تھی بظاہر وہیں ہے، لیکن سچ پوچھئے تو اس سرزمین میں سخت ذہنی انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ ملوکیت کی بساطِ رنگین جس پر شاعروں کو بھی "شاہد و شراب" سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملجاتا تھا، وہ تو عرصہ ہوا اُٹھ چکی تھی، لیکن اس کا سوگ بہت زمانہ بعد تک جاری رہا اور اس طرح معشوق کے اُٹھ جانے کے بعد بھی شعراء عرصہ تک اس کے چرچوں میں مصروف رہے، لیکن یہ "دودِ چراغِ محفل" بھی آخر کب تک رہتا، رفتہ رفتہ وہ بھی ختم ہوا اور اب شاعروں کو بعض ایسی تلخ حقیقتوں سے دوچار ہونا پڑا کہ ــــــ

"یاران فراموش کردند عشق"!

وصلِ معشوق کے بجائے خود عاشق اپنی بقا کی فکر میں اُلجھ گیا اور لطف و نشاط کی جگہ جبرِ حیات کے مسائل نے لیلی، گویا اب سب سے پہلی مرتبہ شاعروں نے دیکھا کہ ان کا دامن واقعی تار تار ہے اور رفو کرنے کی جگہ اب اس کو بدلدینا ہی ضروری ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی تعلیم و تہذیب "آئینِ دہر" بدل کر ہندوستان میں بھی اپنے قدم جما چکی تھی اور شاعری کے اُن نقوش میں جو مٹے تو نہ تھے، لیکن ماند پڑ گئے تھے، اب دوسرے ہی رنگ بھرے جا رہے تھے۔ عشق بھی حُسن کی گرفت سے کسی قدر آزاد ہوا، حُسن بھی محبّت کے بارے کسی قدر سبکدوش ہوا اور غزل میں بیانِ محبت کی جگہ اُن باتوں نے لیلی جن کو زمانہ کی ضرورت اور وقت کا اقتضاء بتایا جاتا ہے۔ پھر نظموں میں تو بڑی گنجائش تھی یعنی ملک و قوم کے مسایل آزادی سے لیکر "نہر پر چلنے والی پن چکی" تک سبھی کچھ اس میں آسکتا تھا، لیکن غزل میں ان حالات کے تحت سوائے فلسفہ و تصوف کے اور کیا لایا جاسکتا تھا۔ کیونکہ جب شاعر کی سمجھ میں خود نہ آئے کہ اسے کیا کہنا چاہئے تو ظاہر ہے کہ پھر وہ وہی کہے گا جو واقعی سمجھنے کی چیز نہیں۔

بعض حضرات تصوف کو فلسفہ سے علٰحدہ کر کے اس کے جواز کے لئے جداگانہ دلیلیں پیش کرتے ہیں لیکن دراصل دونوں ایک چیز ہیں۔ کیونکہ دونوں میں مختلف نوعیتوں سے اپنے جہل کا اعتراف کیا جاتا ہے اور اسی لئے میں تصوف محض کی شاعری کو "شئے مجہول" کہتا ہوں۔

بعض کا خیال ہے کہ میں تصوف کا مخالف ہوں، لیکن یہ صحیح نہیں، میں تو اس کا قایل ہوں کہ تصوف کا

رنگ ہی جاکر نکھرتا ہے غزل میں، لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے وہ احساس بلند و لطیف اپنے اندر پیدا کر لیا جائے جو تغزل و تصوف دونوں کی جان ہے۔ میں تصوف کے حال کا قایل ہوں، قال کا نہیں جس کا تعلق صرف اصطلاحات سے ہے نہ کہ محاکات سے اور یہ بہت مشکل کام ہے۔ اگر بیدل سے ہٹ کر کوئی شخص صوفیانہ شاعری کرتا ہے تو اس پر شعر و تصوف دونوں حرام ہیں۔

بہرحال مقصود یہ بتانا تھا کہ تغزل میں سب سے پہلا تغیر یہ ہوا کہ خالص حسن و عشق کی جگہ اس میں فلسفہ و تصوف شامل ہوا اور پھر اس کے بعد ملک کے ذہنی انقلابات نے غزل ہی کی طرف سے لوگوں میں بیزاری پیدا کرنا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ موجودہ دورِ تغزل، پچھلے ادوار سے اتنا مختلف ہے کہ اگر ہم غزل کو صرف حُسن و عشق تک محدود نہ رکھیں، تو ہمیں اس کا حال و مستقبل دونوں بہت شاندار نظر آتے ہیں اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلوب بیان کے جتنے نئے طریقے اب نظر آتے ہیں وہ اس سے پہلے کبھی نہ پائے جاتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس اُپج نے مہمل نگاری اور غلط نگاری کو بھی بہت رواج دے دیا ہے۔

نئے خیالات اور جدید اسلوب بیان کے لئے ہمارے نوجوان شاعروں میں سے اکثر نئے نئے الفاظ، نئی نئی ترکیبیں استعمال کرتے ہیں درانحالیکہ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ان الفاظ کا صحیح مفہوم اور محل استعمال کیا ہے۔ یہی حال جدید استعارات و تشبیہات کا ہے، کہ ان میں سے اکثر وہ ہوتی ہیں جن کو ہماری زبان برداشت نہیں کر سکتی اور نہ ذوق ان کے استعمال کی اجازت دیتا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ ضرور ہے کہ اب شاعری خواص کی ملکیت نہیں رہی اور اس میں جمہوریت کی شان پیدا ہو گئی ہے، یعنی دہلی، لکھنؤ اسکول کی بحث اب بے معنی ہو کر رہ گئی ہے اور زبان سے زیادہ اب حُسنِ خیال پر نگاہ جاتی ہے۔

الغرض اُردو شاعری اسوقت جس دور سے گزر رہی ہے، اس کا مستقبل اس تیزی کے ساتھ اپنی جگہ الگ پیدا کرتا جا رہا ہے کہ ممکن ہے غریب حُسن و عشق والی غزل گوئی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور یہی وہ تمام محرکات تھے، جنھوں نے مجھے اس بات کی طرف مایل کیا کہ اس دور کے تمام بڑے بڑے غزل گو شاعروں کے کلام کا انتخاب اگر ان کی پسند کا ایک جگہ فراہم کر دیا جائے، تاکہ کل کا تذکرہ نویس و تبصرہ نگار ان ہستیوں کو بھی یاد رکھنے پر مجبور ہو جو دورِ غزل گوئی کی آخری نشانیاں ہیں اور جن کے بعد شاید اس رنگ نبا ہنے والا کوئی نہ رہے گا۔

میں نے اس بزم میں شرکت کے لئے دو قسم کے غزلگو شعراء کو دعوت دی، ایک وہ جو اپنی کہنہ مشقی یا کسی اور وجہ سے اسوقت تغزل میں اُستادانہ حیثیت رکھتے ہیں عام اس سے کہ وہ میرے یا آپ کے نقطۂ نظر سے اچھے شاعر ہوں یا نہ ہوں اور دوسرے وہ شعراء جن کی شاعری کی ابتدا غزلگوئی سے ہوئی، لیکن شہرت حاصل ہوئی انھیں نظموں کے ذریعہ سے اور وہ واقعی اچھا کہنے والے بھی ہیں۔

پہلے گروپ کے شعراء میں سے میں نے کسی کو نہیں چھوڑا، اور ہو سکتا ہے کہ دوسرے گروپ میں کوئی رہ گیا ہو، لیکن

اگر آپ اُن خصوصیات کو سامنے رکھیں گے جن کا میں نے ذکر کیا ہے تو دوسرے گروپ میں وہی شعراء رہ گئے ہوں گے جو غیر معمولی شہرت نہیں رکھتے اور اگر رکھتے ہیں تو فی الحقیقت وہ اچھے شاعر نہیں اور غلط گو ہیں۔

پرانے غزل گو شعراء میں سے آپ کو دو شاعر اس بزم میں نظر نہ آئیں گے، ایک حضرت سائل دہلوی، دوسرے جناب صفی لکھنوی۔ جناب سائل تو اپنی بیماری کی وجہ سے انتخاب کی زحمت گوارا نہ کر سکے اور حضرت صفی کے متعلق میں اس سے زیادہ کہنا مناسب نہیں سمجھتا کہ میں نے ان کا انتخاب حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انھوں نے انکار سے لیکر وعدۂ فردا تک کوئی معشوقانہ ادا ایسی نہ تھی جو صرف نہ کر دی ہو، اور میں ان کا انتخاب حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

مجھے ان دونوں بزرگوں کی عدم شرکت پر سخت افسوس ہے، لیکن میرا ضمیر غیر مطمئن نہیں ہے۔

پہلے گروپ کے خالص لکھنوی شعراء میں سے چار کا نام آپ کو نظر آئے گا۔ آرزو، ثاقب، اثر اور ناطق یہ چاروں حضرات ملک میں کافی شہرت رکھتے ہیں، آرزو صاحب کا تو حلقۂ تلامذہ بھی بہت وسیع ہے لیکن ثاقب صاحب نے شاید اس دردسری کو قبول نہیں کیا اور ان کی معنوی اولاد اگر ہے تو بہت کم ہے۔

جناب آرزو جلال لکھنوی کے شاگرد و جانشین ہیں اور صحت زبان و بیان کے لحاظ سے استنادی حیثیت رکھتے ہیں، آپ کی غزل گوئی کو دو دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک وہ جب آپ کا قیام لکھنؤ میں تھا اور صرف جلال مرحوم کے رنگ تغزل میں نکھار پیدا کر رہے تھے، دوسرا دور وہ جب آپ کلکتہ چلے گئے اور ضرورتاً خالص ہندوستانی زبان میں شاعری شروع کی۔ اس رنگ کا مجموعہ آپ کا "سریلی بانسری" کہلاتا ہے اور اپنے سادگی زبان کے لحاظ سے ہمیں میر و درد کا زمانہ یاد دلاتا ہے۔

جناب ثاقب کا شمار نہایت متین و سنجیدہ کہنے والوں میں سے ہے، اُنکے یہاں نہ عشق و محبت کا نامناسب جنون ہے، نہ خودی و خودداری کی بیجا فرزانگی، وہ نہ عاشق کی حیثیت سے زیادہ کھل کھیلنا پسند کرتے ہیں اور نہ غیر ضروری فلسفہ طرازی صرف کر کے اپنا آشیانہ بہت بلند دکھانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے ان کا کلام آپ کو الفاظ و خیال کی رکاکت سے پاک نظر آئے گا۔

مرزا جعفر علی خاں اثر ان لوگوں میں سے ہیں جو شاعر پیدا ہوئے اور شعر و شاعری ہی ان کی زندگی کا مقطع ہو گا۔ آپ نے بہت کچھ کہا ہے اور آپ کی فرصت کا مشغلہ صرف غزل گوئی ہے۔ جناب اثر کے کلام میں ہم کو لکھنؤ کا وہ رنگ بھی نظر آتا ہے جس کو سنگم انسان بچہریری لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور حسن تخیل کا وہ رنگ بھی جسے ہم آفاقی کہہ سکتے ہیں۔ اثر کی شاعری کی ابتدا گو اس زمانہ میں ہوئی جب لکھنؤ میں جذبات نگاری زیادہ تر شیون و ماتم تک محدود تھی، لیکن آپ نے اپنا دامن ہمیشہ اس سے بچایا، یہاں تک آپ اپنے اُستاد عزیز لکھنوی سے بھی اس باب میں زیادہ محتاط نظر آتے ہیں۔ زبان کی صحت کے لحاظ کوئی رائے قایم کرنا اس لئے فضول ہے کہ آپ کے خاندان کی زبان ہمیشہ ٹکسالی مانی گئی ہے۔

جناب ناطق بھی پرانے کہنے والے ہیں اور فلسفہ و تصوف کے استغراق سے علٰحدہ ہو کر اگر آپ کبھی کچھ کہہ جاتے ہیں تو

اُن میں بعض باتیں چونکا دینے والی بھی نظر آتی ہیں۔

لکھنؤ اسکول کے ایک اور بڑے شاعر بھی آپ کو اس بزم میں نظر آئیں گے یعنی فصاحت جنگ حضرت جلیلؔ مانک پوری۔ آپ امیر مینائی کے شاگرد و جانشین ہیں اور ایسے شاگرد و جانشین کہ اگر آج امیر زندہ ہوتے تو وہ خود ان کے حق میں غزلگوئی سے دستبردار ہو جاتے۔ جناب جلیلؔ کے یہاں، سلاست بیان کا یہ عالم ہے گویا ایک نرم و سبک رو چشمہ ہے جو ہلکے ترنم کے ساتھ بہتا چلا جا رہا ہے، ان کا لکھنوی رنگ تغزل اتنا نکھرا ہوا اور اس قدر دلنشین ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے انسان اس کے سامنے سب کچھ بھلا دینے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

جلیلؔ کے یہاں نہ تصوف ہے نہ فلسفہ، نہ کوئی مضمون آفرینی ہے، نہ فکر و خیال کی بلندی، لیکن ان کے کلام کی سادگی، روانی، بے تکلفی اور خیالات کا سلجھا ہوا ہونا اس گلاب کا سا حُسن ہے جس کے قبا کو گل بوٹے کی ضرورت نہیں — حقیقت یہ ہے کہ جلیلؔ اس وقت اپنے رنگ کے تنہا کہنے والے ہیں اور انتخاب تو انھوں نے اتنا پاکیزہ کیا ہے کہ اب کیا کہوں کیا جی چاہتا ہے۔

اول الذکر چاروں حضرات نے اپنا کلام کا انتخاب بہت محنت و کاوش سے کیا ہے، لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اچھے اشعار ان سے نظر انداز نہیں ہو گئے۔

دہلی اسکول کے شاعروں میں تین حضرات کے نام آپ کو اس فہرست میں نظر آئیں گے، ایک بیخودؔ دہلوی، دوسرے پنڈت امرناتھ ساحرؔ، تیسرے پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفیؔ اور یہ تینوں اپنی عمر و مشق کے لحاظ سے اسی زمانہ کے شاعر ہیں، جو دہلی میں تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور دہلی سے باہر بھی ختم ہونے ہی والا ہے۔

جناب بیخودؔ کی حیثیت ایک ایسے کہنہ مشق اُستاد کی سی ہے، جس کے بہک جانے میں بھی لطف ہے اور جس کی اُستادی کو بلا دلیل ماننا پڑتا ہے، امرناتھ ساحرؔ کا میلان زیادہ تر تصوف کی طرف ہے اور کیفیؔ کے یہاں زہد و رندی دونوں کا مناسب امتزاج نظر آتا ہے۔ ان حضرات نے اپنے کلام کا جسقدر انتخاب بھیجا ہے، وہ اُن کے رنگ کو پوری طرح ظاہر کر رہا ہے اور اسلئے خوب ہے۔

لکھنؤ کے غیر لکھنوی شعراء میں سے صرف دو کے نام آپ کو فہرست میں ملیں گے۔ ایک جناب امیدؔ امیٹھوی، دوسرے حضرت آسیؔ الدنی۔ جناب امیدؔ امیٹھی کے رہنے والے ہیں اور آسیؔ کا وطن الدن (میرٹھ) ہے، لیکن یہ دونوں حضرات اتنے عرصہ سے لکھنؤ میں ہیں اور لکھنوی شعر و شاعری کے اتنے معرکے انھوں نے دیکھے اور جھیلے ہیں کہ انھیں اب لکھنوی کہنا ہی زیادہ مناسب ہو۔

جناب آسیؔ کی شاعری بڑی دامن دار شاعری ہے، یعنی وہ ایک اچھی خاصی جماعت اپنے شاگردوں کی بھی رکھتے ہیں اور مشاعروں میں بھی کثرت سے شریک ہوتے ہیں۔ انکی شاعری میں دہلی اسکول کا رنگ غالب ہے اور وہ محاورات وغیرہ میں زیادہ تر اساتذۂ دہلی ہی کا تتبع کرتے ہیں۔ ان کی غزل گوئی کا حُسن، ان کے بیان کی سادگی اور جذبات کا چٹیلا پن ہے، اور اسی لئے جہاں کہیں وہ فارسی ترکیب استعمال کرنے پر آجاتے ہیں، تو ہم کو کچھ اجنبی سے محسوس ہونے لگتے ہیں، میں آسیؔ صاحب کا شمار ان شاعروں میں کرتا ہوں، جو خوش فکر بھی ہیں اور خوش فہم بھی۔

(بقیہ بزم نگار صفحہ ۲۲۲ پر ملاحظہ فرمایئے)

آرزو لکھنوی

سید انور حسین عرف منجھو صاحب المتخلص بہ آرزو - ولادت ۱۲۸۹ھ - آپ کے جد اعلیٰ ہرات کے رہنے والے تھے جو اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور اہل سیف میں ملازم ہوئے - پہلے اجمیر میں قیام کیا، پھر لکھنؤ آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی -

آپ کے والد میر ذاکر حسین یاس تخلص فرماتے تھے اور اچھے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا، آپ کے بڑے بھائی یوسف حسین قیاس بھی سخن گو اور سخن سنج تھے - جناب آرزو کو بہت کمسنی سے شعر کا ذوق تھا اور جب ان کے والد ماجد کو ان کے شوق کا حال معلوم ہوا تو اُستاد جلال لکھنوی کے پاس لے گئے اور ان کا شاگرد کرادیا - اسوقت آرزو صاحب کی عمر ۱۳ سال کی تھی اور لکھنؤ میں جلال کا طوطی بول رہا تھا -

رفتہ رفتہ آرزو صاحب کی مشق سخن اتنی بڑھی کہ جلال مرحوم اپنے شاگردوں کی غزلیں انھیں کو اصلاح کے لئے دینے لگے یہاں تک کہ جلال کے بعد لوگوں نے انھیں کو جلال کا جانشین مان لیا -

آپ کے تین دیوان فغان آرزو، جان آرزو اور سریلی بانسری شایع ہو چکے ہیں - فغان آرزو میں ۱۵ برس سے ۳۵ سال تک کی غزلیں ہیں اور جان آرزو میں اسکے بعد کی - سریلی بانسری آپ کی شاعری کے تیسرے دور کی چیز ہے جس میں فارسی عربی الفاظ کے استعمال سے قصداً احتراز کیا گیا اور نظیر اکبرآبادی کی زبان میں شاعری کی گئی ہے -

آپ نے بضرورت معاش ڈرامے بھی بہت سے لکھے ہیں اور اسی سلسلہ سے آپ عرصہ سے کلکتہ میں مقیم ہیں -

آپ مذہباً اثنا عشری ہیں، اور خصایل و اطوار کے لحاظ سے حد درجہ منکسر مزاج - آپ موجودہ دور میں اُس عہد کی یادگار ہیں جب شاعر نے شاعری کا پیشہ اختیار نہ کیا تھا لیکن فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اب یہی کسب معاش کا ذریعہ ہے، آرزو صاحب کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی ہے - آرزو صاحب نے خود اپنے کلام کا جو انتخاب فرمایا ہے وہ یہ ہے:

رہنے دو تسلی تم اپنی دکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گیا / اب ہاتھ ملے سے ہوتا ہے کیا جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

دو تند ہواؤں پہ بنیاد ہے طوفاں کی / یا تم نہ حسیں ہوتے یا میں نہ جواں ہوتا

لطفِ بہار کچھ نہیں گو ہے وہی بہار / دل کیا اُجڑ گیا کہ زمانہ اُجڑ گیا

دل سے کھنچی ضعف میں اس طرح آہ، جیسے کہ اک فرض ادا ہو گیا،

خموشی میری معنی خیز تھی اے آرزو کتنی کہ جس نے جیسا چاہا ویسا افسانہ بنا ڈالا

اب رازِ دل چھپانا ہے بے سود آرزو لی میں نے ٹھنڈی سانس تو وہ مسکرا دیا

اشکوں سے راز کھلتا کیا خون آرزو کا آنکھوں تک آتے۔ آتے رنگ اُڑ گیا لہو کا

دفعتہً ترکِ تعلق میں بھی رسوائی ہے اُلجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دیکر

بند کیں آنکھیں تو پایا تجھ کو او پردہ نشیں، وسعتِ حدِ نظر سے دور لیکن دل کے پاس

قید میں ماجرائے تنہائی، آپ کہتے ہیں آپ سنتے ہیں،

مائل ہیں وہ ایذا دینے میں پانی سے لگی بھڑکاتے ہیں جانے کو نہیں کہتے منھ سے رو رو کے مجھے سمجھاتے ہیں

دل کی کشش کو اب بھی، گلشن سے ہے تعلق کچھ پتیاں قفس تک اُڑ اُڑ کے آ رہی ہیں

امتحاں عشق میں منظور ہے غمخواروں کا اک ذرا ہوش میں آجاؤں تو دیوانہ بنوں

رونے پہ مرے ہنستے کیا ہو بے سمجھے نہ دیوانہ جانو دل کس سے لگایا ہے تم نے تم دردِ کسی کا کیا جانو

مایوس وہ دل ہر پہلو سے آخر کہو کس کا ہو کے رہے جس کو نہیں اپنا سمجھوں جسکو نہ تمھیں اپنا جانو

ملکِ عدم کے جانے والو وقت سفر کا ایک نہیں تم ابھی ٹھیرو ہم کو ہے جانا بیچ سے سر کو رستا دو

باتوں سے تسلی تھی دل کو وعدہ پہ بھروسا ہو نہ سکا پھر ہو گئی ویسی ہی حالت جب پاس سے وہ سمجھا کے اُٹھے

شبنم کے آنسوؤں پر کیا ہنس رہے ہیں غنچے ان سے تو کوئی پوچھے کب تک ہنسا کریں گے

کیا سوزِ محبت میں جفا ضبط نے کی ہے در بند ہے اور چار طرف آگ لگی ہے

دبائے بیٹھا ہوں سینے میں، راکھ کا اک ڈھیر نہ دل ہے اب نہ جلے دل کی آہ کا شعلہ

آگ دل میں لگی نہ ہو جب تک آنکھ اشکوں سے تر نہیں ہوتی

رات مزے کی اور یہ غفلت ساری جوانی سوتے گزری

آرزو جام لو جھجک کیسی پی لی اور دہشتِ گناہ گئی،

ہوتے ہیں جو آج یہ قول و قسم بر وقت نہ کچھ کام آئینگے جب دلمیں بدی آجائے گی الزام لگائے جائینگے

دراصل تماشاگاہ جہاں خود ایک حجابِ غفلت تھا چھپنے لگے دلکش نظارے اب پردہ اُٹھتا جاتا ہے

مرے غم نے ہوش اُنکے بھی کھو دئے وہ سمجھاتے سمجھاتے خود رو دئے

بھروسا تھا کہ وہ عہدِ وفا سے منھ نہ موڑیں گے خبر کیا تھی کہ نازک ہاتھ یہ زنجیر توڑیں گے

نہیں معلوم اتنے یارانِ عہدِ زندگی کچھ بھی ہمیں کس کس نے چھوڑا ساتھ ہم کس کس کا چھوڑینگے

اے سانس نہ آ کہ دل میں ہے زخم　　ٹیس اُٹھتی ہے جب ہوا لگی ہے

سب تو خیر اُن کی حال پُرسی پر　　دل اُمنڈ آیا اشک بھر آئے

تازے وہ پھر سے ہوگئے غم جو فلک نے تھے دئے　　جس نے کہ ہنس کے بات کی ہم بھی لپٹ کے رو دئے

کہہ کے یہ اور کچھ کہا نہ گیا،　　کہ ہمیں آپ سے شکایت ہے،

وفا کا نقش ہے وہ نقش جو مٹ کر اُبھرتا ہے　　جنھیں دل سے بھلاؤ گے وہ پیہم یاد آئیں گے

ہے خموشی مری اسی قابل　　جتنا چاہے بُرا بھلا کہئے

وہی بےچینیاں رہتی ہیں دوری ہو کہ نزدیکی　　نہیں معلوم اس بیتاب دل کا مدعا کیا ہے

نشستِ عارضی سے ہے سرائے دہر کی رونق　　یہ ہے اک کارواں جس پر بھری محفل کا دھوکا ہے

قید کی حد میں بڑھا لی ہم نے آزادی کی حد　　یوں دیا جھٹکا کہ حلقے کھنچ گئے زنجیر کے

اک چھپکر دیکھنے والے کی کیا جانئے کیا حالت دیکھی　　آئینہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا اور پھر کے مری صورت دیکھی

رات ساری جسے آنکھوں میں بسر ہوتی ہے　　آپ کیا ہیں اُسے دُنیا کی خبر ہوتی ہے

کہتا ہے ناصح کہ واپس جاؤ اور میں سادہ لوح　　پوچھتا ہوں خود اُسی سے کوئے قاتل کا پتا،

عشق میں سو بار نالہ آکے لب تک رُک گیا　　بات اکیلے کی نہیں تھی دو دلوں کا راز تھا

وہ کہتے ہیں میں تیرے گھر میہماں تھا　　یہ سچ ہے تو اسے بیخودی میں کہاں تھا

وہ دل ہی میں تھا جس کو ہم ڈھونڈتے تھے　　یہ سب سچ ہے ہمدم مگر دل کہاں تھا

کھینچ لایا تھا یہ کس عالم سے کس عالم میں ہوش　　اپنا حال اپنے لئے جیسے کوئی افسانہ تھا

بدلی کی چھاؤں سی اِدھر آئی اُدھر گئی　　جھپکی پلک کہ ختم تھا موسم بہار کا

سکوتِ آرزو اُن کا ہے حرفِ بےآواز　　مرے سوال کا یعنے جواب ہو نہ سکا

نہ کر تلاشِ اثر تیر ہے لگا نہ لگا　　جو اپنے بس کا نہیں اُس کا آسرا نہ لگا

جو سینے میں دل ہے تو بارِ محبت،　　اُٹھے یا نہ اُٹھے اُٹھانا پڑے گا

محبت نہیں آگ سے کھیلنا ہے　　لگانا پڑے گا بجھانا پڑے گا،

جیسی جسکی طینت ہوگی، ویسا ہی سب کو بتائیگا　　داغی آئینہ جب دیکھوگے، دھبہ منھ پر آئیگا

وصل کا خواہشمند بنے کیوں، حسن کا سچا پروانہ　　دل سے لگی ہے لاگ تو اک دن، خود شعلہ بن جائیگا،

بڑی دشمنی کر گئے دوست بنکر　　اب اُن سے سوا دل ستاتا رہے گا

پلک جھپکی کہ منظر ختم تھا برقِ تجلے کا　　ذرا سی نعمتِ دیدار اُس کا بھی یوں رائگاں ہونا

اللہ اللہ حسن کی یہ پردہ داری دیکھئے
بھید جس نے کھولنا چاہا وہ دیوانہ ہوا،

میں عرضِ حال میں جب تک زبان کو روکوں
تری بدلتی ہوئی چتونوں نے کیا نہ کہا،

معمہ بن گیا رازِ محبت آرزو یوں ہی
وہ مجھ سے پوچھتے جھجکے میں کہتے حجاب آیا

جس میں کیفِ غم نہیں باز آئے ایسے دل سے ہم
یہ بھی دینا ہے کوئی مے تو نہ دی ساغر دیا

اُن کو جلدی، آرزو میں دم بخود اس سوچ میں
سب ہے کہنے کا کہوں کم کر کے افسانے سے کیا

دُکھ تو کیا ہمدم بٹا لیتے مگر اتنا ہوا
بیکسی میں بات کرنے کا سہارا ہو گیا

جواب دینے کے بدلے وہ شکل دیکھتے ہیں
یہ کیا ہوا مرے چہرے کو عرضِ حال کے بعد

وہ عمر کی مدت ہی کتنی، جو سانس کی آمد و شد پر تھی
کل منزلِ ہستی طے کر لی، آگے نہ بڑھے اک گام سے ہم

تم ایسا عہد شکن آرزو سا نا اُمید
کہو جو سچ بھی تو آتا ہے اعتبار کہاں

عشق پر بھی چھا گئیں رعنائیاں
اُف تری توڑی ہوئی انگڑائیاں

کثرتِ وحدت ہے نیرنگِ جمال
جتنے شعلے اُتنی ہی پرچھائیاں،

تھا حریفِ خلوتِ جاناں خودی کا امتیاز
آنکھ جب کھولی یہی دیکھا کہ تنہائی نہیں

اس جہانِ عنصری میں، ہے قفس اندر قفس
چھوڑ دینا تھا نشیمن پہلی ہی پرواز میں

اُن کی صورت کو دیکھتا ہوں میں
اپنی قسمت کو دیکھتا ہوں میں،

جو محبت کرے وہ مارا جائے
رسمِ اُلفت کو دیکھتا ہوں میں،

وہ تو کچھ مسکرا کے ہو گئے چُپ
ایک اُلجھن میں پڑ گیا ہوں میں

تھے قبلِ اسیریِ قفس بازوؤں کا زور
ٹوٹے ہوئے کچھ پر کہ نشیمن میں پڑے ہیں

بھلاوے دے رہا ہے شوقِ حسرت آفریں مجھکو
وہاں باتیں ہی باتیں اور یہاں سب کچھ یقیں مجھکو

فوق ظلمات پہ ہے میرے سیہ خانے کو
شمع ہے اور نظر آتی نہیں، پروانے کو

چاک دامانیِ یوسفؑ کو ہنسی میں نہ اُڑا
کہیں دُہرا دے نہ کوئی اسی افسانے کو

اُلفت بھی عجب شے ہے جو درد وہی درماں
بانی پہ نہیں گرتا جلتا ہوا پروانہ

کل آرزو اک در پر سر پھوڑ کے روتا تھا
میں نے جو کہا یہ کیا ہنسنے لگا دیوانہ

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ اُدھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اُڑ کے چلا پروانہ بھی

کچھ سہارا چاہتی ہے عاشقی کی زندگی،
بے نیازی تیرے صدقے ناز بیجا ہی سہی

بگاڑ پر بھی تو ہے اُن سے حسنِ ظن باقی
سخن تمام ہے اور حاصلِ سخن باقی

خزاں نچوڑ چکی ہے بہار کا دامن
سوائے رنگ نہیں بوئے یاسمن باقی

ہنس ہنس کے جو ہر بات کو افسانہ بنا دے
وہ تو جسے چاہے اُسے دیوانہ بنا دے

مجھے رہنے کو وہ ملا ہے گھر کہ جو آفتوں کی ہے رہگزر
تمھیں خاکساروں کی کیا خبر کبھی نیچے اُترے ہو بام سے

جو ترے عمل کا چراغ ہے وہی بے محل ہو تو داغ ہے
نہ جلا کے بیٹھ اُسے صبح سے نہ بجھا کے سوئے اُسے شام سے

رُخ کا مرے تغیرِ غم کی کتاب سمجھو،
لی ٹھنڈی سانس جس جا اُلٹا ورق وہیں سے

جمع ہوئے ہیں کچھ حسیں گرد مرے مزار کے
پھول کہاں سے کھل گئے دن تو نہ تھے بہار کے

جاتے کہاں ہیں آپ نظر دل سے موڑ کے
تصویر نکلی پڑتی ہے آئینہ توڑ کے

چھینا تھا چھلکتا ہوا جام اُس نے جھٹک کر
کیا مفت کا دھبّہ مرے دامن میں لگا ہے

اُس کوچے میں اک شیشہ تھا پڑا ٹھوکر جو لگی ماتھا ٹھنکا
کھوئے ہوئے دل کو پہچانا اور وہ بھی کب پہچانا ہے

اب میری خموشی بھی پُر درد فسانہ ہے
یعنی وہ نہیں سنتا غم جس کو سنانا ہے

جذبِ نگاہِ شعبدہ گر دیکھتے رہے
دنیا اُنھیں کی تھی وہ جدھر دیکھتے رہے

پاؤں کو لغزش ہے لب پر شورِ نوشانوش ہے
جتنے پیمانے ہیں اب باقی ہے اتنا ہوش ہے

خلوت کدۂ دل کا بھرم جائے گا اے شوق
آوازہ نہ دینا کہ یہاں کوئی نہیں ہے

وہ ایسے غافل نہیں کہ سوچیں جو کچھ ہوا تھا بجا کہ بیجا
ہم ایسے کافر نہیں کہ سمجھیں اُنھیں ہماری خبر نہیں ہے

غم دیا ہے کہ مسرت دی ہے
سب میں اک طرح کی لذت دی ہے

برائے نام یہ نام و نمودِ نقشِ فانی ہے
وگرنہ موج کیا گرداب کیا جو کچھ ہے پانی ہے

تجربے سب ہیچ ہیں قانون سب بیکار ہیں
ہر زمانہ اک نیا پیغام لیکر آئے ہے

جس پر اُن کی نگاہ ہو جائے
سانس کھینچے تو آہ ہو جائے

پاک نکلے وہاں سے کون، جہاں
عذر خواہی گناہ ہو جائے

اظہارِ مدعا کے لئے آسرا ہے شرط
جب تک وہ دیکھتے رہے آنسو بہا کئے

دھوپ سہ لینا ہے اچھا بارِ احساں کون اُٹھائے
چھاؤں اک گرتی ہوئی دیوار ہے میرے لئے

اسی چمن میں کہ وسعت ہے جس کی نامحدود
نہیں پناہ کی جا ایک آشیاں کے لئے

مان لی کس نے اپنی ہار بڑھکے تھکن بتائے گی
میں ہوں وہیں تڑپے جاؤں گا تو یوں ہی مسکرائے جا

آگ ہے پانی نکالے یہ لگی کا کھیل ہے
دوسرا چھالا اُٹھا جب ایک پھوڑا بہ چکا

مکھڑا سے پہ جڑے کے ہنسو یہ بات ہے اور
جو دیکھے گا روتے مجھے تم کو ہنستے

بناوٹ کو چاہت کے سانچے میں ڈھالا
سا اُسی کے نہ ملنے سے جی پر بنی ہے

اب ایسے نہ تھے ہم کہ چھیڑو تو رو دیں
سکھ میں بھی دیکھے ہیں دکھ۔ جی اس سے ہو کھٹکا ہوا

میں سوچ ہی میں تھا کہ لگی ہے کہاں پہ چوٹ
بے سہارا دل کا سہارا کچھ نہ پوچھ

وہ ٹل نہیں سکتی جو پہونچنے کی گھڑی ہے
چاہ نے اندھا کر رکھا ہے، اور نہیں تو دیکھنے میں

آنکھ اُس نے پھرا کے رت پلٹ دی
اک تم نہیں آرزو تو کیا ہے

بیٹھے تکتے تو ہیں کنکھیوں سے۔
وہ گلی میں بھی نہیں دے گا ٹھہرنے کی جگہ

ہم نے چڑھتی دھوپ بھی دیکھی ہے، ڈھلتی دھوپ بھی
چبھتے ہوئے دیکھا ہے نہ کانٹا نہ کوئی پھانس

آرزو اُس کا جینا کیا ہے، ہاں دن پورے کرنا ہے
کھلنے کی آس میں یہاں، ڈال گئے تھے اک کلی۔

یہ ہے تیرے گھائل کا اب سانس لینا
کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی

آئے دن اچھا نہیں اک باولے کو چھیڑنا
کالی گھٹائیں کوندا لپکا روئے جو کوئل کوک گئی۔

سانپ کے چھالے میں بس ہوگا ان میں ہو امرت ہی امرت
چاہت کا پھل لیتا ہے جیسے جل جائے کھیتی بوئی ہوئی

اپنے لئے متوالی ہے۔ کیسی یہ نہ پوچھو

آرزو جی ہی جانتا ہوگا،
مری بات چھوڑو تمہیں کیا ہے کہنے گا

بڑی چوٹ کھائی ارے مار ڈالا
یہ کا ہے کو سمجھے مرا بھولا بھالا

بہا ہوگا کوئی کلیجے کا چھالا،
پاس بیٹھا ہوں ترے اور دھیان ہے بھٹکا ہوا

اک ہوک یوں اُٹھی کہ ٹھکانا بتا دیا
سوتے ہیں ہاتھ اک سرہانے دھر کے ہم

چلتا رہے گلیوں میں کہ بیٹھا رہے گھر میں
آنکھیں آنکھیں سب ہیں برابر، کون نرالی آنکھیں ہیں

ہنستے ہوئے پھول رو رہے ہیں،
ہونے ہیں جو کام ہو رہے ہیں،

یہ نہیں پوچھتے کھڑے کیوں ہو،
آرزو بس جاؤ بھی مرتے ہیں مرنے کی جگہ

پاس بٹھلائیں جو وہ یہ بھی ہے ڈرنے کی جگہ
اے سانس بتا دے یہ ہے کا ہے کی کھٹک سی

بیٹھا ہو جو آس لگا کر، ان ہونی کے ہونے کی
روئے اُٹھا رہے ہیں آج، پنکھڑیاں ملی دلی

چھری اک کلیجے میں جیسے چبھو لی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

مرنے گا آرزو جس دن اُسے جھک آ گئی
جتنی گہری سانس کھینچی تھی اُتنی لمبی ہوک گئی

ہائے رہی آنکھیں دیکھ کے جن کو پیاس اُڑی اور بھوک گئی
کیا ہوتا ہے آنسو پونچھنے سے چھپتی نہیں آنکھیں روئی ہوئی

وہ آنکھ کہ جو دو سروں کی نیند اڑا دے

ہے ایک ہی ہونا تو یہ اَن بَن نہیں اچھی
میرا سا نہ بن تو مجھے اپنا سا بنا دے

ہم کو کہہ سکتے ہیں کیا جو دیس سے پردیس میں
لائے آنکھیں بند کرکے اور اکیلا چھوڑ دے

نہ اس کو پوچھو کس لئے تھا یہ رو کے ہنسنا یہ ہنس کے رونا
اک اَن کہی دکھ بھری کہانی دکھا دی تم کو اُلٹ پلٹ کے

بھنور سے نکلی جو ناؤ بچکر تو پار اُترنے میں کھائی ٹھوکر
بڑھا کے رکھا تھا پاؤں جس پر، وہی کگارا گرا ہے پھٹ کے

پاس سے اُٹھ کے بھی وہ جائیں، رو کیں بھی آنکھ مار کے
اب رہے کون آپ میں، دوڑ پڑے پکار کے

رہتے نہ تم الگ تھلگ، ہم نہ گزرتے آپ سے
چپکے سے کہنے والی بات کہنا پڑی پکار کے

پوچھی بھی تھی چھیڑ کر جو آپ، کہنے نہ دی وہ بات بھی
تم نے کھٹکتی پھانس کو چھوڑ دیا اُبھار کے

جھٹلاتے ہیں جو مجھ کو بات اپنی وہ مکر کے
منہ اُن کا دیکھتا ہوں اک ٹھنڈی سانس بھر کے

رونے کو رات دن کے آنسو کہاں سے آئیں
دو ایک بوندیں گرنا وہ بھی ٹھہر ٹھہر کے

گلی سے تری رک رک کے بڑھتے ہیں آگے
ادھر آنے والے اُدھر جانے والے،

تارا ٹوٹتے دیکھا سب نے، یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی
کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا، کس کا سہارا ٹوٹا ہے

جن سے اوجھل ہے تو ان آنکھوں میں،
رات کیسی کہ دن اندھیرا ہے،

چپ ایک پہیلی ہے، سوچو گے تو بوجھو گے
تم سے وہی کہنا ہے، جو سب سے چھپانا ہے

بتا دے گی بھید آرزو نیند اڑ کر
کہ جو رات چھوٹی تھی، اب کیوں بڑی ہے

کھائی ہو کبھی چوٹ تو دکھ اور کا سمجھیں
وہ ہنس رہے ہیں اور یہاں جی پہ بنی ہے

چھیڑ کے پوچھو، پوچھ کے سمجھو، سن کے نہ ایسی بات سناؤ
آس لگا کر کہنے والا اپنا سا منہ لیکر رہ جائے

دو گھڑی کو دے دے کوئی اپنی آنکھوں کی جو نیند
پاؤں پھیلا دوں گلی میں تیری سونے کے لئے

مٹ بھی سکتی تھی کہیں بے روئے چھاتی کی جلن
آگ کو پگھلا لیا پھاہا بھگونے کے لئے

بند آنکھیں کبھی کرتا ہوں جو سونے کے لئے
نیند بھی آتی ہے کانٹے ہی چبھونے کے لئے

کچھ بھنور کو جو کہیں، پھیر سمجھ کا جانو
کم تھے ہم آپ ہی کیا ناؤ ڈبونے کے لئے

سچ ہے ہیں مانگنے میں جھجک کا بھتا
دینے والے نے ہاتھ روکا ہے

چاہت کے کٹھن رستے کرتے ہیں بھویانی
تلوے کا چبھا کانٹا آنکھوں نے نکالا ہے

جہاں ہر سہارا ہو جھوٹا ہی جھوٹا
وہاں چاند کیسا گہن ہی گہن ہے

دھیان اُن کا ساتھ جی کے، چین جی کا اُنکے پاس
کہئے اب اپنا کسے کس کو پرایا جانئے.

دوڑتی لہریں ہیں، اُٹھتے بلبلے پانی کے ہیں،
آگے آنکھوں کے ہے جو، اُس سب کو دھوکا جانئے

آسی الدنی

میرا نام عبدالباری - تخلص آسی، ابن منشی خلیفہ حسام الدین احمد حسام تلمیذ مرزا غالب - ابن مولوی شیخ خدابخش عاجز - ابن شیخ عبدالحکیم عاشق عرف میاں نتھن معاصر و ہم جلیس میر تقی میر مرحوم - الدن ضلع میرٹھ تحصیل ہاپوڑ مولد ہے - ۱۸۹۳ء قصبہ مذکور میں جو شرفا کی ایک بہت قدیم بستی ہے، پیدا ہوا - اور ۱۹۰۰ء میں میرا سلسلۂ تعلیمی شروع ہوا - ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں - فارسی کی تکمیل مولوی حافظ برکت علی سے کی اور عربی کی سید سراج احمد صاحب سراج مرحوم سے - مولانا محمود حسن صاحب محدث دیوبندی سے بھی بعض کتب حدیث و فقہ کا استفادہ کیا - ۱۹۰۸ء میں دہلی میں حکیم نواب جان مرحوم سے کتب طب پڑھیں - اور اُن کے مطب میں نسخہ نویسی بھی کرتا رہا - ۱۹۱۰ء میں شاہجہاں پور میں دو برس تک فارسی پڑھانے پر مامور رہا - ۱۹۱۲ء میں اس سے جی گھبرا گیا تو دفتر اخبار ہمدرد دہلی مولانا محمد علی کے یہاں کام کرتا رہا - جس زمانہ میں جالب صاحب اُسکے اڈیٹر تھے، میں بھی وہیں تھا - ۱۹۱۴ء میں ہمدرد کی مالی حالت نہایت نازک صورت اختیار کر چکی تھی اس لئے وہاں سے دل برداشتہ ہوا اور ۱۴ دسمبر ۱۹۱۴ء کو لکھنؤ چلا آیا اور اب تک یہیں ہوں -

میری شاعری کی ابتدا کسی ترغیب و تشویق کی ممنون احسان نہیں ہوئی - بلکہ اُسوقت سے جبکہ میں انشا، خلیفہ دما دھو رام وغیرہ پڑھتا تھا - شوق کی آگ دل میں لگی ہوئی تھی - تا اینکہ ایک روز کہیں جاتے ہوئے یہ شعر خود بخود موزوں ہو گیا :

کیا تم نے زخمی کیا دل ہمارا
بڑا تیر مارا بڑا تیر مارا

یہ واقعہ غالباً ۱۹۱۰ء کا ہے اس کے بعد قریب قریب روز شعر کہتا رہا اور ۱۹۱۶ء تک بغیر کسی تخلص کے مشق سخن جاری رہی - ایک روز ایک دوست نے صلاح دی کہ تم عاصی تخلص رکھ لو - اتفاق سے اُسی زمانہ میں مولانا سید سراج احمد صاحب مرحوم نے مشق سخن کرانا شروع کی - کوئی طرح دیدی اور اس پر سب کو طبع آزمائی کا حکم دیدیا - چنانچہ پہلی طرح یہ تھی :

مسافر ہے تو غضب کا ارے نادان پردیسی

اس پر میں نے بھی شعر کہے جو اس وقت مجھے یاد نہیں۔ اب یہ بات چھپنے والی نہیں رہی تھی۔ اس موزوں طبعی کی میرے والد مرحوم کو بھی خبر ہو گئی۔ وہ خود فارسی اور اردو کے خوشگو شاعر تھے۔ اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند۔ انھوں نے ایکبار یہ طرح دی:

اُٹھاؤ گٹھری سنبھالو بستر کہ رات اب کچھ نہیں رہی ہے

میں نے غزل کہکر سنائی۔ خوش تو ہوئے۔ مگر کہا کہ ابھی بہت کمی ہے، اس کے بعد کبھی کبھی کسی شعر پر اصلاح دیتے رہے۔ میں بیشتر فارسی کے دیوانوں اور اپنے پردادا مرحوم کا دیوان دیکھتا رہا۔ اُسوقت نہ اس ضخیم مجلد کتاب کی مجھے کچھ زیادہ قدر تھی، نہ اُن کے کلام سے کچھ زیادہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بلکہ اُس کے حواشی کی عبارتیں دیکھ کر مزا آتا تھا، کہیں لکھا تھا کہ یہ غزل میر تقی میر کی غزل پر کہی اور میر صاحب کو سنائی، میر صاحب نے اس کی بڑی داد دی کہیں یہ تھا کہ میر صاحب نے میری اس غزل پر غزل کہی اور میری غزل سے اچھی نہ کہہ سکے اور میں نے اُن کے اس شعر پر اعتراض کئے۔ کہیں قایم کی ملاقات کا حال۔ کہیں سودا کی بات چیت۔ غرض فارسی کے دیوانوں اور اس دیوان کو اپنا رہبر بنا رکھا تھا۔ ان کے بعد سب سے پہلے اُردو میں مرزا غالب کا دیوان پڑھا۔ اور اُس کو اپنے والد سے سمجھا اور اس کے معانی پر پورا عبور حاصل کیا۔ پھر گلزار نسیم کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ تا اینکہ سنہ ۱۹۱۱ء میں مولانا سید ابو الحسن صاحب ناطق سے ملاقات ہوئی۔ مولانا میرے عزیز قریب بھی ہیں اسی وجہ سے ان کی ہمشیرہ کی شادی میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ وہاں روز و شب شعر و شاعری کا چرچا رہا اور مولانا کا یہ شعر سنکر:

اب اس کو کیا کرے کوئی اگر تم کو نہ باور ہو   بتو کہتا تو جاتا ہوں مسلماں ہو تو کافر ہو

میں اس شعر کو سنکر ایسا وارفتہ ہوا کہ مولانا سے اصلاح کی استدعا کی۔ مولانا نے ازراہ مہربانی منظور فرمایا اور سب سے پہلے میرے تخلص میں اصلاح فرمائی یعنی عاصی کے بجائے آسی تجویز کیا۔ اور اس کے بعد سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۱۵ء تک اپنا کلام اُن کو دکھاتا رہا۔ بعد کو مولانا نے اتنا دل بڑھا دیا کہ جس پر مجھے بذات خود ناز ہے۔ اس حساب سے شاعری کے تین خانوادوں سے فیضیاب ہوا ہوں۔

مولانا سید سراج احمد صاحب سراج مرحوم، تلمیذ میاں یزدانی میرٹھی۔ مولانا منشی شیخ خلیفہ حسام الدین احمد صاحب حسام تلمیذ مرزا غالب مرحوم۔ مولانا سید ابو الحسن صاحب ناطق تلمیذ مرزا داغ۔ اس ہیں میں نے اس بات کو خود نظر انداز کر دیا ہے کہ میں نے براہ راست دو غزلوں پر داغ مرحوم سے بھی اصلاح حاصل کی جو شاید اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ مگر اصل استفادہ صرف ناطق صاحب کی ذات سے حاصل کیا۔

میں نے شاعری کے مختلف مشاقوں اور مختلف اسکولوں کا اتباع کیا ابتداء میں ناسخ کے رنگ پر بہت سی غزلیں کہیں۔ بعدہ اس کی قباحتیں ذہن نشین ہوئیں تو مولانا حالی کے رنگ میں شعر کہے۔ ایک زمانے میں یہ سودا ہوا کہ ہر شعر میں کوئی محاورہ نظم ہونا چاہیے۔ ایک زمانے میں ایہام و تناسب مرغوب طبع رہا۔ جب کی مولانا ناطق نے تنبیہی الفاظ

میں سخت ممانعت کی۔ اس کے بعد مرزا داغ کے رنگ میں نہایت رنگین اور روزمرہ میں ڈوبے ہوئے شعر کہنے لگا اور ۱۹۱۱ء، ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۳ء، ۱۹۱۵ء کی غزلیں قریب قریب سب اسی انداز کی ہیں۔ مگر ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ آگیا اس وقت یہاں انجمن معیار کا زور و شور تھا اور اساتذہ لکھنؤ مرزا غالب کے رنگ میں طبع آزمائیاں فرما رہے تھے۔ میں بھی اُسی مروجہ شاہراہ پر چل نکلا۔ اگرچہ بعد کو بہت جلد میری سمجھ میں آگیا کہ:- کایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است ــــ میں نے بین و بکا اور رثائی شاعری کو الوداع کہہ دیا۔ اس کے بعد فلسفیانہ انداز مرغوب ہوا۔ مگر جلد تر یہ معلوم ہوگیا کہ اگر شاعری کو محض فلسفے اور تصوف کی جولانگاہ بنا دیا جائے تو شاعری سے اس کو دور کا لگاؤ بھی نہیں ہوتا۔ میر کے انداز سخن کا میں پہلے بھی شیدائی تھا اور اب بھی ہوں، مرزا غالب اور مرزا داغ کا رنگ میرے لئے پہلے بھی قابل اتباع تھا اور اب بھی ہے۔ مگر ان سب میں سے میں کسی کا پابند نہیں۔ اب میرا مذہب شعریہ ہے کہ شعر خواہ کسی کے طرز پر ہو۔ کیسی ہی نادر ترکیبیں بہترین الفاظ اور بدیع استعارات اور تشبیہیں اس میں صرف کی گئی ہوں۔ مگر پھر بھی کوئی ندرت بیان اثر اور جوش کلام ضرور شامل ہو۔ اگر اسکی تہ میں ایک قسم کی شگفتگی، طنز، کنایہ، تعریض وغیرہ کی جھلک بھی نظر آجائے تو سبحان اللہ۔ شاعر اگرچہ اصناف سخن میں سے کسی ایک صنف خاص کا زیادہ دلدادہ ہو تو کوئی ہرج نہیں مگر اُس کی مشق ہر صنف کلام میں ہونا چاہئے عشق و محبت کے جذبات اثر و تاثیر سے کوئی شعر خالی نہ ہو۔ پھر اثر کے معنے صرف سوگوارانہ بیان اور موت کے تلخ مناظر پیش کرنا نہیں جیسا کہ اکثر حضرات کا خاص دستور ہے کہ پوری غزل میں کوئی شعر ایسا نہیں ہوتا کہ وہ سوائے مرگ، مایوسی کے زندگی کے ایک خوش انجام لمحے کی بھی تصویر پیش کر سکے۔ یہی میرے خیال ہیں اور انھیں باتوں پر نگاہ رکھتے ہوئے میں شعر کہتا ہوں۔ میرا کلام غزل۔ نظم۔ قصیدے۔ مثنوی۔ رباعیات وغیرہ تمام اصناف سخن میں بہت کافی ہے۔ مگر رباعی اور غزل میری سب سے زیادہ محبوب چیز ہے۔

میری تصانیف میں اکثر ناول بھی ہیں اور شرح دیوان غالب جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ شرح تحفۃ العراقین۔ ترجمہ و شرح دیوان حافظ۔ ترجمہ فرہنگ انندراج، لغت اُردو اور تین تذکرے خاص چیزیں ہیں اور عام تصنیفات کی تعداد تیس بتیس تک پہونچتی ہے جن کو صراحتاً لکھنا بیکار ہے۔

میرے شاگردوں کی تعداد سو ڈیڑھ سو تک ہے۔ یوں تو سب خوش فکر خوش گو ہیں، مگر شوکت تھانوی۔ امین سلونوی۔ عمر انصاری۔ شہید بدایونی۔ زخمی لکھنوی۔ حیرت لکھنوی۔ اسد الہ آبادی۔ آزاد لکھنوی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

زبان کے متعلق میرا خیال ہے کہ صرف لکھنؤ یا دہلی کا زباندان یا اہل زبان ہونا قابل استناد و لایق فخر نہیں بلکہ دہلی اور لکھنؤ دونوں شہروں کی زبان پر کم از کم اتنا عبور ضرور ہے کہ وہ دونوں زبانوں میں فرق و امتیاز کر سکے۔

میری ابتدائی مشق کے دو دیوان مرتب ہو چکے تھے مگر اب میں اُن کو ضایع کر چکا۔ اب ایک دیوان اُردو غزلیات کا ایک نظموں اور ایک رباعیات کا تیار ہے۔ جن کی طبع کی نوبت ہنوز نہیں آئی۔ البتہ قطعات اور رباعیات کا مجموعہ بصایر

چھپ چکا ہے۔ میں نے یہ انتخاب اس حصہ سے کیا ہے جو سنہ ۱۹۲۴ء سے پہلے تک کا ہے۔ ورنہ اس خیال میں کہ کس شعر کو لکھوں اور کس کو چھوڑوں، شاید مجھ سے یہ انتخاب کبھی نہ ہوسکتا۔ اب میرا انتخاب ملاحظہ ہو:

عبد الباری آسی - ۹ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

کھل گیا دنیا پہ رازِ حسن و عشق، — وہ ہنسے مجھ کو پسینا آگیا،

جب چمن میں کچھ انقلاب ہوا — اک نہ اک آشیاں خراب ہوا

جہاں اپنا قصہ سنانا پڑا — وہیں ہم کو رونا رلانا پڑا،

بڑا دکھ دیا گردشِ چرخ نے — کہ احباب کو آزمانا پڑا،

جو چھٹے تو پھر ملیں گے نہ چھٹے تو یہ سمجھنا — یہ سلام آخری ہے تجھے اے بہار اپنا

روتے ہیں چارہ گر اور دیکھنے والے چپ ہیں، — ہائے بگڑی ہوئی حالت ترے بیمار دل کی،

دام خالی نظر آتا ہے مگر اے صیاد — آرہی ہے ابھی آواز گرفتار دل کی،

دل کشی نظارۂ دنیا میں کافی ہے مگر — دل کہاں سے لاؤں، جینے کے لئے دل چاہیئے

آتے ہی انساں کے گونج اُٹھا طلسم کائنات — ذرے ذرے سے صدا آئی ہمیں دل چاہیئے

دل رہینِ آرزو ہے آرزو مرہونِ یاس، — گھر ہمیں برباد کرنے کو بنانا چاہیئے

غضب ہی ڈھا گیا آسی یہ کہنا اُس شکووں پر — تم ایسے کون سے وہ تھے تمھیں ہم یاد کیا کرتے

غرورِ حسن غنی تھا تو کیوں ادھر آیا — ہمارا دل کوئی آئینۂ جمال نہ تھا

مجھے تو یاد نہیں ہے کوئی خوشی ایسی — شریک جس میں کسی طرح کا ملال نہ تھا

جہاں کے صدمۂ پیہم کو کیا کہیں آسی — ہمارے زخموں کی قسمت میں اندمال نہ تھا

اچھا ہوا کہ چھوٹی خود ہم سے فکرِ دنیا — جتنا خیال کرتے اتنا ملال ہوتا،

اُس سال فصلِ گل میں اُجڑا تھا بنتے بنتے، — رہتا تو آشیاں کو اب ایک سال ہوتا

ہزاروں طرح اپنا درد ہم اسکو سناتے ہیں — مگر تصویر کو ہر حال میں تصویر پاتے ہیں،

بجھا دے اے ہوائے تند مدفن کے چراغوں کو — سیہ بختی میں یہ اک بدنما دھبا لگاتے ہیں

مرتب کر گیا اک عشق کا قانون دنیا میں — وہ دیوانے ہیں جو مجنوں کو دیوانہ بتاتے ہیں

اُسی محفل سے میں روتا ہوا آیا ہوں اے آسی، — اشاروں میں جہاں لاکھوں مقدر بدلے جاتے ہیں

پھول ہنس ہنس کر دکھاتے ہیں جہاں کو داغِ دل — مختلف شکلیں ہیں اظہارِ غم و آلام کی

عرصۂ حشر میں تھی بھیڑ بہت کچھ لیکن،
مجھ کو پہچان کے چھوڑا مری رسوائی نے

بیخبر انجمن ناز میں سونے والے
رات بھر تجھ کو پکارا مری تنہائی نے

ہو گئے سلسلۂ ضبط کے ٹکڑے آسی
ایک جھٹکا جو دیا عشق کی رسوائی نے

جو توڑا ہے تو پھر تم اُس کے اجزا جوڑتے کیوں ہو
خدا جانے مرے دل میں کہاں کیا تھا کہاں کیا تھا

مراد دورِ گزشتہ بھی یونہی گزرا ہے اسے ہمدم
بنا رکھی تھی اک صورت خوشی کی شادماں کیا تھا

پہلو سے چلا تھا دل تو خون کا قطرا تھا
آنکھوں میں پہونچتے ہی دریا نظر آتا ہے

ہمیں ناواقفِ رسمِ چمن تھے اے قفس والو
فلک سے عہد لے لیتے تو فکر آشیاں کرتے

نہ پڑا عشق میں تکمیل کا ساماں کرنا
ہاتھ خود سیکھ گئے چاک گریباں کرنا

بیخبر دلکشیِ دہر کو الزام نہ دے،
تیری فطرت نے سکھایا تجھے عصیاں کرنا

خار و خس جمع کرے نام نشیمن رکھدے،
جس کو منظور ہو گلشن کو بیاباں کرنا

قیامت ہو گیا رازِ طلسمِ عشق کا کھلنا
ذرا سی زندگی اور اس قدر دشوار ہو جانا

خوشی شرمِ نگاہِ مصلحت اندیش کی ورنہ
مجھے منظور تھا رسوا سرِ بازار ہو جانا

خوش نوایانِ چمن مٹ نہیں سکتے صیاد
چار مٹ جائیں گے تو چار نمایاں ہوں گے

موجدِ طرز ہے ہر وحشیِ آشفتہ مزاج
سو کے سو طرح کے دامان و گریباں ہوں گے

غنچے بے حس ہیں یہ اندازِ جنوں کیا جانیں،
وقت آئے گا تو ہم چاک گریباں ہوں گے

نقاشیِ فریبِ معاصی، نہ پوچھئے
جنت بنا کے رکھدی گنہ گار کے لئے

ایک حالت پر نہ رہنے پائیں دل کی حسرتیں
تم نے جب دیکھا نئے انداز سے دیکھا مجھے

ابتدا وہ تھی کہ دُنیا تھی ملامت گر مری
انتہا یہ ہے کہ کوئی کچھ نہیں کہتا مجھے

شوق سے دنیا میں عشرت کی تمنا کیجئے،
پہلے اک امروز بے فردا تو پیدا کیجئے

عہد وفائے دوست بجا لیکن اے ندیم،
کیونکر کہوں کہ بھول گیا آسماں مجھے

کلیاں تمام باغ کی کھل جائیں آج ہی،
کل تک یہاں ٹھہرنے کی فرصت کہاں مجھے

ہر جلوہ گہِ عام میں بے پردہ نہ آنا
ہر دل کو زمانے میں ترا دل نہ سمجھنا

ہستیِ بے ثبات سے طعنے دئے مجھے
کچھ بھی نہیں میں صرف ترا اعتبار ہوں

شرابِ زیست ابھی سیر ہو کے پی بھی نہیں،
کہ سن رہا ہوں صدائیں شکستِ ساغر کی

ہزار طرح تخیل نے کروٹیں بدلیں
قفس قفس ہی رہا پھر بھی آشیاں نہ ہوا

جس در پہ زمانے کے تغیر سے اُدھر تھا،
اِس وقت بھی میرا سر شوریدہ وہیں ہے

کہتے ہیں کہ امید پہ جیتا ہے زمانا
وہ کیا کرے جس کو کوئی امید نہیں ہے

نصیحت کو آتے ہیں غمخوار آسی
گریباں کو پھر آج سینا پڑے گا

وہ پھر وعدہ ملنے کا کرتے ہیں یعنی
ابھی کچھ دنوں ہم کو جینا پڑے گا،

مبحثِ رد و قبول اس سے جدا ہے لیکن
جو کیا ہم نے وہ آسان نہیں تھا کرنا

ادب آموز ہے میخانہ کا ذرہ ذرہ،
سیکڑوں طرح سے آجاتا ہے سجدا کرنا

عشق پابندِ وفا ہے نہ کہ پابندِ رسوم،
سر جھکانے کو نہیں کہتے ہیں سجدا کرنا

جو پھول آتا ہے گلشن میں گریباں چاک آتا ہے
بہارِ رنگ و بو میں خون دیوانوں کا شامل ہے

آتے ہی فصلِ گل کے بھیجی نویدِ وحشت
گلشن کا پتہ پتہ میرا مزاج داں ہے

سب مہیا ہیں مرے زہر میں سامان طرب
اب فقط دیر ہے قسمت کے بدل جانے کی

اس فقیری میں یہ حالت مرے انکار کی ہے
بادشاہی کہیں مل جائے تو آفت ہو جائے

آلام زندگی کی حقیقت نہ پوچھئے
لاکھوں تو ایسے ہیں جو مجھے یاد بھی نہیں،

اے دشمنِ مروت کچھ حق بھی ہے ہمارا
برسوں ترے لئے ہم احباب سے لڑے ہیں

دشتِ عدم سے وحشت لائی ہے سوئے ہستی
دونوں جہاں ہمارے روندے ہوئے پڑے ہیں

خوش تو ہوں مرنے سے لیکن اے دعائے مستجاب
اک ذرا بیوقت یہ ارمان پورا ہو گیا،

مجھے احساس کم تھا ورنہ دورِ زندگانی میں
مری ہر سانس کے ہمراہ مجھ میں انقلاب آیا،

رہ گئی دل میں تو کیا حال کرے گی دل کا
وہ شکایت کبھی لب تک جو نہ لائی جائے

نقش برآب زندگی لایق دشمنی نہ تھی،
موجِ صبا نے کیا کیا توڑ کے دل حباب کا

ہزاروں نغمۂ دلکش مجھے آتے ہیں اے بلبل
مگر دنیا کی حالت دیکھ کر چپ ہو گیا ہوں میں،

دکھا دیں گے جہاں کو آہ عالم سوز کی طاقت
قفس بھی ہے ابھی کچھ روز اور ہم بھی قفس میں ہیں

کھلا یہ راز بزمِ ناز کا پردہ اُٹھانے پر
کہ جس پر تیرا دھوکا تھا وہ اک تصویر تھی میری

ہوا احساس پیدا میرے دل میں ترکِ دنیا کا
مگر کب جبکہ دنیا کو ضرورت ہی نہ تھی میری،

سکوت افزا ہے خواب مرگ غالی ورنہ اے آسی
رہی ہے موت بنکر مدتوں تک زندگی میری،

اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھ کو
میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشان ہوں میں

اے غمِ دوست بتا دے مجھے مرضی اپنی
جتنی خواہش ہو تری اُتنا پریشان ہوں میں

ہیں کچھ خرابیاں مری تعمیر میں ضرور
سو مرتبہ بنا کے مٹایا گیا ہوں میں

دیکھتا ہے نہ عمارت کو نہ ویرانے کو
جس جگہ پڑ رہا، نیند آگئی، دیوانے کو

مثالِ گردِ رہ مسکن کہاں ہے ہم غریبوں کا
گھڑی بھر کے لئے تھک کر جہاں بیٹھے وہیں گھر ہے

نئی راہیں بتاتا ہے نئے رستے دکھاتا ہے،
نہیں معلوم ظالم عشق رہزن ہے کہ رہبر ہے

رنگِ نشاط دیکھ مگر مطمئن نہ ہو
شاید کہ یہ بھی ہو کوئی صورت ملال کی

گلشن بہار پر ہے ہنسو اے گلو ہنسو
جب تک خبر نہ ہو تمھیں اپنے مآل کی

احساس اب نہیں ہے مگر اتنا یاد ہے
شکلیں جدا جدا تھیں عروج و زوال کی

صاف کہتے ہوئے ڈرتا ہوں حکایت اپنی
خوفِ مایوسیٔ اربابِ نظر بھی ہے مجھے

مجھ سے دُنیا کی محبت نہیں چھٹتی آسی
ورنہ ہونے کو تو اللہ کا ڈر بھی ہے مجھے

یہ سب فریب ہے نظرِ امتیاز کا،
دُنیا میں ورنہ کوئی بھی اچھا بُرا نہیں

اب کون ہے رموزِ محبت کا رازداں
اک ہم رہے ہیں، ہم کو کوئی پوچھتا نہیں

اور آگے بڑھ ذرا اے ہمتِ مردانہ آج
ہے کوئی پردے میں یا آواز ہی آواز ہے

حیرت آبادِ وفا میں آئے لاکھوں انقلاب
جو مرا دل تھا وہ اب آئینہ دارِ ناز ہے

جتنی عالی ہے ترے قصرِ معلّٰی کی زمیں
اُتنی ہی سجدوں میں میرے قوتِ پرواز ہے

رفتہ رفتہ یہ زمانے کا ستم ہوتا ہے
ایک دن روز مری عمر سے کم ہوتا ہے

باغ روتا ہے اسیرانِ قفس کو شاید
دامنِ سبزہ و گل صبح کو نم ہوتا ہے

ہاتھ رکھے ہے دمِ نزع جگر پر کوئی،
اب نہ بڑھتا ہے مرا درد نہ کم ہوتا ہے

قید سے پہلے بھی آزادی مری خطرے میں تھی،
آشیانہ ہی مرا صورت نمائے دام تھا

داہمہ غلاق اور آزادی کا حُسن افزا سرور
ہر فریب رنگ کا پہلے گلستاں نام تھا

ضعف آہوں پر بھی غالب ہو چلا تھا اے اجل
تو نہ آتی تو یہ میرا آخری پیغام تھا

دیدۂ خونابہ افشاں میرا اُن کے سامنے
بیخودی کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا اک جام تھا

حشر کیا ہے وہی اقرار خدائی کرنا
اک نئے بھیس میں پھر روزِ الست آتا ہے

ہستی پر تو عکس حسنِ ازل ہے دنیا
اس میں جو آتا ہے آئینہ بدست آتا ہے

نامرادی نے مٹایا مری ہمت کا غرور،
جو خیال آتا ہے اب دل میں وہ پست آتا ہے

ناصح کو بڑا ناز ہے تدبیر پہ آسی
قدرت تو کسی شخص کی محکوم نہیں ہے

سمجھتا ہوں کہ دنیا میں ہمیشہ رنج سہنا ہے
مگر پھر کیا کروں آسی اسی دُنیا میں رہنا ہے

مناسب۔ خیر رکھیں زخم دل پر چارہ گر مرہم
مرے نزدیک تو کوئی خدا سے لڑ نہیں سکتا

مقام عبد کا معبود سے جُدا ہی رہا،
بتوں سے ہو نہ سکا کچھ، خدا خدا ہی رہا

یہ زندگی حسرت آفریں ہے اسی کا رونا ہے ہمکو ورنہ
کبھی گنیں گے اگر تو شاید خوشی سے کچھ رنج کم ہی ہونگے

ہمارے نالے بھی چند سُن لو چمن میں مل جُل کے گانے والو
تمہاری محفل میں تو ہمیشہ یہ نغمۂ زیر و بم رہیں گے

ہزاروں بار کوشش کر چکا ہوں،
نہیں چھپتیں محبت کی نگاہیں

میں چپ بیٹھا ہوا ہوں اور یہ معلوم ہوتا ہے
کہ جیسے اک زمانہ کہہ رہا ہے داستاں میری

عجب کیا ہے جو رہبر بھی نہ پہونچے کوئے دلبر میں
مری تقدیر بھی شامل ہے اب اُسکے مقدر میں،

تغافل کا گلا کیا میں تو اے ساقی یہ کہتا ہوں
کہ پیاسوں کی نظر سے بال پڑ جاتا ہے ساغر میں

ہوا یہ ہے کہ نیکی کر کے دنیا میں خطا پائی،
سنا یہ تھا کہ پاداش عمل ملتی ہے محشر میں

دُنیا میں کوئی غم کے علاوہ خوشی نہیں
وہ بھی ہمیں نصیب کبھی ہے، کبھی نہیں

کیوں اے وفورِ جذبۂ طاقت ربائے دل
کیا واقعی میں قابلِ فریاد بھی نہیں

تعیئنِ حدِ صبر کروں کس امید پر
تکلیف ایک حال پہ ٹھیری ہوئی نہیں

دھوکا نہ کھاؤ چارہ گرد واقعات سے
پہلو میں دل نہیں ہے تو کیا درد بھی نہیں

اے بدگماں شدائد دنیا پہ صبر کر
فطرت کو تیرے ساتھ کوئی دشمنی نہیں

پھر بڑھ چلا تلاطمِ طوفانِ آرزو،
حالانکہ ڈوب کر ابھی اُبھرا نہیں ہوں میں

مارا ہوا ہوں بے حسیٔ جوشِ یاس کا
مرہونِ التفات تمنا نہیں ہوں میں

ہو چکا تھا روشناسِ واقعاتِ انقلاب
میں نے ہر آغاز کو سمجھا کہ انجام آگیا

کھلا دورِ اسیری میں کہ رنگ آسماں کیا تھا
چمن کیا تھا چمن کے پھول کیا تھے آشیاں کیا تھا

وہ محشر ہی سہی اے عمرِ رفتہ
نہ آنا چاہیئے تھا تجھ کو جا کے

بہارِ زندگی آخر ہے شاید
گریباں مل گیا دامن میں آکے

سمجھ تو لی ہے دنیا کی حقیقت
مگر اب اپنا دل بہلا رہا ہوں،

تو کیوں مجھے مایوس کئے دیتا ہے ناصح
کیا تو نے مرا خط جبیں دیکھ لیا ہے،

بیتاب سا پھرتا ہے کئی روز سے آسی
بیچارے نے پھر تم کو کہیں دیکھ لیا ہے

اچھے ہوئے زمانے کے بیمار سیکڑوں
دل وہ مریض ہے جو ابھی زیر غور ہے

چھوڑا ہی کیا ہے لوٹنے والوں نے میرے پاس
اک زندگی سو وہ بھی کوئی دن کی اور ہے

اب میں کیا تم سے اپنا حال کہوں
بخدا یاد بھی نہیں مجھکو

زندگانی کا آسرا ہے یہی،
درد مٹ جائے گا تو کیا ہوگا

آنکھ پھر ہو رہی ہے اشک آلود،
خون کچھ دل میں رہ گیا ہوگا

بے ساختہ اُٹھی جو وہ توبہ شکن نگاہ
خود مجھ کو شک ہوا کہ مسلماں نہیں رہا

فصل بہار ذوق نظر عالم شباب
اب کیا خبر، رہا ہے کہ ایماں نہیں رہا

جو خطا میں نے اُٹھا رکھی ہے کل کے واسطے
آج ہی بیتاب ہے فردِ عمل کے واسطے

اُتنے ہی دست شوق میں پھول چنے ہوئے ملے
جتنے کسی غریب نے پھول چنے بہار میں،

یہ جانتا ہوں کہ خاک آشیاں نہیں ہوتی
مگر جلے ہوئے تنکوں کو چن رہا ہوں میں

مٹا کے صفحۂ ہستی سے اپنا نام و نشاں
زمانے بھر میں ترا نام لکھ چلا ہوں میں،

ٹھہر گیا اسی مرکز پہ انقلاب آسی،
شکست دل کی صدا بن کے رہ گیا ہوں میں

میری ہستی نے کیا تھا مجھ کو حیرت کے سپرد
میں نے ہستی کو سپردِ طاق نسیاں کر دیا

اے مرے دردمند دل سُن مری ایک بات سُن
اس کو نہ بھولنا کبھی جس نے تجھے بھلا دیا

نغموں ہی کی تخصیص نہیں اہل طلب میں
سننے پہ کوئی آئے تو نالہ بھی مزا دے

شوخیاں معمورۂ ہستی کی حد سے بڑھ چلیں
پھینک دوں دو چار ذرے اپنے ویرانے سے کیا

چمک جاؤ اے شام غم کے ستارو
مصیبت کے ماروں پہ احسان ہوگا

ترا کفر معلوم ہے مجھ کو آسی،
ارے تو بھلا کیا مسلمان ہوگا،

خدا جانے اب دل کہاں جا کے ٹھہرے
بڑے انقلابات سے ہو رہے ہیں

جھوٹا نہیں کہتے ہیں تجھے ہم مگر آسی
جیسا تو بتاتا ہے وہ ایسا تو نہیں ہے

متاعِ زندگی کے دینے والے یہ تو سمجھا دے
کہ اتنا بوجھ سر پر رکھ کے لیجانا کہاں ہوگا

زندگی موردِ آفات ہوئی جاتی ہے
جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی جاتی ہے

کوئی ناصح ہے کوئی دوست ہے کوئی غمخوار
سب نے ملکر مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے

عمر فانی ہے تو پھر موت سے ڈرنا کیسا
اک نہ اک روز یہ ہنگامہ ہوا رکھا ہے

بہت علاج کیا دردِ عشق کا لیکن،
وہی مآل ہوا جو مآل ہوتا ہے

ہر خطا پر ہو ندامت ہر ندامت پر خطا،
کچھ دنوں یوں زندگی کا دور ہونا چاہئے

دیکھئے کس کی خطا ہے کس کے سر الزام ہے
موت غفلت کر رہی ہے زندگی بدنام ہے

روتی ہے شبنم، کلی دل تنگ ہے، گل سینہ چاک
کیا اسی مجموعۂ غم کا گلستاں نام ہے

تڑپے بھی مضطرب بھی ہوئے وقت قتل ہم
سب کچھ سہی تمہارا تو دامن بچا دیا

آسی نے ہم کو حال سنایا تھا اپنا رات
اُس خانماں خراب کی باتیں بھی خوب ہیں،

منزل کے رہنے والو کیا دیکھتے ہو ہم کو
آسودۂ مکاں تم، واماندۂ سفر ہم

یہ راز ہے اے حریص دنیا تجھے کچھ اسکی خبر نہیں ہے
اُسی کا گھر ہے تمام دنیا کہ جس کا دنیا میں گھر نہیں ہے

تونے بدنام کیا دردِ وفا کو آسی
سیکڑوں بار سُنے ہیں ترے نالے میں نے

کچھ اُن کو ہمارا پاس نہیں جو چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں
ہم سنتے ہیں سر دُھنتے ہیں منہ تکتے ہیں رہ جاتے ہیں

نہ تھی خرابۂ دُنیا میں اتنی وسعت بھی
کہ بیٹھ کر کسی گوشے میں رو لیا کرتے

دل شکوہ سنجِ کثرتِ دردِ نہاں نہ تھا،
لیکن یہ جب کی بات ہے جب آسماں نہ تھا

جینا پڑا امیدِ وفا پر تمام عمر
حالانکہ جان دینے میں کوئی زیاں نہ تھا

رسوا ہوئے مگر دلِ مضطر کو کیا کریں
مرنا پڑا وہیں ہمیں مرنا جہاں نہ تھا

وہیں تک ہمارے وفاؤں کی حد ہے
جہاں تک مٹا دیں مٹا دینے والے

بچیں گے تو پھر ایک کوشش کریں گے
جلا دیں نشیمن جلا دینے والے

اگر دل سلامت رہیگا تو آسی
بہت مل رہیں گے دغا دینے والے

اُن کو یہ غصہ کہ میں اُن کی گلی میں کیوں گیا
مجھ کو یہ حیرت کہ کیونکر شکل پہچانی مری

تمنا کو خموشی دی خموشی کو زباں تونے
نظر کر کے چھوڑی بے بسی کی داستاں تونے

تجاہل سے مرے نام و نشاں کے پوچھنے والے
وہیں رہتا ہوں میں ڈھونڈا نہیں اب تک جہاں تونے

یقین رکھ کہ یہاں ہر یقین میں ہے فریب
بقا تو کیا ہے فنا کا بھی اعتبار نہ کر

نقشِ ہستی بنی نظر تیری،
نہ گئی یادِ عمر بھر تیری

ساتھ ہر سانس کے مرے دل سے
آ رہی ہے ابھی خبر تیری

اب جدائی میں یاد آتی ہے
گفتگو بات بات پر تیری

اتنا مجھے مجبور نہ کر ناصحِ غمخوار
ایسا نہ ہو دامن بھی گریباں میں سل جائے

میں اپنے دل سے کہتا ہوں کہ اب تو درد کچھ کم ہے
مرا دل مجھ سے کہتا ہے کہ اکثر یوں بھی ہوتا ہے

جراحت ہائے دل میں برق ہیں، گلہائے خنداں ہیں،
بہر صورت وہ اندازِ تبسم کار فرما ہے

بہت شکوے کئے بیدردیوں کے
مگر پھر آسماں تو آسماں ہے

کیا بات ہے اے اہلِ قفس رنگِ چمن کی
ہم نے بھی کسی وقت میں دیکھی ہیں بہاریں

دیئے فریب مقدر نے بار بار مجھے
ہر اک خزاں کو سمجھنا پڑا بہار مجھے

ثبوت ہے یہ تمنا کی سادہ لوحی کا
بغیر وعدے کے رہتا ہے انتظار مجھے

اسی کا نام ہے شاید جنونِ عشق آسی،
کہ ایک نشہ سا سر پر سوار رہتا ہے

جب مری امروز کو اندیشۂ فردا نہ تھا
یہ زمیں ایسی نہ تھی، یہ آسماں ایسا نہ تھا

دل کو شکوا کہ مرے درد کا درماں نہ ہوا
ہم پشیمان کہ اور اس کے سوا کیا کرتے

اب تک تو محبت میں وہ ساعت نہیں آئی
جس روز وہ رونے پہ مرے ہنس نہ دیا ہو

بیم و رجائے عشق میں اکثر حضورِ دوست
جنبش ہوئی لبوں کو بغیر التجا کئے

بے ربطیِ مآلِ تمنا نہ پوچھئے
اک انتہا ہوئی ہے، بغیر ابتدا کئے

بتخانۂ نگاہ ہے دنیائے آب و رنگ
بنتی نہیں کسی سے یہاں بے خطا کئے

الٰہی کس کو پکاریں کہاں نکل جائیں
کھلی ہے آنکھ شبِ انتظار باقی ہے

جو ذرہ ہے اس ذرہ پہ اک نقشِ جبیں ہے
کیا ساری زمیں کوچۂ جاناں کی زمیں ہے

سبھی کچھ کیا خودکشی رہ گئی،
وفا میں ذرا سی کمی رہ گئی

ہو رہا ہوں ہدفِ ناوکِ ظلمِ اصنام
صرف اتنی سی خطا پر کہ مسلماں ہوں میں

ہم کو پہلے بھی نہ تھا تیرا بھروسہ اے عمر
ہم نے دیکھا تھا چھلکتے ہوئے پیمانے کو

یہ کیسی بدشگونی ہے جو میں محسوس کرتا ہوں
کہ ہوں اور پھر نہیں معلوم ہوتا اُسکی محفل میں

نہایت ہی بُرا وقت آگیا ہے دیکھئے کیا ہو،
ضرورت نالے کی ہے اور سکت باقی نہیں دل میں

شاید نہ ہوئی ہو کسی لغزش پہ ندامت
دل ہی تو ہے یارب کوئی معصوم نہیں ہے

جنونِ نقاشِ وہمِ زیست ہے دھوکا نہ کھا غافل
مقید کر دیا ہے تجھ کو اک کاخِ مُصوّر میں

صدائے صورِ اسرافیل نے دھوکا دیا آسی
میں جس دنیا سے بھاگا تھا وہی دُنیا ہے محشر میں

با آبرو زیرِ قناعت تھا درِ فیضِ کریم
یہ بھی میری کامیابی تھی کہ ناکام آگیا

اب دیر یہی ہے کہ ترا در کہیں مل جائے
آمادہ ہے دل باندھ کے احرامِ تمنا

کھلی نہیں ہیں زمانے پہ چوریاں میری،
میں بزم سے ترا نقشہ اُتار لایا ہوں

ہمیں مجاز ہو دورِ حیات کا کرتے
تو روزِ حال کو ماضی بنا دیا کرتے

اثر لکھنوی

مرزا جعفر علی خاں (خان بہادر - ام - بی - ای) - ۱۲ر جولائی ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ میں ولادت ہوئی، کڑہ ابوتراب میں آبائی مکانات ہیں جو لکھنؤ کا مشہور محلہ اور شرفا اور نجبا کا مرکز ہے، فارسی کی درسی کتابیں پڑھ کر سنہ ۱۸۹۶ء جوبلی ہائی اسکول (اب انٹرمیڈیٹ کالج ہے) میں داخل ہوئے، سنہ ۱۹۰۲ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کرکے کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے، سنہ ۱۹۰۴ء میں ایف - اے اور سنہ ۱۹۰۶ء میں بی - اے پاس کیا، ایک سال ایم اے کا کورس پڑھا اور ایل ایل بی کی تیاری کی، قانون سے طبیعت میں مناسبت نہیں پائی اور یہ سلسلہ چھوڑ دیا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں براہ راست بعہدۂ ڈپٹی کلکٹری تقرر ہوا، جولائی سنہ ۱۹۴۰ء مستقل کلکٹر کے عہدے سے پنشن ہوئی، مگر اسی کے بعد اڈیشنل کمشنر الہ آباد کے عارضی عہدے پر تقرر ہوگیا

جن آغوشوں میں اثر نے پرورش پائی وہ حقیقت میں زبان کا گہوارہ تھے۔ اسلاف خاندان شاہی سے متوسل دبیر اشرف الاشراف تھے اور بر بنائے زبان "ثقات کڑہ" کے لقب سے مشہور تھے لکھنؤ کے طبقۂ اعلیٰ میں اُن کا شمار تھا، اسی کا اثر ہے کہ اثر کو اپنی زبان سے خاص اُنس ہے انگریزی زبان کے فاضل ہیں مگر کبھی تحریر یا تقریر میں انگریزی الفاظ بغیر ضرورت صرف نہیں کرتے۔

اثر کے خاندان میں شاعری کا ذوق فطری ہے۔ زانوئے تلمذ مرزا محمد ہادی صاحب عزیز مرحوم کے سامنے تہ کیا، جن سے قدیم خاندانی مراسم تھے۔

اثر صاحب کا انتخاب ملاحظہ ہو:

وہ گزرا ادھر سے جو بیگانہ وار — چراغ لحد جھلملانے لگا
کیا حسرت دیدار ہے، ہر بار یہ سمجھا — گویا کبھی دیدار میسر نہ ہوا تھا
جن خیالات سے ہو جاتی ہے وحشت دونی — کچھ اُنھیں سے دل دیوانہ بہلتے دیکھا
شوق بڑھتا گیا گناہوں کا — لذت انفعال نے مارا
یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی — بہار سے جو سُنا جنوں کا ہی زمانہ تھا

نظریں اُٹھیں اور اُٹھ کے جھکیں تمکنت کے ساتھ
گویا یہی جواب تھا میرے سوال کا

ایسی توبہ سے تو میخوار ہی رہنا تھا اثر
دل پہ اک ہاتھ ہے، اک ہاتھ میں ساغر ٹوٹا

ہم نے رو رو کے رات کاٹی ہے
آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا

کوئی موسم ہو، سماں ہو کہ تغیر کوئی
تم کو جب دیکھ لیا، وقت فراموش ہوا

میں نے کہا کچھ نہیں، سے لے قسم ہمنشیں
آپ ہی کچھ زیر لب کہکے خفا ہو گیا

فریاد کا شنوا کوئی نہیں، بیکس کا سہارا کوئی نہیں
کچھ دیکھ لیا اس دنیا میں کچھ حشر میں دیکھا جائیگا

تم نے پوچھا اس طرح حالِ دلِ خانہ خراب
یاد اب کچھ بھی نہیں، ابتک بہت کچھ یاد تھا

یہ کون مغنی تھا، یہ کس کا تھا فسانہ
کہتے ہیں دھواں جنبشِ مضراب سے نکلا

صیاد نے چھیڑا وہیں افسانۂ گلشن
جب قصد اسیروں نے کیا ترکِ فغاں کا

مقدر نے جو پہونچایا بھی اُن کے آستانے تک
یہی دل ہے تو ہم کو ہوش سجدے کا کہاں ہوگا

نیاز مند محبت گناہگار ہوئے
فلک کی سمت دمِ اضطراب دیکھ لیا

ہوا رہِ وفا سے اُلٹنے لگا تھا دم
خوش ہوں کہ تم نے قصد کیا امتحان کا

وہ غور بات بات پہ، وہ شک بھری نظر
یارب نہ مجھ سے صاف ہو دل بدگمان کا

چمن ہے، شاخِ گل ہے، آشیاں ہے، پھر نہیں کچھ بھی
غضب ہے طائرِ آزاد کا بے بال و پر ہونا

زلیخا کا تھا ہاتھ، یوسف کا دامن
حیا نے یہیں تک گریبان جانا

دلِ ستمزدہ سمجھ کانپ کانپ اُٹھا
نگہ سے اُن کی نگہ اجتناب ہو نہ سکا

حیا شیوہ حسن، ادب شرطِ الفت
سلے بھی تو آپس میں پردا رہیگا

خون ہونا تھا بہرحال تو پھر عیب نہ تھا
کہ حریف لب اظہار بھی ارماں ہوتا

ڈبڈبا آئیں خود بخود آنکھیں
بارہا ایسا اتفاق ہوا

ادھر دیکھ لینا، اُدھر دیکھ لینا
پھر اُن کی طرف اک نظر دیکھ لینا

وہ میرا نہ کہنے میں کہہ جانا سب کچھ
وہ اُن کا اچانک ادھر دیکھ لینا

اثر عرضِ حال اُس سے بے سوچے سمجھے
کہا تھا کہ پہلے نظر دیکھ لینا

سمجھ تو عرضِ تمنا کی مصلحت ہمدم
خموش رہنے سے وہ اور بدگماں ہوتا

ہائے کیا چیز ہے محبت بھی
دل کسی حال میں بُرا نہ ہوا

کلیوں کی گود میں جیسے نسیم آکر مچل جائے
اسی انداز سے اُن پر خمار آنکھوں میں خواب آیا

یہیں سب کو ہر پھر کے آنا پڑے گا محبت کو مرکز بنانا پڑے گا،

جہاں کی ہر اک شے ہے فانی، مگر بنانے میں کیا کیا تکلف کیا

اک شوقِ مسلسل کی محویت مدہوشی، دنیائے محبت میں امروز نہ فردا تھا

ہر اک رہگزر میں ہیں سرگوشیاں خدا جانے کس پر ستم ہوگیا

حیف وہ ملتفت نہیں ہوتا حال تو آشکار ہے اپنا،

عشق سے لوگ منع کرتے ہیں جیسے کچھ اختیار ہے اپنا،

پوچھنے والے دردِ پنہاں کے اپنے چہرے کا رنگ بھی دیکھا؟

اٹھ وہ در ہے نہ وہ جبینِ نیاز سجدۂ مستجاب نے مارا

دوڑا دے نبضِ خاک میں بھی روحِ زندگی کیسی نشاط اور غمِ روزگار کیا

کھنچتے یوں بھی ہیں بیتابیٔ دل کا نقشہ موج سے موج کا مل مل کے جدا ہو جانا

شکوہ لذت کے لئے ہے، ورنہ وہ کافر وہ ہے دل دکھانے سے اثرؔ جو اور پیارا ہوگیا

نگہِ شوق لگاتار نہ یوں دیکھے جا ہوگئے سرخ وہ لبہائے مے آلود بہت

یہاں تک ہوا یہ دل خرابِ محبت کہ آنکھوں سے چھلکے شرابِ محبت

رگوں میں ہو سانس لیتا ہے گویا اب اس حد پہ ہے اضطرابِ محبت

صبا گنگنائی، فضا گونج اٹھی جہاں دل نے چھیڑا ربابِ محبت

رہے داغ ہوکر، بہے خون ہوکر اثرؔ ہے وہ دل کامیابِ محبت

کوئی دل پر ہاتھ رکھ کر اٹھ گیا ہاتھ اب دل سے اٹھاؤں کس طرح

بھولنے والے سے کوئی پوچھتا میں تجھے دل سے بھلاؤں کس طرح

اب کہاں سینہ کاویٔ حسرت اب کہاں دلخراشیٔ بے سود،

اب کہاں اضطرابِ تاب شکن اب کہاں شوقِ مرحلہ فرسود

اب کہاں رازداریاں غم کی اب کہاں خندہائے اشک آلود

آج کچھ مہربان ہے صیاد کیا نشیمن بھی ہوگیا برباد؟

آرزو تھی کہ وہ ادھر دیکھیں، ہوش رخصت ہوئے، مبارکباد!

ہر سانس ایک تازہ جراحت کا ہے پیام نشتر بنی ہوئی ہے اک جاں ترے بغیر

صورتِ موج ہو سرگرمِ سفر ساحل آجائے تو کترا کے گزر

رعشہ بنکر بہار میں اُبھری — ہم اسیروں کی حسرت پرواز

بحر سے ہمکنار ہونا تھا — اے تنک ظرفیِ حباب فروش

ہر سانس دے رہی ہے پیغام صد تمنا — ہر جنبش مژہ ہے عرض ہزار آغوش

تھے جو خفا، ہیں وہ خفا آج تک — کیوں ہیں خفا؟ یہ نہ کھلا آج تک

میرے دل و دماغ پہ چھائے ہوئے ہو تم — ذرے کو آفتاب بنائے ہوئے ہو تم

افسانہ کہہ رہی ہیں پریشاں نگاہیاں — کیا راز ہے جو دل میں چھپائے ہوئے ہو تم

کاہیکو ایسے ڈھیٹ تھے پہلے، جھوٹی قسم جو کھاتے تم — غیرت سے آجاتا پسینا، آنکھ نہ ہم سے ملاتے تم

حیف تمھیں فرصت ہی نہیں ہو، ورنہ کیا کیا حسرت تھی — حال ہمارا سن لیتے اور اپنا حال سناتے تم

وضع بھی کوئی شے ہے آخر، دل کو اثر سمجھاتا تھا — در سے کسی کے اکبار اُٹھکر، کاش دوبارہ نہ جاتے تم

اُس نے کس لطف سے پوچھا کہ اثر کیسے ہو — بیخودی کا ہو برا کہدیا کچھ یاد نہیں

میں نہ ہوں تو وہم باطل دہر ہے — اس پریشاں خواب کی تعبیر ہوں

رقصاں ہے نسیم برگ گل پر — شبنم میں ہے گھنگھروؤں کی چھن چھن

غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے — مستی میں چھوا صبا نے دامن

دیکھ لینے دے ذرا بیخودی شوق مجھے — کوئی ہے بھی مرے پہلو میں کہ تنہا ہوں میں

سرور بن کے نظر پر وہ چھائے جاتے ہیں — ادائے خاص سے بیخود بنائے جاتے ہیں

اثر اُٹھائے گئے آج اُس کی محفل سے — ہمیں یقین تھا یہ بے بلائے جاتے ہیں

جب سے اُن سے آنکھ لڑی ہے آنکھوں میں اپنی خواب نہیں — اُس پہ مصیبت یہ ہے ہمدم صبر کی دل کو تاب نہیں

پوچھنے والے تو نے پوچھا، لطف کرم، احسان کیا — لب پر آئے حرف تمنا، عشق کے یہ آداب نہیں

اہل دل سے پوچھو اثر کیا لذت ہے ناکامی میں — ہاتھ اُٹھا بیٹھے مطلب سے، مطلب گو نایاب نہیں

تاثیر پیش رو تھی، باب قبول وا تھا — مانگی گئیں نہ مجھ سے مانگی ہوئی دعائیں

ہاں جلوہ گر ہو، تجھ پہ نچھاور کے واسطے — صبح دمیدہ پھول بھرے ہے کنار میں

جیسے وہ سن رہے ہیں بیٹھے ہوئے مقابل — اور درد دل ہم اپنا اُن کو سنا رہے ہیں

پھر ہم کہاں، کہاں تم، جی بھر کے دیکھنے دو — اللہ کتنی مدت تم سے جدا رہے ہیں

یوں اُن کی یاد ہے دل حیراں لئے ہوئے — جیسے نسیم غنچۂ گل کے کنار میں

اشک مژگاں پہ رہ گیا ہوگا — میرے غمخانے میں چراغ کہاں

وہ خمار آلودہ آنکھیں دیکھ کر
موج مے لینے لگی انگڑائیاں

زندگی اور زندگی کی یادگار،
پردہ اور پردے پہ کچھ پرچھائیاں

دخل ہے اُس کو بہت کچھ مرے تڑپانے میں
وہ جو لذت ہے ترے نام کے دُہرانے میں

میں سمجھتا ہوں تری جلوہ گری کا منشا
لطف ہے ساغرِ لبریز کے چھلکانے میں

ہاں اثرؔ سچ ہے کہ سب وعدے ہیں اُسکے جھوٹے
کچھ عجب لطف ہے رُک رُک کے قسم کھانے میں

راستے بند ہیں کدھر جائیں
تم ہو پیشِ نظر، جدھر جائیں

اب میں سمجھا مراد جنت سے
آپ جس راہ سے گزر جائیں

یہ محسوس ہوتا ہے راتوں کو اکثر
کہ سنسار سے کچھ سُنا چاہتا ہوں

اثرؔ تیرے کوچے سے بچ بچ کے نکلا
ابھی ہوش اتنا ہے دیوانگی میں

اُس گھڑی دیکھو اُن کا عالم
نیند سے جب ہوں بھاری آنکھیں

کون اثرؔ کی نظر میں سمائے
دیکھی ہیں اُس نے تمھاری آنکھیں

کہتے کچھ ہو، کرتے کچھ ہو
دیکھتے جاؤ اپنی باتیں

ایک نہ اک دن آئیں گی مجھ پر
جس کی ہوں گی جیسی باتیں

تیرے سوا پھر کس کو سناؤں
جان کے دشمن، تیری باتیں

میں ہوں آزار کا خوگر، اُسے منظور نہیں
مہرباں ضد سے جو ہو جائے تو کچھ دور نہیں،

اب وہ عالم ہے ترے دردِ محبت کے نثار
التفاتِ نگہِ ناز بھی منظور نہیں،،

لُٹ رہا ہے چمن اور آہ نہیں کر سکتے
پھر غلط کیا ہے کہ ہمسا کوئی مجبور نہیں،

کبھی ترکِ تمنا پر، کبھی عرضِ تمنا پر
محبت کو محبت سے پشیماں دیکھ لیتا ہوں

جب ہتھیلی سے مل جائیں وہ آنکھیں دیکھو
مے یوں ہیں بھرتے ہیں اس طرح کے پیمانوں میں

چاہا بہت کہ اُس سے کہیں تیرا دُکھ اثرؔ،
وہ تو ہے تیرے نام سے بیزار، کیا کریں

ہوا میں کچھ دھواں سا اُٹھ کے فوراً پھیل جاتا ہے
قفس میں یاد جب آتا ہے میرا آشیاں مجھکو

میں اب سجدے کروں، دل کو سنبھالوں یا بڑھوں آگے
نظر آتا ہے کوسوں سے کسی کا آستاں مجھکو

وہ آئیں تو شکیب بھی آئے، قرار بھی،
جو ساتھ لے گئے ہیں شکیب و قرار کو

نظر سوئے زمیں ہے گوشۂ دامن ہے ہاتھوں میں
معاذ اللہ کوئی کیا کہے ایسے پشیماں کو

شکوہ کیا تھا اندہ رہِ اُلفت، طنز سمجھکر روٹھے ہو
ہم بھی ہیں نادم اپنی خطا پر، آؤ تم بھی جانے دو

یادِ دلِ گم گشتہ میں میں ٹھنڈی سانسیں بھرتا تھا
ہنس کے ستمگر کہتا کیا ہے بات ہی کیا ہے جانے دو

خوبیِ ناز تو دیکھو کہ اُسی نے نہ سنا
جس نے افسانہ بنایا مرے افسانے کو

اسی اُلجھن میں نہ لکھا اُنھیں اب تک نامہ
کوئی مضمونِ شکایت کا رقم ہو کہ نہ ہو

کہتے ہیں حال اثر اب نہیں دیکھا جاتا
کوئی حیلہ پئے تجدیدِ ستم ہو کہ نہ ہو

ناموسِ عشق کاسۂ دستِ گدا نہ ہو
یارب دعا میں شائبۂ التجا نہ ہو

جب تقاضا نیند کا ہو اور تنہائی نہ ہو
اُف وہ کیفیت کہ ہو بھی اور انگڑائی نہ ہو

دل وہی دل ہے کہ جس کی زندگی ہو اضطراب
غم وہی غم ہے کہ تم سے بھی مسیحائی نہ ہو

حال پوچھا تھا تو اس طرح نہ پوچھا ہوتا
رہ گئی عرضِ تمنا کی تمنا مجھ کو

کھوئے ہوئے سے رہنا دن کو، روتے پھرنا راتوں کو
جو ہیں عاقل وہ کیا سمجھیں عشق و جنوں کی باتوں کو

موجِ بادہ رنگیں ہے، اس قدر کہاں رنگیں
اُس کے لعلِ لب دیکھو جب وہ مسکراتا ہو

پھول ڈوبا ہوا گلاب میں تھا
اُف وہ چہرہ حجاب آلودہ

فانوس کے پردے میں تو شمع کی تھرائی
اللہ رے اندازِ جانسوزیِ پروانہ

سب تیری بدولت ہے جو زیست میں لذت ہے
اے باعثِ محرومی، اے ہمتِ مردانہ

نہ رہا جب کوئی پردہ باقی،
بن گئی تیری تمنا پردہ،

وہ سوز و سازِ محبت کا آخری منظر
گدازِ شمعِ فسردہ، مزارِ پروانہ

تمام عمر اثر جس کی راہ دیکھی تھی
اِدھر سے آج وہ گزرا تو مثلِ بیگانہ،

اُٹھا دے قیدِ سبو و شراب و ساغر کی
بلند اور ذرا اگر مذاقِ رندانہ

جنوں کے جوش میں اپنی بلائیں لیتا ہے
کہا جو ناز سے تم نے اثر کو "دیوانہ"

گزرا ہوا زمانہ خارج ہے زندگی سے
کیوں یاد کر رہا ہے گزرا ہوا زمانہ

دیکھو نہ آنکھ بھر کے کسی کی طرف کبھی
تم کو خبر نہیں جو تمھاری نظر میں ہے

جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں؟
ملگجے پھول ترے بستر کے

اے حسیں ہم واقفِ آدابِ مجلس ہیں، مگر
اس قدر پیار آ گیا منھ تیرا تکتے رہ گئے

تیری مرضی ہو جہاں بھیج دے، اے داورِ حشر
مجھ سے دہرائی نہ جائیں گی خطائیں اپنی

آستاں بوسیِ دلدار نہیں قسمت میں
آؤ اک سجدہ سرِ راہگزر ہو جائے

دل مجھے سنبھالے تھا، دل کو میں سنبھالے تھا
ناگہاں ہوا آئی جانبِ گلستاں سے

تکیہ کلام ہی سہی، رشک سے مر رہا ہوں میں
کیوں کہو بات بات پر "دیکھو بھلا سا نام ہے".

اذب لاکھ تھا پھر بھی اُس کی طرف
نظر میری اکثر بھٹکتی رہی،

قاصد پیام اُن کا نہ کچھ دیر ابھی سنا
رہنے دے محو لذتِ ذوقِ خبر مجھے

جب کہا اُس نے مدعا کہئے
سوچتے رہ گئے کہ کیا کہئے

جانتا ہوں کہ نشیمن نہیں باقی صیاد
پھر بھی اک لطفِ خلش حسرتِ پرواز میں ہے

تو ہے کہ تصور کی ترے جلوہ گری ہے
دیوانہ ہوا جاتا ہوں، آواز سنا دے

خاکسترِ پروانہ میں بھی آگ دبی ہے
اے بادِ صبا دیکھ کے دامن کی ہوا دے

بے وفا ٹوٹے ہوئے دل کو مرے نام نہ رکھ
حسن ہے دل کے لئے، عیب ہے ساغر کے لئے

اک روز دل میں تیری محبت تھی جاگزیں،
اب تو ہی تو ہے، تیری محبت نہیں رہی

میں کیا سناؤں دردِ محبت کا ماجرا
حد ہو گئی کہ تم سے شکایت نہیں رہی

ایک سجدے سے زیادہ عشق میں جائز نہیں
ورنہ آلودہ جبینِ بندگی ہو جائے گی

ظہورِ عشق حقیقت طراز تھا، ورنہ
یہ دلکشی کہیں دار و رسن میں آئی ہے

مذاقِ عشق ہو کامل تو صورتِ شبنم
کنارِ گل میں رہے اور پاکباز رہے

دلیلِ راہ محبت ہے شوقِ بے پایاں
خود اپنے نقشِ قدم پر سرِ نیاز رہے

ہوا تو حشر کے دن اُن کا سامنا، لیکن
ہجومِ عام میں کیا عرضِ مدعا کرتے

وہ بے وفا ہیں کہ ہم بے وفا، خدا جانے
حیات ختم ہے اور اُن کی آمد آمد ہے

دل سے رخصت ہر اک امید ہوئی
آج ہم غمزدوں کی عید ہوئی

دور سے گاہ گاہ ایک نگاہ!
اس کو بھی مدتِ مدید ہوئی،

دلِ غمدیدہ کانپ کانپ اُٹھا
یاس کے بعد جب امید ہوئی

شبِ انتظار گزر گئی، خلشِ انتظار کی ہو وہی
بھری نیند ہے مری آنکھوں میں، مگر آنکھیں ڈھونڈتی ہیں خواب

اب آئے بہار یا نہ آئے
آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے

کس نے وحشی اثر کو چھیڑا
دیوار سے سر پٹک رہا ہے

کچھ روز یہ بھی رنگ رہا انتظار کا،
آنکھ اُٹھ گئی جدھر بس اُدھر دیکھتے رہے

پھر اثر ہیں اور توجیہ ستم،
پھر بڑھا ربط اُس بتِ عیار سے

پھر نہ آئے جو وعدہ کر کے گئے
آج کا دن ہے اور وہ دن ہے

کون کہتا ہے کہ موت انجام ہونا چاہیے
زندگی کا زندگی پیغام ہونا چاہیے

تیرے ہونٹوں کا تبسم، تیری آنکھوں کا خمار
ان کو بھی ساقی شریک جام ہونا چاہیے

میں کہوں کیا وہ شوخ کیا سمجھے
بے کہے کاش مدعا سمجھے

ایک اچٹتی سی نگہ پر ہے یہ بیتابیٔ دل
حال پوچھے کوئی اسوقت تو مشکل ہو جائے

میں مرگ و زیست اس کے سوا جانتا نہیں
آیا تری پناہ میں تیری پناہ سے

تاثیر دردِ دل میں یارب کہاں کی بھر دی
اُس نے بھی آج آخر چپکے سے آہ کردی

تعبیر حرف و صوت کوئی کس طرح کرے
عالم تمام اک سخنِ ناتمام ہے

وہ کام کر بلند ہو جس سے مذاق زیست
دن زندگی کے گنتے نہیں ماہ و سال سے

آغاز محبت کی لذت انجام میں پانا مشکل ہے
جب دل کو مسوسے رہتے تھے اب ہاتھ لگانا مشکل ہے

جو عشق کے فن کے ماہر ہیں اُن سے پوچھو، تم کیا جانو
کب اشک بہانا مشکل ہے اور کب پی جانا مشکل ہے

تری نظر نہیں ہوتی حریف شوخی کی
نظر سے آج یہ کس کو گرا دیا تو نے

خطا معاف مری بیکسی پہ کرکے نظر
کچھ اور حوصلۂ غم بڑھا دیا تو نے

دم خواب ہے دست نازک جبیں پر
کرن چاند کی گود میں سو رہی ہے

مشکل سے جو اُٹھتی تھیں پلکوں کے سہارے سے
ملتے ہی اُن آنکھوں کے جھک جانے کو کیا کہئے

جب دل کے دھڑکنے میں آغوش کی تنگی تھی،
آغاز محبت کے افسانے کو کیا کہئے

ہائے اُن کی شوخیاں اور شوخ کی رسوائیاں
دیکھتے تھے وہ ہمیں، ہم اُن کو کیونکر دیکھتے

اُن کے آنے کی بندھی تھی آس جب تک ہمنشیں
صبح ہو جاتی تھی اکثر جانب در دیکھتے

وہ دل ہی کیا جو دید کا ساماں نہ کر سکے
نظارے کو تمام گلستاں نہ کر سکے

ایماں غلط، اصول غلط، ادعا غلط
انساں کی دلدہی اگر انساں نہ کر سکے

مژگاں سے یوں ٹپک پڑا اک اشک خوں اثر
چھلکا ہو جیسے جام کسی بادہ خوار نے

کچھ دیر فکر عالم بالا کی چھوڑ دے
اس انجمن کا راز اسی انجمن میں ہے

نظر اُس حسن تاباں تک بآسانی نہیں جاتی
مگر جا کر پلٹتی ہے تو پہچانی نہیں جاتی

ہوئی مدت کہ اُس نے ناز سے دامن کو جھٹکا تھا
ابھی تک موجۂ گل کی پریشانی نہیں جاتی

مری حسرت نہ پوچھو، شمع سوزاں کی طرف دیکھو
کہ ہے بے آشیاں لیکن پرافشانی نہیں جاتی

جو بستر ہو تو اُس در پر، جو تکیہ ہو تو اُس در کا!
نہیں جاتی اثر فکر تن آسانی نہیں جاتی

سہمی ہوئی تھی صبح کی پہلی کرن کی طرح / اُن کی طرف نگاہ جو پہلے پہل گئی
کچھ اور بڑھ گئی ہیں پریشاں نگاہیاں / دم بھر جو تیرے غم سے طبیعت بہل گئی

ہنوز آوارہ و رسوا ہے کوئے ناشکیبی میں، / نہ سمجھا عشقِ شوریدہ کہ دل تیرا شبستاں ہے
ابھی جلوؤں کی حاجت ہے پئے تسکینِ نظارہ / ابھی چشمِ تماشا سے جو پنہاں تھا وہ پنہاں ہے

مقصودِ زندگی کا بیداریٔ خودی ہے / اے بے خبر دگر نہ بے سود زندگی ہے
محرومیوں کے ہوتے سرشاریٔ تمنا، / کچھ اُن کی شوخیاں ہیں، کچھ اپنی سادگی ہے

کبھی ہم جو اُس بزم میں بول اُٹھے ہیں / تو اک شور تا دیر برپا رہا ہے

اثر کو وہ خنجر سے دھمکا رہے ہیں / وہی، اپنے سائے سے ڈر جانے والے

تیرے نثار تو بھی اپنی زباں سے کہہ دے / اک خلق مجھکو تیرا دیوانہ کہہ رہی ہے
اک تڑپ سی ہے کہ الٰہی توبہ / گو نہیں اشک، روانی ہے وہی

اتنی ہو مخمور اے چشمِ جاناں / پھولوں میں تلنے لگے خوش نگاہی

اللہ ری بدگمانی، دیتا ہوں جب دعائیں / کہتا ہے چپکے چپکے اس میں بھی کچھ دغا ہے

یہ بھیگی رات اور یہ برسات کی ہوائیں / جتنا بھلا رہا ہوں وہ یاد آرہا ہے

عشق ہے اک نشاطِ بے پایاں، / شرط یہ ہے کہ آرزو نہ رہے

تم کو ہے فکرِ تن آسانی اثر / زندگی قربانیوں کا نام ہے،

وہ جلد جلد بدلتا ہوا زمانہ ہے / کہ آج ہے جو حقیقت وہ کل فسانہ ہے
نہ پوچھ سادگیٔ شوق، مان جاتا ہوں / یہ جانتے ہوئے وعدہ فقط بہانہ ہے

چل گیا اُس نگاہ کا جادو / کہہ گئے دل کی بات کیا کہئے،

جب تک اُس کی بات کا میں دوں جواب / اتنے عرصے میں قیامت ہو گئی
یاد کر لے بھولنے والے مرے / اب تو بچھڑے ایک مدت ہو گئی

دلنوازی میں بھی ایذا ہے، محبت کی قسم / تجھکو فرصت جو کبھی شغلِ ستمرانی دے
کچھ تری چشمِ فسوں ساز کا ایما نہ کھلا، / لبِ مینوش کو تکلیف گل افشانی دے
آؤ شیرازۂ ہستی کو پریشان کر دیں / یوں کہ اُس زلف کو پیغام پریشانی دے

نہ جانے بات یہ کیا ہے، تمھیں جس دن سے دیکھا ہے / مری نظروں میں دنیا بھر حسیں معلوم ہوتی ہے

اپنی لذت میں ہیں گم ہوئے نغمے / اب خموشی سخن سے بہتر ہے

احسان دانش

میرا نام احسان الحق ہے اور والد کا نام قاضی دانش علی۔ سنہ پیدائش ۱۹۱۴ء ہے۔ آبائی وطن قصبہ باغپت ضلع میرٹھ ہے، والد صاحب وہاں سے سکونت ترک کر کے کاندھلہ چلے آئے تھے۔ کاندھلہ (ضلع مظفر نگر یو۔پی) میرے نانا ابو علی شاہ صاحب کا وطن ہے جو ایک معمولی سپاہی تھے۔

میرے والد قاضی دانش علی اچھی خاصی جائداد کے مالک تھے لیکن کم علمی اور شرافت نے تمام جائیداد سرمایہ دار اقرباء کے قبضہ میں پہونچا دی اور جب میں نے ہوش سنبھالا تو میرے والد صاحب ایک ٹھیکہ دار کے پاس مزدوروں کے جماعت دار تھے اور جب ٹھیکہ ختم ہو جاتا تھا تو خود بھی بیلچہ اور پھاوڑے سے مزدوری کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔

اسکول میں مجھے تیسری جماعت تک تو کوئی احساس نہ ہوا لیکن جب تیسری جماعت پاس کر چکا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ والد نے والدہ سے کہا کہ احسان نے تیسری جماعت تو پاس کر لی ہے اب چوتھی جماعت کی کتابوں کے لئے رقم کہاں سے آئے۔ والدہ یہ سنکر کچھ دیر تک تو خاموش رہیں اور پھر جس قدر تانبے کے برتن تھے لا کر ڈھیر لگا دیا اور کہا کہ ہم مٹی کے برتنوں میں بھی کھانا کھا سکتے ہیں لیکن احسان کو یہ عمر کہاں نصیب ہوگی۔

یہ دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ والدہ کی محبت اور اپنی مفلسی کا احساس ہوا، میرے غریب والدین چوتھی جماعت کے بعد مجھے تعلیم نہ دلا سکے اور میں بھی اپنے والد صاحب کے ہمراہ مزدوری پر جانے لگا۔

میرے والد صاحب کو اول سے کتابیں سننے کا شوق ہے چنانچہ میں تمام دن مزدوری کرتا اور شام کو اپنے والد صاحب اور اُن کے چند دوستوں کو جو شام کو بیٹھک میں آجایا کرتے تھے کتابیں پڑھکر سناتا۔ فسانۂ عجائب، آرائش محفل، قصہ ممتاز الف لیلہ، اور فسانۂ آزاد، اور منظوم کتب میں سے مثنوی میر حسن، نل دمن، دیوان میر تقی، دیوان نظیر اکبرآبادی اور کلام انیس کا مطالعہ اُنھیں دنوں کا ہے اور یہ تمام کتابیں قبلہ قاضی محمد ذکی صاحب ذکی مرحوم کے کتب خانہ سے آتی تھیں، جو میرے اُستاد تھے۔

قاضی محمد ذکی کاندھلہ کے رؤسا میں سے تھے اور پرانی وضع کے بہترین شاعر اور شاعر سے زیادہ انسان مہمان نوازی دوست پروری اور فقیرانہ والہانہ پن اُن میں بدرجہ اتم موجود تھا عمر کے آخری تیس پینتیس سال تک وہ گوشہ نشین رہے

اور ۱۹۳۹ء میں انتقال ہوا لاولد ہونے کے باعث اُن کی تمام تر جائیداد پر ہنوز حکومت کا قبضہ ہے۔

مجھے مزدوری کی کمیابی نے میونسپلٹی کی چپراس باندھنے پر مجبور کر دیا لیکن افسران کے برتاؤ اور اعزہ کی سفاکی نے وطن ترک کرا کے لاہور لا پھینکا اُس وقت میرے والد ضعیفی کے باعث مزدوری کے قابل نہ رہے تھے۔

لاہور میں آکر بھی مجھے اُسی آبائی کام یعنی معماروں کے پاس اینٹیں اُٹھانے کی مزدوری کے سوا کوئی ذریعہ معاش نہ ملا دیال سنگھ کالج کی لائبریری، پنجاب یونیورسٹی کا دفتر و لیبارٹری کے علاوہ اور بہت سی عمارات پر مجھے مزدوری کرنے کا فخر حاصل ہے۔ کتابیں پڑھنے کا مجھے اول سے ایسا چسکا تھا کہ مزدور دوپہر کو آرام کیا کرتے تو میں کتابیں پڑھنے میں مصروف رہتا کبھی کبھی اس عالم میں دیکھ کر ٹھیکہ دار کہا کرتا کیوں بے احسان منشی بنے گا؟ اور میں یہ سنکر خاموش ہو جاتا۔

مزدوری سے ترقی کرتا رفتہ رفتہ معماری تک پہونچ گیا لیکن اسوقت مجھے پستی اور بلندی میں اچھا خاصا امتیاز ہو گیا تھا چنانچہ علم کو مقصدِ زندگی قرار دیکر معماری تو ترک کی اور لاہور کی مشہور سیر گاہ شملہ ویلی پر چوکیداروں میں نوکر ہو گیا۔ وہاں شام کے سات بجے سے میں ڈیوٹی پر جاتا اور صبح سات بجے تمام رات پاسبانی کر کے اپنے مکان پر لوٹ آتا۔

مکان میں کئی بے پورے دیہات کے مزدور رہتے تھے اور میرے حصہ میں اُس مکان کا ایک غسلخانہ تھا جس کا کرایہ میں چھ آنہ مہینہ ادا کرتا تھا، جگہ کی قلت کے باعث اُس میں چارپائی کی گنجائش نہ تھی اس لئے ایک بوریا ہی میرا بستر تھا، اُن دنوں سے آج تک میں زمین پر سوتا ہوں۔

چوکیداری کی راتوں کا سناٹا مفت کی سرکاری روشنی اور معروف تنہائی مجھے ابھی تک نہیں بھولتی۔ اُن دنوں چارسو ساڑھے چارسو صفحات کا یومیہ مطالعہ میری زندگی کا معمول تھا۔

چوکیداری کی جگہ تخفیف میں آجانے کے بعد مجھے ریلوے دفتر میں چپراسی کی جگہ ملی اُسوقت چند لکھے پڑھے آدمیوں سے میرے تعلقات ہو گئے تھے شعر و شاعری کا شوق یوں تو مجھ میں اول سے تھا قاضی محمد ذکی صاحب ذکی کے فیضِ صحبت سے بیدار تھا اور جب کوئی اچھا شعر سنتا تو بیتاب ہو جاتا مصرعے تو اکثر اور کبھی کبھی پورا شعر اور بعض اوقات دو دو تین تین شعر بلا تکلف ہو جایا کرتے تھے لیکن چونکہ اپنے شاعر ہو جانے کا یقین نہیں تھا اس لئے نہ تو وہ شعر محفوظ ہیں اور نہ یہ اندازہ کہ شعر کب سے کہتا ہوں۔ گھر اور دوستوں میں بھی کوئی ایسا شخص نہ تھا جسے یہ خیال ہوتا، لاہور کے دوران تعلیم میں بھی میرے دوست توقیر طاہر گنگوہی کے سوا کوئی ایسا نہیں جس نے میری حوصلہ افزائی کی ہو اور وہی شخص مجھے پہلی بار کھینچ تان کر لاہور کے ایس۔ پی۔ ایس۔ کے ہال کے مشاعرہ میں لیکر گیا اور مجھ سے میری ایک غزل پڑھکر پبلک سے روشناس کرایا اور اُسی دن سے مجھے یہ بھی احساس ہونے لگا کہ میں شاعر ہو سکتا ہوں اور اُسی بنا پر مطالعہ میں اس قدر منہمک ہو گیا کہ آج تک چوبیس گھنٹے میں سے صرف چار گھنٹے آرام کرتا ہوں اگرچہ مشق کے طور پر اشعار تو نہ جانے کتنے کہے ہوں گے لیکن جو کہتا تھا اُن میں توقیر طاہر صاحب جو اچھا شعر سمجھتے تھے وہ رکھ لیتے تھے اور جو بے معنے ہوتا وہ ضایع کر دیتے۔ وہ شاعر ہوں یا نہ ہوں

لیکن شعر فہم ایسے اچھے ہیں کہ اُن کے انتخاب کو ہر بیدار دماغ پسند کرتا ہے۔ میرا آج تک کا جس قدر کلام ہے وہ تمام تر جناب توقیر طاہر کی توجہ اور احتیاط کا نتیجہ ہے۔

تفریح پسند دوستوں اور دفتر میں کلرکوں کے رویہ نے مجھے چپراس سے دستبردار کر کے باغبانی پر مجبور کیا اور میں گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں ایک باغبان کی معاونت میں کام کرنے لگا لیکن عہدہ داران کی نجی خدمات اور جمعداروں کی بیجا چاپلوسی کی خواہش نے بہت جلد یہ کام بھی چھڑا دیا اور پھر میں بیس روپیہ ماہانہ پر گیلانی بکڈپو میں ایک عرصہ تک ملازمت کرتا رہا لیکن پھر تنخواہ میں تاخیر شروع ہوئی اور ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت پہونچی جب چار ماہ تک تنخواہ سے محروم رہا تو وہاں سے بھی دامن کش ہوا اور مکتبۂ دانش کے نام سے اپنا ذاتی کتبخانہ قایم کیا اب اُسی کی تعمیر میں اپنی تمامتر قوتوں سے منہمک ہوں۔

میرا سرمایۂ شعری زیادہ تر نظموں پر مشتمل ہے، لیکن چونکہ فرمایش صرف غزلوں کے انتخاب کی ہے اس لئے جو کچھ لکھی ہیں ان میں سے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

احسان دانش - ۱۹ر اگست سنہ ۴۰ء

نظر پہ جلووں کی حکمرانی دلوں پہ مایوسیوں کا پانی
اگر چھڑالے امید دامن کہاں ٹھکانا ہے آدمی کا

زمیں کے ذروں پہ خواب طاری فلک پہ تاروں کی بند آنکھیں
یہ زندگی کی سحر ہے کیسی سماں ہے سب شام زندگی کا

ہے ختم اب جانکنی کا منظر نگاہ سجدے میں جھک گئی ہے
خدا خدا کر کے مدتوں میں خمار ٹوٹا ہے زندگی کا

دلوں کے دولتکدے ہیں خالی وفا کے جوہر نہیں کسی میں
دہائی اے دشمنوں دہائی فریب خوردہ ہوں دوستی کا

ہر ایک سجدہ ہوا نمایاں خودی کے دامن پہ داغ بن کر
خدا سے بھی منحرف ہوں جب سے مآل دیکھا ہے بندگی کا

خدا کی دین ہے وہ عجز عشق بھی جس میں،
غرورِ حسن کے انداز پائے جاتے ہیں،

فغاں فغاں! کہ جنھیں مارِ آستیں کہئے
وہ لوگ میرے رفیقوں میں پائے جاتے ہیں

مری وفا پہ نہ جا حسن کی شکست کو نہ دیکھ!
تری جفا کے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

اگرچہ اب مجھے غم راس آگیا لیکن،
کسی کے لطف و کرم یاد آئے جاتے ہیں

وصال و ہجر کے پردے میں رات دن احسان
حیات و موت کے خاکے بنائے جاتے ہیں

خیال سود و زیاں عبث ہے گھرا ہوا ہے الم کا بادل
بدلنے والا ہے وقت کروٹ جو مسکرانا ہو مسکرا لے!

عبادتیں کر کے اپنے آگے دعا میں دستِ سوال کیسا
سرِ تکبر کبھی تو آخر خدا کی درگاہ میں جھکا لے!

میں اُسکی شانِ کرم کے صدقے دیا جو احسان مجھکو کیا کیا
خموشیوں کی فغانِ پیہم، سکوں کی آہیں نظر کے نالے!

وصل کا خواب کجا وقتِ دیدار کجا،
ہے غنیمت جو ترا درد بھی حاصل ہو جائے۔

ضبط بھی صبر بھی امکان میں سب کچھ ہے مگر
پہلے کمبخت مرا دل تو مرا دل ہو جائے
آہ اس عاشقِ ناشاد کا جینا اے دوست
جس کو مرنا بھی ترے عشق میں مشکل ہو جائے

شبابِ محبت سے مانوس ہو کر
مآلِ محبت سے گھبرا رہا ہوں
نہ جانے محبت کا انجام کیا ہے
میں اب ہر تسلی سے گھبرا رہا ہوں

ہیں قصرِ محبت کے معمار دونوں
نگاہوں کا دھوکا، دلوں کی خرابی
ہر اک شئے میں تم مسکراتے ہو گویا
ہزاروں حجابوں میں یہ بے حجابی
ابھی تک نگاہوں میں چھائی ہوئی ہے
وہ مستی میں ڈوبی ہوئی نیم خوابی

اب تو ہر دھڑکن کسی کے پاؤں کی آواز ہے
دل میں یارب کون مصروفِ خرامِ ناز ہے
حاصلِ صد گفتگو ہے عشق میں مہرِ سکوت
ہر نگاہِ آرزو فریادِ بے آواز ہے
طالبِ خلدِ نظر، جشنِ بہاراں پر نہ بھول!
یہ چمن کے دردناک انجام کا آغاز ہے
چاند کیا شئے ہے ترا دھندلا سا اک نقشِ قدم
چاندنی کیا ہے تری گردِ خرامِ ناز ہے
عشق کا وجدان ہر پہلو سے ہے بے قید و بند
حسن کو جس رُخ سے دیکھو گے اسیرِ ناز ہے
دے مجھے ان ڈوبتے تاروں سے پھر آواز دے
سو گیا عالم تمنا گوش بر آواز ہے
پرفشانی کا جہاں جبریل کو یارا نہیں
عشق کو ان رفعتوں میں رخصتِ پرواز ہے

ہماری رضا جوئیوں کو دعا دے
ترے ناز کو بے نیازی سکھا دی
مری آرزو ہے وہ تعمیرِ خستہ
وفا نے بنائی تغافل نے ڈھا دی
ترے حسن کی آتشیں چشمکوں کو
جگر نے سراہا نظر نے دعا دی
رہا گرچہ احسان دشمن زمانہ
سمٹے اس طرح اُن پہ ہستی مٹا دی

تھی آرزو کبھی کہ جبیں آستاں پہ ہو
اب تو یہ ہے جبیں نہ رہے آستاں رہے
اس دل کا جس میں دفن ہیں مقتول حسرتیں
آخر ترا خیال بھی کیوں رازداں رہے
احسان اس ہجومِ تصور کو کیا کروں
یہ بجلیاں بھی ساتھ رہیں ہم جہاں رہے

پہونچنے ہی کو ہیں حدِ سکوں تک مضمحل نبضیں
نہیں ہنستا ہے ہنس لو دو گھڑی حالِ پریشاں پر
ازل میں زندگی کی ضو سے دُنیا جگمگا اُٹھی
قضا نے قہقہہ مارا مگر انجامِ انساں پر
کہیں گلشن کہیں قوسِ قزح کی رنگ افشانی
حکومت ہے تری رعنائیوں کی چشمِ انساں پر
جو کرنا تھا ترے دیوانگانِ عشق کر گزرے
بس اب حشر تک ہنستی رہے چاکِ گریباں پر

میں نازِ ناخدا احسانؔ آخر کیوں اُٹھاؤں گا
بھروسا ہے مری غرقابیوں کو زورِ طوفاں پر

ہوتے جدا نہ کاش ابھی گلستاں سے ہم
پردہ اُٹھا رہے تھے بہار و خزاں سے ہم

تم جس گھڑی سے تھے بچھڑنے کے واسطے
اب اس گھڑی کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم

منسوخ کفر و دیں کے فسانے ہیں اس جگہ
باہر ہیں اب احاطۂ کون و مکاں سے ہم

آغاز کا ثبوت نہ انجام کا یقین،
ایسے کٹے ہوئے ہیں کسی داستاں سے ہم

احسانؔ کھلنے والا ہے بابِ حریمِ قبر
اُترے کھڑے ہیں توسنِ عمرِ رواں سے ہم

وہ سو کر اُٹھ رہے ہیں اللہ اللہ کیا نظارا ہے
قیامت نے ابھی کروٹ بدل کر سر اُبھارا ہے

جوانی نے اُسے اس خوش مذاقی سے سنوارا ہے
نہ عرضِ شوق کی جرأت، نہ ضبطِ غم کا یارا ہے،

سحر ہوتے ہی وہ اس طرح شرما کر سدھارا ہے
کہ مجھکو عمر بھر اب رنجِ محرومی گوارا ہے

کہاں صحرا نوردی اور کہاں دیدار کی حسرت
مری دیوانگی تیرے تغافل کا اشارا ہے،

معطر سانس، چہرہ رشکِ گل، مستی بھری آنکھیں
جوانی ہے کہ اک سیلابِ رنگ و بو کا دھارا ہے

تمھاری یاد ہے میری کتابِ غم کا دیباچہ
خدا رکھے یہی ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا ہے

ستم کو کیا ستم سمجھوں جفا کو کیا جفا جانوں ؟
وہی جور آشنا جب زندگانی کا سہارا ہے ؟

ہوا مغموم، منظر مضمحل، ماحول افسردہ
مجھے اے ناخدا کس گھاٹ تونے لا اُتارا ہے؟

وفا کی آرزو لغزش ہے اک خوش اعتقادی کی
مجھے احسانؔ اکثر دوستوں نے مل کے مارا ہے

مہتاب کے جلوؤں میں اُف سوئی ہوئی کلیاں
آغوشِ گلستاں ہے تصویرِ ہم آغوشی

جلوؤں سے ترے روشن قندیلِ تخیل ہے،
احسانؔ سے کب ہوگی احسان فراموشی

وہ عشق خاکِ عشق ہے، وہ حُسن خاکِ حُسن ؟
جو قید ہو فسانۂ ہجر و وصال میں

ہو سوئے آسماں جو دعا کے لئے بُلند
یہ پستیاں کہاں مرے دستِ سوال میں

خزاں کو دے مرے گلزار کے لئے تکلیف
ہے یہ بہار کا ہنگامہ ناگوار مجھے

ستم کہ یہ ہے مرے جبر و اختیار کا حال
نہیں ہے جبر سی شئے پر بھی اختیار مجھے

بڑا کرم ہے کہ بخشا ہے اک دلِ بیتاب
مگر گھٹا کے جنوں کر نہ شرمسار مجھے

کہیں فریبِ نظر ہے کہیں فریبِ خیال
نہیں طلسمِ دو عالم پر اعتبار مجھے

دلِ حزیں تری گہرائیوں میں پچھلی رات
پکارتا تھا مرا کون غمگسار مجھے

وہ دل پہ چھایا ہے احسانؔ یاس کا عالم
صدائے سازِ طرب بھی ہے ناگوار مجھے

مجھے چپ سمجھنے والے تجھے کیا خبر کہ گم ہے
ترے نغمۂ سحر میں مرا نالۂ شبانہ

تجھے کس طرح بتاؤں کہ ہے محترم کہاں تک
مرے عشق کی نظر میں ترے حُسن کا زمانہ

غمِ ہجر بے اثر ہے جو ہو ذوقِ وصلِ کامل
مجھے یادِ گلستاں میں ہے قفس بھی آشیانہ

یہ اُڑی اُڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو
تری صبح کہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

ترے فیضِ قدم سے اے بہارِ گلستاں پرور!
بقدرِ چاک دل چاکِ گریباں دیکھ لیتا ہوں

نشیمن کے وہ بے ترتیب تنکے ہائے کیا شے تھے
قفس میں آج تک خوابِ گلستاں دیکھ لیتا ہوں

نظر کرتا ہوں جب عقبیٰ کے حیراں کُن فسانوں پر
شبِ ہستی میں اک خوابِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں

اسیری میں سکوں مشقِ تصور کا کرشمہ ہے
چمن اندر چمن تا حدِ امکاں دیکھ لیتا ہوں

نہیں احسان اب وہ مجلسِ احباب پہلی سی
میں اب انساں سے پہلے ظرفِ انساں دیکھ لیتا ہوں

آرزو اک جُرم ہے جس کی سزا ہے زندگی
زندگی بھر آرزوؤں کو پشیماں کیجئے

ذرے ذرے میں ہیں احسان اسکے جلوے آشکار
دیکھئے اور دیکھ کر تکمیلِ ایماں کیجئے

عشق کو تقلید سے آزاد کر
دل سے گریہ، آنکھ سے فریاد کر

اے خیالوں کے مکیں نظروں سے دور
میری ویراں خلوتیں آباد کر

حسن کو دنیا کی آنکھوں سے نہ دیکھ
اپنی اک طرزِ نظر ایجاد کر

بھٹکا ہوں اپنی منزلِ مقصد سے بارہا
آساں جان کر کبھی دشوار دیکھ کر

غربت کی دوپہر میں خیالِ وطن نہ پوچھ!
گر گر پڑا ہوں سایۂ اشجار دیکھ کر

احسان جس مکاں میں کبھی جشنِ شوق تھا
روتا ہوں اُس کے اب در و دیوار دیکھ کر

خلوت میں زور پر ہے صنم سازئ خیال
نظارہ سے عزیز حجابِ نظر ہے آج

پھیلا دیا ہے عشق نے دامِ فریبِ جذب
ہر برق بیقرارِ شکارِ نظر ہے آج

احسان دل میں یاس ہے چہرے پہ بیکسی
پنجاب میں یہ قیمتِ علم و ہنر ہے آج

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

نگار سائز کے ۲۴۴ صفحات پر ——— قیمت معہ محصول عہ ——— منیجر نگار

علی اختر اختر

میرا نام علی اختر ہے اور وطن علیگڑھ - ۱۳۱۱ھ میں بمقام ریاست رامپور پیدا ہوا - کچھ دن علیگڈھ میں تعلیم پائی اور اُس کے بعد ناںہال کے تعلق سے آگرہ سینٹ جانس کالج میں رہا -

فارسی اور عربی کا درس مولانا نصیر الدین صاحب سے حاصل کیا تھا اور اُس زمانہ کی مروجہ تکمیل کے بعد اسکول میں داخل کیا گیا تھا - کالج کے ابتدائی ایام ہی میں سل میں مبتلا ہوگیا، جس کی وجہ سے ایک سال تک تعلیم بند رہی، پھر حالات بدل گئے اور طبیعت اُدھر رجوع نہ ہوسکی - غالباً سنہ ۱۰ء یا سنہ ۱۱ء سے حیدر آباد میں بہ سلسلۂ ملازمت مستقلاً قیام پذیر ہوں -

شعر مجھے خود یاد نہیں کہ کس عمر سے کہہ رہا ہوں، میرے گھر میں شعر و ادب کی فضا پہلے سے مرتب تھی اس لئے میری شاعرانہ فطرت کو اس سے بہت مدد ملی - شاید (۱۴) (۱۵) سال کی عمر کے دو شعر حافظہ میں ہیں، جنھیں ذیل میں لکھتا ہوں:

قفس میں سمجھے تھے ہم کہ حالت رہین امن و اماں رہیگی کسے خبر تھی کہ برق اب بھی نگاہ بر آشیاں رہے گی

ڈوبی ہوئی پاتا ہوں، نبضِ دل دیوانہ ہلکی سی پھر اک جنبش اے جلوۂ جانانہ!

لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ میرے خاندان کے دوسرے افراد، خورد و بزرگ عام طور پر وہی داغ اور امیر کے راستوں پر چل رہے تھے، لیکن اس نوع کی شاعری سے مجھے ابتدا ہی میں کوئی دلچسپی نہ ہوسکی ذخیرہ کے ابتدائی نمبروں میں بھی میری نظمیں شایع ہوتی رہتی ہیں، یہ واقعہ بھی شاید سنہ ۱۲ء یا سنہ ۱۳ء کا ہے - چنانچہ 'بہار کا آخری پھول' کے عنوان سے جو نظم لکھی اُسے قبول عام بھی حاصل ہوا تھا - یہ ہیں میرے مختصر حالات -

اب انتخاب ملاحظہ ہو:

علی اختر اختر

میں ترے عشوؤں سے آشنا ہوں، یہ راز پنہاں سمجھ رہا ہوں کہ میری اس نارسی میں بھی ہے کوئی اشارا ضرور تیرا

حریف آگاہ عشق کب تھے یہ راز تو نے انھیں بتایا نہ جانے کیوں میری وحشتوں سے اُلجھ پڑا اضطراب تیرا

دل کی آرزو کی تھی درد بے دوا پایا
کیا سوال تھا میرا اور کیا جواب اُن کا

عشق کی لطافت کو خاکِ طور کیا جانے
مجھ پہ تھی نظر اُن کی مجھ سے تھا خطاب اُن کا

عالم تمنا ہے، خواب کا سا اک عالم
شوق نا تمام اپنا، عشوہ کامیاب اُن کا

منت کش نظارہ ہے جب تک نگہ شوق
نظارہ نقابِ رُخِ جانانہ رہے گا،

کبھی قابلِ ذکر تھا حالِ دل
اب آزادِ شرح و بیاں ہوگیا،

کوئی اور طرزِ ستم سوچیے،
دل اب خوگرِ امتحاں ہوگیا،

بیگانۂ احساس سہی سینۂ ہستی
جیتے ہیں کہ مایوس ہوا بھی نہیں جاتا

بیخودی نے توڑ دیں جب عشق و عرفاں کی حدیں
خود بخود برہم نظامِ دانش و دل ہوگیا

بیگانۂ شوقِ جلوہ گری وہ حسن خود آرا نہ ہو سکا
آئینہ سے نظریں ہٹ نہ سکیں، آئینہ سے پردا ہو نہ سکا

نہیں کچھ منحصر اس پر کہ غم سہنا نہیں آتا
سبھی مجھے اے تلخیٔ ایام خوش رہنا نہیں آتا

مری مظلوم چپ پر، شادمانی کا گماں کیوں ہو
کہ نا اُمیدیوں کے زخم کو بہنا نہیں آتا

جہانِ اعتبار میں، اسیرِ دامِ ہوش ہوں،
گماں ہے اضطراب پر سکونِ اضطراب کا

محبت نام ہے احساسِ غم کی اک لطافت کا
کہ غم ہوتا ہے احساس غم پنہاں نہیں ہوتا

عشق حریفِ جاں سہی، فکرِ مآل کار کیا،
دانش خود فریب کون؟ ہوش کا اعتبار کیا

حیف وہ رندِ نامراد جس نے اُٹھا کے جام سے
ہاتھ سے پھر گرا دیا، رنجِ خمار دیکھ کر

تجھ سے حیات و موت کا مسئلہ حل اگر نہ ہو
زہرِ غمِ حیات پی موت کا انتظار کر

دیکھ بساط اُلٹ نہ جائے عالمِ عقل و ہوش کی
چاک نہ اے جنونِ شوق پردۂ امتیاز کر

عشق، بقدرِ آرزو تشنۂ زخم ہے ابھی
تیرِ نگاہِ ناز کو اور بھی دل نواز کر

اب وہ مآل کچھ سہی، شمع جلی تو ایک رات
آہ کہ بجھ کے رہ گئے پہلے ہی امتحاں سے ہم

جنوں نے فاصلہ رکھا، نہ کوئی عشق و عرفاں میں
گریباں کے عوض اب ہاتھ اُلجھتا ہے رگِ جاں میں

کہاں کا ہوش کیسی آگہی، اِس بزمِ امکاں میں،
مگر اِک نیم بیداری سی ہے خوابِ پریشاں میں

یہ بجلی ہے کہ رقصِ جلوۂ گل خیر ہے، ہمدم
قفس میں ہوں، مگر میرا نشیمن ہے گلستاں میں

دل میں اب تابِ ضبط بھی تو نہیں،
آپ کیوں یاد آئے جاتے ہیں،

دل کے اکثر فسانہ ہائے جمیل،
آنسوؤں میں سنائے جاتے ہیں

آ ہی جاتا ہے نشیمن کا خیال
میں اسیری میں بھی آزاد نہیں

کب ہوئی آپ کو توفیقِ کرم ۔۔۔ آہ جب طاقتِ فریاد نہیں

نہ محدود جلوے نہ محرومِ نظر ہیں ۔۔۔ مرے دل کو ناحق پریشانیاں ہیں
بتا اے جنوں گمرہانِ خرد کو ۔۔۔ یہ دانائیاں ہیں کہ نادانیاں ہیں

وضع کی ہے جنوں نے نسبتِ خاص ۔۔۔ تار دامن ہیں اور رگِ جاں میں
ظرفِ وحشت کی یہ بھی خامی ہے ۔۔۔ ورنہ قیدیں کہاں ہیں زنداں میں

دیکھ نامحرمِ اسرارِ حیات ۔۔۔ اس فسانے کی حقیقت دل میں

مقام اور بھی ہیں دانش آزما لیکن ۔۔۔ طلسمِ ہستیِ فانی ترا جواب نہیں

حُسن فریبِ دیدہ و دل ہی، دیدہ و دل ہیں حُسن فریب ۔۔۔ دیوانے یہ عالمِ رنگیں، صبح نہیں یا شام نہیں
اُنکے جلوے عام ہیں، لیکن آنکھیں ہیں سرگرمِ تلاش ۔۔۔ اب یہ خطا ہو آنکھوں کی یا اُنکے جلوے عام نہیں

عشق کہتا ہے کہ اب اک نئی دُنیا اختر ۔۔۔ خود ہی تخلیق کروں، خود ہی پھر آباد کروں،

توڑ دے دل میں کوئی تیز سا نشترِ مطرب ۔۔۔ روح خوابیدہ ہے نغموں کا یہ ہنگام نہیں

زحمتِ التفات کی آپ نے آہ، کیا کیا ۔۔۔ اب وہ لطافتیں کہاں حسرتِ انتظار میں

کہاں کہاں ہے تری جستجو میں آوارہ ۔۔۔ مری نظر کہ ابھی آشنائے راز نہیں
مری خطا ہے کہ میں ناشناسِ لذتِ درد ۔۔۔ سمجھ رہا تھا ترا درد دلنواز نہیں،
بکھر رہے ہیں ابھی سے حیات کے اجزاء ۔۔۔ ابھی تو دوش پہ وہ کاکلِ دراز نہیں

نغمۂ درد چھیڑ کر انجمنِ حیات میں ۔۔۔ عشق نے جان ڈالدی پیکرِ کائنات میں
دعوتِ رقص جلوہ عام اور یہ نگاہِ ناتمام ۔۔۔ خود وہ حریفِ شوق ہیں پردۂ التفات میں

جو ازل سے ہے فضا میں گرمِ رقص ۔۔۔ سینۂ ہستی کی وہ فریاد ہوں
شرحِ اسبابِ گرفتاری نہ پوچھ ۔۔۔ میں کسی کا جلوۂ آزاد ہوں
اللہ رے بیخودی، خبرِ دوجہاں نہیں ۔۔۔ اب زندگی بہ قیدِ زمان و مکاں نہیں
بہلا نہ ہمصفیر مجھے کیسے مان لوں، ۔۔۔ بجلی گری ہے جسپہ مرا آشیاں نہیں
جاری ہے دل میں دعوتِ مژگاں کا اہتمام ۔۔۔ یعنی ہنوز سعئی جنوں رائگاں نہیں
اُس کی تلاش ہے مجھے رہگزرِ مجاز میں، ۔۔۔ حُسن بھی اک حجاب ہے جس کے حریمِ ناز میں
عقل ہے پھر حریفِ عشق اب یہ بساط اُلٹ نہ دو، ۔۔۔ پردہ اُٹھا کے آنہ جاؤ عالمِ امتیاز میں
مطربِ خوشنوا مجھے نشترِ تیز چاہیے ۔۔۔ یہ تو نوائے درد ہے نغمہ کہاں ہے ساز میں

میرے جنونِ خام کا بے اثری آل ہے
نالۂ دردمند میں ورنہ اثر کہاں نہیں
میرے ہی آنسوؤں سے کیا فیضِ جنوں ہے آشکار
دل کے لہو سے زینتِ دیدۂ تر کہاں نہیں

یہاں تو گلستاں بھی ہیم گردش سے نہیں خالی
نہ جانے پھول کیا سمجھے ہوئے ہیں مسکرانے کو
وہی کچھ خواب ہوں گے اور کچھ اوہامِ بیداری
جہاں سے چھیڑئے کمبخت دنیا کے فسانے کو

زندگی کیا ہے جو دل ہو تشنۂ ذوقِ فنا
یعنی یہ پردہ تو اُٹھ سکتا ہے آسانی کے ساتھ
گفتگوئے صورت و معنی سے ہے عنوانِ حیات
کھیلتے ہیں وہ مری فطرت کی حیرانی کے ساتھ
تم نے ہر ذرے میں برپا کر دیا طوفانِ شوق
اک تبسم اس قدر جلوؤں کی طغیانی کے ساتھ!
دل کی آبادی ہے اختر دل کی بربادی کا نام
اک تعلق ہے مری ہستی کو ویرانی کے ساتھ

لذتِ غم التفاتِ یار نے برباد کی،
ترکِ بیداد آہ اک تمہید تھی بیداد کی،
مسکرائے وہ مجھے یاد آگیا پیمانِ ضبط،
رہ گئی شرما کے گستاخی لبِ فریاد کی

میں نے کب چاہا تھا رسوائی کے ساماں ہو گئے
اُن کے جلوے میری ہستی میں نمایاں ہو گئے
اس تکلف سے ملایا سازِ مطرب کے نثار
دل کے سب کانٹے گلستاں در گلستاں ہو گئے
دل سے تھا ہنگامۂ ہستی اب اختر دل کہاں
ساز اِدھر ٹھہرا اُدھر نغمے پریشاں ہو گئے

سلامت مرے دل میں گھر کرنے والے
مرے غم کو پائندہ تر کرنے والے
وہ نغمے سنا آج پھر حسنِ مطرب
حقایق کو زیر و زبر کرنے والے

دلوں میں آگ بھری ہے غمِ نہانی کی
بہت گراں ہے یہ قیمت حیاتِ فانی کی
ہنوز دل میں ہے اک پرتو نشاطِ دوام
بہت قلیل تھیں گو ساعتیں جوانی کی

فریبِ رنگ پہ قایم ہے دہر کی بنیاد
خیال محوِ طلسمِ خیال ہوتا ہے

مبارک ہیں اُس دل کی ویرانیاں
جو تیرے تصور سے آباد ہے

نطق بخشنے والے آج شرم رہ جائے
سرگزشتِ دل ہے اور میری بیزبانی ہے
گرم رقص ہیں اختر ناتمام سے اجزار
زندگی حقیقت میں خوابِ زندگانی ہے

ہنستا ہے عشق غفلتِ اربابِ ہوش پر
دنیا ہے چند خوابِ پریشاں لئے ہوئے
میری نگاہِ شوق کو یہ کس نے بخشدیں
حیرانیاں، لطافتِ عرفاں لئے ہوئے

بر سرِ لطف ہو گر اُن کی نگاہ
خطِ پیمانہ رگِ جاں ہو جائے
عام ہو جائے اگر لذتِ غم
ذرۂ خاک بیاباں ہو جائے

93674

میں یقین کرم پہ ہوں مجبور، وہ سراپا ستمگر ہی سہی
وہ اِدھر مسکرا کے دیکھ تو لیں، اک ادائے فسونگری ہی سہی

کروٹیں لیتی ہے پھولوں میں شراب ہم سے اس فصل میں توبہ ہو گی،
حشر آئے گا نہ جانے کب تک زندگی اور ابھی رسوا ہو گی،

ہے وہی اہتمامِ جلوہ ہنوز اُن کو ارماں ہیں خود نمائی کے

وعیدِ موت ہے وعدہ حیات سرمد کا ترے خیال کی دُنیا میں کون مرتا ہے
یہ کس کے جلوۂ مطرب نے ساز چھیڑ دیا کہ ذرہ ذرہ زمانے کا وجد کرتا ہے

بن سکا درمانِ محرومی نہ اُن کا التفات تھم گئے آنسو مگر آنکھوں کو ویراں کر گئے
مُسکرائے یوں مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ مری فطرت کی حیرانی کو عرفاں کر گئے

فریب صورت عالم نہیں ہے جلوۂ معنی حقیقت خود اسے افسانہ در افسانہ کرتی ہے

دُنیا کی شورشوں سے مرجھا چلی ہیں نبضیں، ہاں مطربِ محبت! اک نغمۂ جوانی

غمِ فنا سے لیا عیشِ جاوداں میں نے متاعِ عشق کو اتنا کیا گراں میں نے
مری بلا کو ہو، جاتی ہوئی بہار کا غم بہت لٹائی ہیں، ایسی جوانیاں میں نے

حریم کعبہ بنا دی وہ سرزمیں، میں نے ترے خیال میں رکھدی جہاں جبیں میں نے
مجھی کو پردۂ ہستی میں دے رہا ہے فریب وہ حُسن جس کو کیا جلوہ آفریں میں نے
چٹک میں غنچے کی وہ صورت جانفزا تو نہیں سُنی ہے پہلے بھی آواز یہ کہیں میں نے
رہینِ منزلِ وہم و گماں رہا اختر، اسی میں ڈھونڈھ لیا جادۂ یقیں میں نے

اک بسیط احساس، اک شوق، نمایاں چاہئے عشق کی نبضوں میں رقص موج طوفاں چاہئے
اک نئی ہستی، نئی تعمیر دوراں چاہئے میں ترے قرباں پھر اب تجدید پیماں چاہئے
موت کے اسرار سے اے عشق اُلٹ دے اب نقاب منظرِ ہستی کا یہ رُخ بھی نمایاں چاہئے

منزلِ ہستی کی عبرت دیکھ لی اے مجاز اپنی حقیقت دیکھ لی
روتا ہوں کہ بیگانۂ تکمیل ہے اب بھی وہ بے اثری جو مرے شیون کے لئے ہے
چاہے تو گدائے درِ میخانہ کو ساقی اک جام میں سرحلقۂ میخانہ بنادے

کب تک یہ اجتناب، یہ صبر آزما حجاب اب لطف ہے اسی میں کہ پردا اُٹھائیے
رہی ہے اِس قدر میری رفیقِ شامِ تنہائی کہ مجھکو نامرادی سے محبت ہوتی جاتی ہے

آ پہونچی ہے جان کی خرابی — اے عشق نوید کامیابی!

کر چکا اب گلۂ جور نمایاں کوئی — درد کی آڑ میں ہے سلسلہ جنباں کوئی

آ نہ جاؤ جو تمھیں سیرِ جنوں ہو منظور — آج پھر کرنے کو ہے دعوتِ مژگاں کوئی

جب نہ ہوا کوئی کفیل، موت کفیل ہوگئی — میری حیاتِ مختصر، مرگِ طویل ہوگئی

ذکرِ مآل چھیڑ کر تو نے غضب کیا ندیم — ساعتِ عیش تھی ہی کیا اور قلیل ہوگئی

روحِ آزادی پر اک بندِ گراں دیکھا کئے — ہم قفس میں پھر بھی، خوابِ آشیاں دیکھا کئے

اک جہانِ گفتگو تھا وہ سکوتِ منفعل، — شکوہ کیا کرتے یہ اندازِ بیاں دیکھا کئے

وسعتِ ہستی و عدم گوشۂ دل میں بند ہے — عشق کی منزلِ حیات عرش سے بھی بلند ہے

کچھ اِس نگاہ سے دیکھا تھا مجھ کو ساقی نے — چھُٹی شراب مگر شانِ بےخودی نہ گئی

جتنی ہے قریب منزلِ یار — اے دل اُتنی ہی دور بھی ہے

جب میں نے سُنا ہے نام اُن کا — دل پر اک چوٹ سی لگی ہے

ترک کیجئے وہمِ ہستی اور فنا ہو جائیے — اس کشاکش میں یہی صورت ہے اِک آرام کی

رہینِ دردِ عشق ہے، حیات ہو کہ موت ہو — یہ جنس کائنات میں حقیر بھی گراں بھی ہے

خوشا احساسِ غم، دُنیا نے کیا کیا لی ہیں کروٹیں کیا کیا — مجھے راحت نہیں ملتی مجھے تسکیں نہیں ہوتی

منزلِ دیدۂ بینا ہے حقیقت نہ مجاز — کعبہ بن جائے ترا دل کہ صنم خانہ بنے

کھوئے ہوئے ہیں اہلِ عقل حیرتِ بےقیاس میں — مسئلۂ حیات بھی عقدۂ سرنوشت ہے

اگر آگاہِ ہستی فطرتِ مجبور ہو جائے، — بہ قدرِ لفظ و معنی ذرہ ذرہ طور ہو جائے

تمہارے زخمیوں کا پوچھنا کیا، یہ اگر جاہیں، — تو ان کے خون کا ہر قطرہ اک منصور ہو جائے

نہیں اے ہمنفس بےوجہ میری گریہ سامانی، — نظر اب واقفِ رازِ تبسم ہوتی جاتی ہے

جہاں افسانۂ ہستی میں ہے اُلجھا ہوا اختر — حقیقت پردۂ اسرار میں گم ہوتی جاتی ہے

تلاشِ ناتمامِ شوق ہے نا آشنا دل سے — میں جتنا متصل ہوں دور ہوں اُتنا ہی منزل سے

حریفِ جادۂ دشوار بن اور مُسکراتا جا، — کہ مشکل اصل میں بنتی ہے صرف احساسِ مشکل سے

سپاسِ غم روز و شب ادا کر کہ ہے یہی رازِ شادمانی — بہار کچھ بھی نہیں یہ نکھرا ہوا سا اک جلوۂ خزاں ہے

رازِ حیات کھُل سکا کچھ بھی نہ اخترِ حزیں — ہوش ہے یہ کہ بیخودی، عقل ہے یا جنون ہے

تجلی حیات ہے ہنوز بطنِ خاک میں — پھر رہا ہوں دل کو کارواں بہ کارواں لئے ہوئے

نہاں ہیں میری خاک میں گداز دل کی رفعتیں
ٹھہر گیا ہوں میں زمیں پہ آسماں لئے ہوئے

دور نہیں ہیں عشرتیں سرحد اشک و آہ سے
راز نشاط پوچھئے میرے دل تباہ سے

دردِ نہاں بقدر شوق دیجئے، یا نہ دیجئے
شکوا ہے مجھکو آپ کی پرسش گاہ گاہ سے

میری قسمت میں خدا جانے کہاں سے آگئے
وہ جو خم ہیں آپ کی زلف پریشاں کے لئے

ہر قدم دیتی ہے دُنیا، دعوتِ عرفان راز
ذرہ ذرہ اک جہاں ہے فکر انساں کے لئے

مری نگاہ سے چھپ کر خوشا رعایت ذوق
مری نگاہ پہ بجلی گرائی جاتی ہے،

مشاہدات حقیقت کو ہے بہت اخترؔ
وہ اک کلی جو چمن میں کھلائی جاتی ہے

فریب جلوہ کہاں تک بروئے کار رہے
نقاب اُٹھاؤ کہ کچھ دن ذرا بہار رہے

جنوں کا رخ ہے حریم حیات کی جانب
الٰہی پردۂ اوہام اعتبار رہے

میں تری حیرتِ معصوم کے صدقے یہ نہ پوچھ
موت کیوں درد کا درماں نظر آتی ہے مجھے

منتیِ شوق کے قرباں کہ اب اُن کی صورت
اپنی صورت میں نمایاں نظر آتی ہے مجھے

مری دانست میں خواب گراں ہے رازِ بیداری
کہ بیداری مجھے خوابِ گراں معلوم ہوتی ہے

قفس میں کیوں چلی آتی ہے یادِ گلستاں ہمدم
کوئی بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

اِک صبر شکن احساس بلا اک درد بھری تقدیر ملی
جو خواب ازل میں دیکھا تھا اُس خواب کی یہ تعبیر ملی

ہنستی ہوئی کلیوں کے رُخ سے اُٹھے جو تبسم کے پردے
حسرت ہی کا ایک عالم دیکھا، عبرت ہی کی اک تصویر ملی

پہونچی ہے رفتہ رفتہ کہاں انتہائے عشق
اب دل میں اک لطافتِ غم ہے بجائے عشق

ٹوٹا نہیں ہنوز حجابِ فریبِ ہوش
اک نغمہ اور مطربِ رنگیں نوائے عشق

زاہد تری سمجھ میں نہ آئے گا یہ مقام
ناآشنائے کفر و یقیں ہے نماز عشق

سمجھا ہے اِک حقیقت باطن جسے مجاز
ہے خود وہی حقیقت باطن مجاز عشق

مری بیخودی ہے اُن آنکھوں کا صدقہ
چھلکتی ہے جن سے شرابِ محبت

اُلٹ جائیں سب عقل و عرفاں کی بحثیں
اُٹھا دوں ابھی گر نقابِ محبت

جذبات بھاشا

کا جدید اڈیشن کاغذ و کتابت نہایت نفیس - قیمت ۱۲ر- رعایتی قیمت ۹ر- علاوہ محصول- منیجر نگار

اختر شیرانی

میرے حالات :

ریاست ٹونک میں پیدا ہوا - لاہور میں ہوش سنبھالا اور شاید یہیں کے اخبارات کو سب سے پہلے میرے انتقال کی خبر شایع کرنے کا موقع ملے گا ـــــ !

اختر

انتخاب غزلیات

یہ کس کو دیکھ کر، دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شے ہے خدائی میں حسیں معلوم ہوتی ہے

ہے جام خالی تو پھیکی ہے چاندنی کیسی
یہ سیلِ نور، ستم ہے، شراب ہو نہ سکا !

یہ مے چھلک کے بھی اُس حسن کو پہونچ نہ سکی،
یہ پھول، کھل کے بھی اُس کا شباب ہو نہ سکا،

کون آیا، مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ !
زلف برہم کئے، با چشم حجاب آلودہ !

کس نے بستر پہ بٹھایا، یہ مجھے، شرما کر
کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش یہ حجاب آلودہ !

کس کو شکوہ ہے، مرے عشق سے رسوائی کا؟
کس کا لہجہ ہے بایں لطف، عتاب آلودہ !

محبت کے اقرار سے شرم کب تک ؟
کبھی سامنا ہو تو مجبور کر دوں !

ترے دل کو ملنے کی خود آرزو ہو !
تجھے اس قدر، غم سے رنجور کر دوں !

نہیں زندگی کو وفا، ورنہ اختر
محبت سے دنیا کو معمور کر دوں،

عبادت ہے، اک بیخودی سے عبارت
حرم کو مئے مشکبو سے بسا دیں !

جوانی ہو گر جاودانی تو یارب !
تری سادہ دنیا کو جنت بنا دیں !

شبِ وصل کی بیخودی چھا رہی ہے !
کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں !

اُنھیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تھا
مرے عشقِ رسوا کو اختر دعا دیں !

ہوے ناکام، ہوس کار بنے کیوں، اختر
یادِ سلمیٰ میں جوانی کو گنوا دینا تھا

نازد سے گیسوئے سلمیٰ پہ بڑھے ہات اختر
سنا یہ نغمہ، ستاروں کی چھاؤں میں مطرب!

شباب مٹ چکا، یادِ شباب باقی ہے
خوابِ نوشیں میں ہے وہ جانِ بہار

فضائے خواب میں تاروں سے کھیلنے والے!
زمانہ گزرا وہ یاسمن بو، جدا ہوئی ہمکنار ہوکر

اُس کے عہدِ شباب میں جینا!؟
اک محبت تھی، مٹ چکی یارب!

چٹکیاں سینے لگا، دل میں نشاطِ طفلی،
بظاہر ہم ہیں بلبل کی طرح مشہور، ہرجائی

مجھے میخانہ تھراتا ہوا محسوس ہوتا ہے
جو، بہاروں میں نہاں، رنگِ خزاں دیکھتے ہیں

ایک پردہ ہے غموں کا، جسے کہتے ہیں خوشی،
فتنۂ غم جگائے جا، حشرِ ستم اُٹھائے جا!

دل مرا سر بسر گداز، تیری حیا عدوے راز!
دورِ جہاں سے ساقیا! سرد ہوا ہے دل مرا

سایۂ ابر ہے شباب، حاصلِ زندگی خراب!
مجھے اپنی پستی کی شرم ہے، تری رفعتوں کا خیال ہے!

اس ادا سے کون یہ جلوہ گر، سرِ بزمِ حسنِ خیال ہے؟
میں بتاؤں واعظِ خوشنوا، ہے جہان و خلد میں فرق کیا؟

عشق، کہ جس کے دین میں، صبر و سکوں حرام ہے،
شان میں مے کی زاہدا، اس کے سوا میں کیا کہوں

پائے طلب کے واسطے، کوئی نئی زمیں بنا!
بھلا کیونکر نہ ہوں راتوں کو نیندیں بیقرار اُسکی!

جفائے نازکی، میں نے شکایت ہائے کیوں کی تھی

یوں گدایانہ تماشائے لبِ بام نہ کر
کہ رات بھر کی ہے اک روشنی، شباب نہیں!

ہے بو شراب کی، ساغر میں اب شراب نہیں!
نور و نکہت کی داستانِ خموش!

ہماری آنکھ بھی شب بھر ستارہ بار، رہی!
مگر ابھی تک ہمارے پہلو میں نکہتِ یاسمن ہے باقی

بے جینے والو! تمھیں ہوا کیا ہے؟
تیری دُنیا میں اب دھرا کیا ہے؟

آج یاد آگئے بھولے ہوئے افسانے چند!
مگر دل میں گدازِ فطرتِ پروانہ رکھتے ہیں

وہ میرے سامنے شرما کے جب پیمانہ رکھتے ہیں
دیدۂ دل سے وہی، سیرِ جہاں دیکھتے ہیں!

ہم تبسم میں نہاں، اشکِ رواں دیکھتے ہیں!
نیچی نظر کئے ہوئے، بام پہ مسکرائے جا!

مجھ سے بھی ضبطِ غم نہ ہو، تو بھی نظر چرائے جا!
برف و شراب کی جگہ، برق و شرر پلائے جا!

عمر ہے مختصر تو ہو، عمرِ طرب بڑھائے جا!
مگر اپنے دل کو میں کیا کروں، اسے پھر بھی شوقِ وصال ہے

جو نفس ہو مست بہار ہے، جو نظر ہے غرقِ جمال ہے!
یہ اگر فریبِ خیال ہے، وہ فریبِ حسنِ خیال ہے!!

ایک نظر کا کام ہے، ایک اثر کا نام ہے!
میرے لئے حلال ہے، تیرے لئے حرام ہے!

وادیٔ مہر و ماہ تو، لغزشِ نیم گام ہے!
کبھی لہرا چکی ہو، جیسے زلفِ مشکبار اُس کی!

مجھے جینے نہیں دیتی، نگاہِ شرمسار اُس کی!

JAMIA ... LIBRARY

نہیں عذر، زاہدو! لاکھ مرتبہ جائیں طوفِ حرم کو ہم!
مگر ایک شرط ہے، میکدہ نہ ملا کرے ہمیں راہ میں!

جو مزاجِ دل نہ بدل سکا، تو نظامِ دہر کا کیا گلہ؟
وہی تلخیاں ہیں ثواب میں، وہی لذتیں ہیں گناہ میں!

گلۂ ستم کی مجال تو ہے پر آہ اس کو میں کیا کروں؟
یہ جو ایک بجلی سی بیقرار ہے اُن کی نیچی نگاہ میں!

نہیں یاد، عیش و ملالِ عمرِ گزشتہ کی کوئی داستاں
مگر آہ چند وہ ساعتیں، جو بسر ہوئی ہیں گناہ میں!

کوچہ گردی میں کٹیں، شوق کی کتنی راتیں!
ڈھونڈتے تھے جسے، وہ ماہِ خراماں نہ ملا

یوں تو ہر در پہ ہلکتے نظر آئے دامن،
کھینچتے ناز سے جس کو وہی داماں نہ ملا!

درِ جاناں پہ فدا کرتے دل و جاں اختر
وائے برحالِ دل و جاں، درِ جاناں نہ ملا!

کس کی آنکھوں کا لئے دل پہ اثر جاتے ہیں!
میکدے ہات بڑھاتے ہیں، جدھر جاتے ہیں!

کیا کہہ گئی کسی کی نظر، کچھ نہ پوچھئے!
کیا کچھ ہوا ہے دل پہ اثر، کچھ نہ پوچھئے!

بہشتوں پہ ہنستی ہے، دنیائے فانی!
جوانی کی راتیں ہیں کتنی سہانی!

ستم ہے کہ اے دل! نہیں جاودانی،
حسینوں کا حسن اور ہماری جوانی!

ترا حسن! پروردۂ رنگ و بو ہے!
بہاروں میں کھیلی ہے تیری جوانی!

یہ بے رخی ہے تو "اپنے خیال" سے میں بھی!
تری جوانی کی راتیں، تباہ کر دوں گا!

دل میں خیالِ نرگسِ جانانہ آ گیا!
پھولوں سے کھیلتا ہوا دیوانہ آ گیا!

پارسائی کی جوانمرگی نہ پوچھ!
توبہ کرنی تھی کہ بدلی چھا گئی!

سازِ دل کو گدگدایا، عشق نے!
موت کو لے کر جوانی آ گئی!

عمر بھر کی تلخ بیداری کا ساماں ہو گئیں،
ہائے وہ راتیں کہ جو خوابِ پریشاں ہو گئیں!

عمر بھر، کم بخت کو پھر نیند آ سکتی نہیں
جس کے سینے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں!

یا یہ دل دکھاتا ہے، یا وہ جی لبھاتا تھا!
یہ بھی اک زمانہ ہے، وہ بھی اک زمانہ تھا!

اُن رس بھری آنکھوں میں، حیا کھیل رہی ہے
دو زہر کے پیالوں پہ قضا کھیل رہی ہے!

غم خانۂ ہستی میں ہیں، مہماں کوئی دن اور
کر لے ہمیں تقدیر پریشاں کوئی دن اور

دنیا ہے سیہ خانۂ غم، شمع جلا دے!
اُٹھ ساقی مہوش، مجھے پیمانہ اٹھا دے!

نہ بھول کر بھی تمنائے رنگ و بو کرتے!
چمن کے پھول، اگر تیری آرزو کرتے!

مسرت! آہ تو بستی ہے کن ستاروں میں؟
زمیں پہ عمر ہوئی، تیری جستجو کرتے!!

ایاغِ بادہ میں آکر، وہ خود چھلک پڑتا
گر اُس کے مست، ذرا اور ہاؤ ہو کرتے!

غرورِ عشق کی تاثیر تو یہ تھی اختر، کہ ہم نہیں وہ خود اظہارِ آرزو کرتے!

کشکول ہو یا ساغرِ جم، نشّہ ہے یکساں شاہانہ پیئے جا کہ فقیرانہ، پیئے جا!
اِس کمر کی بستی میں ہے مستی ہی سے ہستی دیوانہ بن اور بادلِ دیوانہ پیئے جا!

دیکھ سکتا ہے بھلا کون، یہ پیارے آنسو! میری آنکھوں میں نہ آجائیں، تمھارے آنسو!
صبحدم دیکھ نہ لے کوئی یہ بھیگا، آنچل! میری چغلی کہیں کھا دیں نہ تمھارے آنسو!
ہجر ابھی دور ہے، میں پاس ہوں اے جانِ جہاں! کیوں ہوئے جاتے ہیں بے چین تمھارے آنسو!

یاد آؤ مجھے للہ نہ تم یاد کرو! میری اور اپنی جوانی کو نہ برباد کرو!
شرم رونے بھی نہ دے، بیکلی سونے بھی نہ دے اس طرح تو مری راتوں کو نہ برباد کرو!
میرے پردیسیو! سیکھی ہے یہ کس دیس کی ریت جو تمھیں یاد کرے، تم نہ اُسے یاد کرو!
حد ہے پینے کی کہ خود پیرِ مغاں کہتا ہے اس بُری طرح جوانی کو نہ برباد کرو!

قبر پر آئی ہے وہ پیکرِ ناز! عمرِ فانی کو دے کوئی آواز!
زندگی کی حقیقت، آہ نہ پوچھ! موت کی وادیوں میں اک آواز!

عشق کا موسم، غم کی ہوائیں، اف ری جوانی، ہائے زمانے! دل میں تمنا، لب پہ دعائیں، اف ری جوانی، ہائے زمانے
صحنِ چمن اور بادہ پرستی، رات کا منظر، عالمِ مستی! قدموں پہ ساغر، سر پہ گھٹائیں، اف ری جوانی، ہائے زمانے
گھر پہ کسی کے رات گزرنا، اور وہ اُس کا صبح کا ڈرنا! "دیکھو کنیزیں دیکھ نہ پائیں"۔ اف ری جوانی، ہائے زمانے
ایک گلی سے روز گزرنا، گرچہ کسی سے بات نہ کرنا! سینے میں دھڑکن، منھ پر ہوائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے
گھر پہ وہ اک مہ پارہ کا آنا، بات نہ کرنا آنکھ چرانا! دل کو خلش تنہا کبھی پائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے

انھی غم کی گھٹاؤں سے خوشی کا چاند چمکے گا اندھیری رات کے پردوں میں، دن کی روشنی بھی ہو!

ناداں آنسوؤں کو ہے مدت سے جستجو آرامگاہِ گوشۂ داماں کو کیا ہوا؟
آگیا وقت کہ آنکھیں ہوں نثارِ سلمیٰ وہ نظر آتے ہیں آثارِ دیارِ سلمیٰ!

آ کہ ہم بھی اک ترانہ جھوم کر گاتے چلیں، اس چمن کے طائروں کی ہمزبانی پھر کہاں!
ایک ہی بستی میں ہیں، آساں ہے ملنا آ ملو! کیا خبر لے جائے دورِ آسمانی پھر کہاں!
پھول چُن، دل کھول کر عیش و طرب کے پھول چُن! موسمِ گل پھر کہاں، فصلِ جوانی پھر کہاں!

باغوں پہ جھوم جھوم کے بادل نہیں اُٹھے، گیسو بکھر رہے ہیں عروسِ بہار کے
مخمورِ خواب، بسترِ گل سے اُٹھے ہیں وہ، انگڑائی لی ہے باغ میں صبحِ بہار نے

میرے ارمانوں سے کہتی ہے اجل — اس قدر سامان! دو دن کے لئے!
اُن کی صحبت کا تصور اور ہم! — زندگی، دھوکا تھی، کچھ دن کے لئے!

شب کو پہلو میں جو وہ ماہ سیہ پوش آیا — ہوش کو اتنی خبر ہے کہ نہ پھر ہوش آیا!
اُن کا زانو تھا مرا سر، مرا دل ہاتھ اُن کا — بیخودی تیرا برا ہو! مجھے کب ہوش آیا!
دو گھڑی ہو بھی گئی گر غم فردا سے نجات — چٹکیاں لیتا ہوا دل میں غم دوش آیا!

آرزو وصل کی، رکھتی ہے پریشاں کیا کیا! — کیا بتاؤں کہ مرے دل میں ہیں ارماں کیا کیا!
اب وہ راتیں نہ وہ باتیں نہ ملاقاتیں ہیں — محفلیں خواب کی صورت ہوئیں، ویراں کیا کیا!
وحشت غربت میں رُلاتیں ہیں ہمیں یاد آکر — اے وطن! تیرے گل و سنبل و ریحاں کیا کیا!

چاند کے ٹکڑے بھی نظروں میں سما سکتے نہ تھے — کیا بتائیں ہم ترے در کے گدا کیوں ہو گئے!

اے صبا کون سے گلزار سے تو آتی ہے — تجھ سے اُس غنچہ دہن کی مجھے بو آتی ہے!

کسی یاد میں آنسو بہائے تھے نہ کبھی — میں آج کیوں مرے پروردگار روتا ہوں

میرا ہر شعر ہے اختر مری زندہ تصویر — دیکھنے والے نے ہر لفظ میں دیکھا ہے مجھے

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علحدہ علحدہ خرید فرمائیں تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں!

نگارستان دو روپیہ	جمالستان چار روپیہ	ترغیبات جنسی تین روپیہ	شہاب کی سرگزشت ایک روپیہ	مجموعہ استفسار و جواب ۲ جلد نو روپیہ
معرکۂ سخن ڈھائی روپیہ	مکتوبات نیاز ڈھائی روپیہ	اُردو شاعری دو روپیہ	ہندی شاعری ڈیڑھ روپیہ	میزان کل ستائیس روپیہ آٹھ آنہ

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپے میں ملجائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

اُمید امیٹھوی

میرا نام محمد علی، کنیت ابوالکمال، تخلص، امید ہے۔ میں قصبہ گڑھ امیٹھی ضلع سلطان پور کا رہنے والا ہوں اور اسی قصبہ میں ۳ / فروری سنہ ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوا۔

میرے مورث اعلیٰ حضرت حافظ سید رسول اور سید سالار مسعود غازی کے والد بزرگوار ایک ساتھ ولایت غزنی سے مع اہل و عیال ہندوستان آئے اور والیِ ریاست پرتاب گڑھ کی ارادت مندیوں سے متاثر و مجبور ہو کر موضع خالصہ ضلع پرتاب گڑھ میں سکونت پذیر ہو گئے اسوقت سے یہ موضع سادات خالصہ کے نام سے مشہور ہے۔

میرے دادا میر خدا بخش صاحب خالصہ سے ترک سکونت کرکے قصبہ امیٹھی میں آباد ہو گئے اور میرے والد سید علی حسن مرحوم چند روز ریاست امیٹھی میں ملازمت کرنے کے بعد ملازمت سے دستکش ہو کر ایک مختصر سرمایہ سے عطر تیل کی تجارت شروع کرکے ایک معمولی مگر خوش حال زندگی بسر کرتے تھے اور یہی تجارت اُن کی آخر عمر تک ذریعہ معاش رہی میرے خاندان کے بقیہ افراد اب بھی خالصہ میں آباد ہیں اور کاشتکارانہ و زمیندارانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں نسباً سید ہوں اور میرا سلسلۂ نسب جناب زین العابدین ابن امام حسین۔ ابن حضرت علی کرم اللہ وجہ تک پہونچتا ہے۔ میں مذہباً حنفی ہوں۔

میری ابتدائی تعلیم امیٹھی ہی میں مولوی برکت علی شاہ سے اور اسکولی تعلیم منشی عباس علی صاحب سے ہوئی درسیات فارسی میں نے مولوی محمد رضا صاحب بریلوی سے پڑھیں۔

میں سنہ ۱۸۹۳ء میں لکھنؤ آیا یہاں آکر میں نے عربی کی ابتدائی کتابیں حاجی مولانا امیر علی صاحب مترجم فتاویٰ عالمگیری کے اور ادب و فن عروض کی چند کتابیں مولوی حکیم سید عبدالحی صاحب ناظم ندوۃ العلماء سے پڑھیں۔ فارسی کی تکمیل خاص طور پر ملا علی محمد شیرازی سے کیں جو مٹیابرج کلکتہ سے برداشتہ خاطر ہو کر لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔

مجھے شعر و شاعری کا شوق ابتدا ہی سے تھا اور جس زمانہ میں لکھنؤ آیا ہوں اُسی زمانہ میں اُردو فارسی اشعار بے تکلف موزوں کر لیا کرتا تھا اور جب خواجہ عزیز الدین مرحوم لکھنوی کو میں نے اپنے چند فارسی اشعار سنا کر فارسی کلام پر اصلاح کی خواہش ظاہر کی تو عزیز مرحوم نے فرمایا کہ "میاں یہ تو بتاؤ تم نے فارسی کہاں اور کس سے پڑھی ہے"؟

میں نے ملا علی محمد شیرازی کا نام لیا۔ عزیز مرحوم، ملا علی محمد صاحب سے ناواقف نہ تھے بیحد خوش ہوئے، ارشاد ہوا کہ میں حاضر

ہوں شوق سے اپنی غزلیں مجھے دکھاؤ سناؤ، لیکن بھائی عاشقانہ کلام کا مزہ جوانی میں ہوتا ہے سو یہاں اب کہاں ؎

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو

میں نے گستاخانہ مگر مجوبانہ طور پر عرض کیا حضرت! تو پھر کوئی جوان ہو کر کیا کرے، خواجہ مسکرا کر خاموش ہو رہے۔ غرض جب تک خواجہ زندہ رہے میں الکبرٰان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور اپنا فارسی کلام اُنھیں کو دکھلاتا رہا میرے کلام کا زیادہ حصہ فارسی ہی میں ہے جس کا آج کوئی پرسان نہیں۔

قصیدہ و غزل خویش را پلا دامید
کہ یکسر از صلہ و داد بے نیاز آمد

سنہ ۱۸۹۸ء میں منشی سجاد حسین صاحب اڈیٹر اودھ پنچ سے ملا اور ایک عرصہ تک اودھ پنچ کی نامہ نگاری کرتا رہا منشی سجاد حسین مرحوم مجھ پر نہایت شفقت فرماتے تھے میں ایک حد تک مرحوم کا احسان مند ہوں اُردو زبان کے متعلق بہت کچھ میں نے اُن سے سیکھا ہے منشی جی پر پایان عمر میں فالج گرا جس کی وجہ سے وہ قریب قریب لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے تھے ہاتھ میں رعشہ تھا بات چیت بھی بہ تکلف کرتے تھے میں اس زمانہ میں ان کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا اور سنہ ۱۹۰۴ء سے سنہ ۱۹۱۱ء تک تو برابر بحیثیت آنریری سب ایڈیٹر کام کرتا رہا اور جبکہ میں سنہ ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ سے تبدیل ہو کر گونڈہ چلا گیا تو اودھ پنچ بند کر دیا گیا کتب خانہ پنجاب کے کسی شخص کے ہاتھ منشی جی کے ایماء سے فروخت کر ڈالا گیا اور چند دنوں بعد منشی جی بھی انتقال کر گئے۔

سنہ ۱۸۹۸ء سے سنہ ۱۹۱۱ء تک بہ سلسلۂ ملازمت میں لکھنؤ ہی رہا اس زمانہ قیام لکھنؤ میں چند لکھنوی احباب کے اصرار سے لکھنؤ کے شاعروں میں بھی شریک ہونے لگا۔ اور بفحوائے خاک از تودۂ کلاں بردار، اپنا اُردو کلام حکیم ضامن علی جلال مرحوم کو دکھلانے لگا۔ لیکن یہ اُستادی اور شاگردی کا سلسلہ باقاعدہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکا کیونکہ میں اپنی فارسی دانی اور افتاد طبیعت کی وجہ سے نئی نئی ترکیبیں استعمال کرنے کا خوگر اور ہمارے حضرت جلال وہی سیٹھی پھیکی سیدھی سادہ اُردو غزل گوئی کے دلدادہ تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن اسم با مسمّٰے جلال نے فرمایا:-

"حضرت! آپ وہی میرزا نوشہ کی طرح برابر جھاڑ جھنکاڑ میں چلے جا رہے ہیں مجھے آپ کا یہ اسلوب بیان پسند نہیں۔"

عرض کیا گیا اگر جناب میرے کلام میں کوئی فنی قباحت ملاحظہ فرمائیں تو اصلاح کریں، اُردو زبان کی اگر کچھ خامیاں نظر آئیں تو درست کر دیں صرفی نحوی غلطیوں پر متنبہ کریں اور اگر یہ کچھ نہیں ہے تو میں اپنے خیالات کی اصلاح آپ سے نہیں چاہتا۔

اس انداز بیان کو آپ سخت اور گستاخانہ کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کے معقول ہونے میں تو شاید آپ کو بھی کلام نہ ہو بہر حال جلال مرحوم یہ سنکر خاموش رہے۔ مگر دو ہی چار دن بعد نہایت شفقت سے فرمانے لگے کہ تم اب اپنا اُردو کلام بھی فارسی کی طرح مولانا رعب ہی کو دکھلا دیا کرو۔

مولانا محمد حنیف علی صاحب انصاری رعب مرحوم شاہ آبادی سے مجھسے کافی مراسم دوستانہ تھے اور خواجہ عزیز کی

پیرانہ سالی کی وجہ سے میں اپنا فارسی کلام انھیں کو دکھلایا اور سنایا کرتا تھا۔ مولانا رعب بھی ۱۸۵۸ء میں جلال مرحوم کے شاگرد ہو چکے تھے اور مجھسے نہ صرف اُستادانہ و شاگردانہ تعلقات تھے، بلکہ وہ میرے مخلص دوست بھی تھے اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان سے میں نے اکثر اپنی علمی و ادبی خامیوں کو پختہ کیا اور فن طب کی چند فارسی کتابیں مولانا سے پڑھیں۔ مولانا رعب کے انتقال کے بعد شعر و شاعری سے میرا دل اُچاٹ ہو گیا تھا اور پھر میں نے کبھی شوق سے مشاعروں میں شرکت نہیں کی - انتخاب یہ ہے :-

ابوالکمال امید امیٹھوی

تب فرقت کی بھی داد اسے خلیل بے نیازی دے — ترے بس میں ہے اب بھی آگ کو گلزار کر دینا،

اب تو ایسا بھی نہیں کوئی جو اُن سے پوچھے، — آپ نے کھو کے مجھے غیر کو پایا کیسا،

آپ سے روٹھ کے امید کہاں جائیں گے — بے بلائے ابھی آتے ہیں منانا کیسا،

مجبوریاں بھری ہیں مرے اختیار میں — اور اختیار کہتے ہیں ؟ کس اختیار کو،

کوئی ہم سے نہ ہم کسی سے خوش — کون ہو ایسی زندگی سے خوش،

یہ نہ پوچھو کہ اس زمانے میں، — کون ہے کس کی بندگی سے خوش،

کیا ہم اپنی خوشی سے ناخوش ہیں — تم ہو کیوں میری ناخوشی سے خوش

خوش نصیبی کا اس کی کیا کہنا، — تم ہو دنیا میں جس کسی سے خوش

وعدہ کل کا ہے لیکن اے امید — تم نظر آتے ہو ابھی سے خوش

اس بھولے پن کے صدقے اتنا نہیں سمجھتے — جیتا رہے گا کوئی کب روز امتحاں تک

امید رو دئے تو کیا لطف دل لگی کا،، — اتنا ہی گدگداؤ آئے ہنسی جہاں تک

روئی شبنم، گل ہنسا غنچہ کھلا میرے لئے — جس سے جو کچھ ہو سکا اس نے کیا میرے لئے

آدمی ہی ہوں، کبھی ایسا بھی کرتا ہے خیال، — حشر تک بیٹھی رہے گی کیا قضا میرے لئے

ہستی موہوم کا اف رے فریبِ اعتبار — گرچہ سب کچھ تھا مگر کچھ بھی نہ تھا میرے لئے

عام ہے یوں تو مری بربادیوں کا واقعہ — وہ بھی تو کہدیں کہ کوئی مر مٹا میرے لئے

ہنسنے والے رو دئے اور رونے والے ہنس پڑے — دل کے ہاتھوں جو نہ ہونا تھا ہوا میرے لئے

سیکڑوں قصے ہوس کے ہو گئے مقبول عام، — داستان اہل درد اب عرض کے قابل نہیں،

سینے نام دوستی کا حاصل ہے دشمنی، — تیری اُلفت تو وہ شے ہے جس کا کچھ حاصل نہیں

ہستی عاشق حجابِ جلوۂ معشوق ہے — یہ جو ٹوٹ جائے تو پردہ پھر کوئی حائل نہیں

حسن بے پروا دماغِ امتحاں رکھتا نہیں
فیصلہ عشق و ہوس کا ورنہ کچھ مشکل نہیں

اس نگاہ لطف ہی سے کیوں نہ چل کر پوچھئے
کون سی ہے وہ خطا جو عفو کے قابل نہیں

بہار بیخزاں ایسی ہے اور یہ رنگ مجبوری
گریباں ہی میں منھ ڈالے گریباں دیکھتا ہوں میں

یہ ظلم بے پناہ کہ سنتا ہوں میرے بعد
اب وہ ستم شعار ستمگر نہیں رہا

محبت میں ہر چند جی کا زیاں ہے
مگر میں یہ باتیں کہاں دیکھتا ہوں

یہی تیری جنت ہے؟ اے تیری قدرت
کہاں کی بہاریں کہاں دیکھتا ہوں

ارے! چشم بد دور، امید صاحب
یہ آج آپ کو میں کہاں دیکھتا ہوں

نام سُنکر خوشی کا اے امید
رنج ہوتا ہے اب خوشی کیسی

کوئی ہوش ہی میں نہ تھا ورنہ ساقی
جو کہنا نہ تھا کہہ گیا سر خوشی میں

فرط سجود غیر سے خستہ ہے جب وہ سنگ در
اپنی جبین شوق کو داغ کوئی لگائے کیوں،

دل کی کلی گلاب سے پہلے کھلے تو ہے مزہ
ورنہ بہار اور بھی آ کے ہمیں ستائے کیوں،

آپ ہی یہ بتائیے آپ کی بات بات پر
پہلے تھی واہ واہ کیوں اب ہو یہ ہائے ہائے کیوں

وفا و مہر و مروت، صداقت و انصاف،
خبر نہیں کہ یہ باتیں ہیں کس زمانے کی

وہ زود رنج ہے اور زود رنج بھی کیسا؟
جو روٹھ جائے تو جرأت نہ ہو منانے کی

خوشی تو اُن کی خوشی ہے کہ جس سے سب خوش ہیں
ہمارے دل کی خوشی کیا ہوئی ہوئی نہ ہوئی

یہ اور بات ہے رنجیدہ ہو گئے امید
تری طرف سے تو خاطر میں کچھ کمی نہ ہوئی

کل تک جو پوچھتا تو اک بات بھی تھی ظالم
اب کس کو پوچھتا ہے امید اب کہاں ہے

وہ آخر رو دئے کیوں؟ میں نے تو اتنا ہی پوچھا تھا
کبھی امید کو ہنستے ہوئے بھی تم نے دیکھا ہے

ارے سود و زیاں دیکھا نہیں جاتا محبت میں
یہ سودا اور سودا ہے یہ دنیا اور دنیا ہے،

عجیب بات ہے امید دل کی باتوں کا
نہ اعتبار انھیں ہے نہ اعتبار مجھے

کل تک تو ان کے وعدۂ فردا کا عذر تھا
اب آج کیا اجل سے بہانہ کریں گے ہم

سمجھے نہ تھے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا
ہنسنے پر اپنے آپ ہی رو یا کریں گے ہم

پھینک دیئیں ہم کہاں دل خانہ خراب کو
تم نے تو کہدیا کہ اسے کیا کریں گے ہم

یہ لطف ذوق اسیری نہیں کہ اے صیاد
قفس میں آگ لگا دیں ہم آشیاں کے لئے

زندگی ہے اپنے قبضے میں نہ اپنے بس میں موت
آدمی مجبور ہے اور کس قدر مجبور ہے

گنہ سے ہوں خجل لیکن کبھی تیری طرح زاہد
خدا بن کر نہیں کی ہے خدا کی بندگی میں نے

ناز ہے یہ کہ محبت میں بڑا صبر کیا،
پوچھئے صبر نہ کرتے تو بھلا کرتے کیا

دل کی اُلجھن نہ پوچھئے امید
ہم نہ خلوت کے ہیں نہ محفل کے

خدا کے ہاتھ ہے شرم ان کی لن ترانی کی
عجیب شان مرے عرض مدعا کی ہے

افسانے میں بھی رحمت حق کے سنا کیا،
اک گوشے میں الگ مے و ساغر لئے ہوئے

دل کا بھیدی جان کے تم کو دل کا حال بتاتے ہیں
ہم کو موہ لیا ہے امید ایک فرید آبادی نے [1]

آپ کل گزرے ہیں جس راہگزر سے پہلے
وہیں بیٹھا ہے کوئی جا کے سحر سے پہلے

جب سے دیوانے ترے آئے ہیں اسوقت کی پوچھ
کیا کبھی تھی کوئی دیوار بھی در سے پہلے

ہم نہ کہتے تھے، محبت کا بُرا ہے سودا
دیکھ لینا تھا تمھیں اپنی نظر سے پہلے

پھر انتظار کی لذت نصیب ہو کہ نہ ہو
خدا کرے کوئی خط کا جواب رہنے دے

تصورات کی دُنیا ہے اپنے مطلب کی
کچھ اور دن ابھی رُخ پر نقاب رہنے دے

تمھیں کہو غمِ فردا کا ہوش ہے کس کو،
جو کل کے واسطے تھوڑی شراب رہنے دے

خیال اور کسی کا اگر نہیں نہ سہی
تجھے تو چین سے تیرا شباب رہنے دے

جواب ریختۂ انورؔ بھی نہ لکھ امید،
یہ لا جواب غزل بے جواب رہنے دے

چار دن کی تھی زندگی لیکن
یہ بھی ان کی خوشی نہیں نہ سہی

کہنے کے لئے خضر و مسیحا کی بھی سُن لو
لیکن غمِ ہستی کی دوا اور ہی کچھ ہے

ہر ہوس ناک کو سودا ہو نظر بازی کا
آپ کا جلوہ اب ایسا بھی نہ ارزاں ہو جائے

کچھ نہیں اس کے سوا جلوہ گہِ یار کا راز
کوئی حیراں کرے اور کوئی حیراں ہو جائے

جو دیکھیں تو تڑپیں نہ دیکھیں تو ترسیں
یہ صورت ہے دیکھیں جو صورت کسی کی

ہے یہاں کام کی ہر شے مگر اک چیز ہے دل
جس کی حاجت ہے نہ ان کو نہ ضرورت مجھ کو

کیا کہوں اے طالب صبر و سکوں
دل کی بیتابی میں ہے آرام کیا

جو بس ہو تو خود کو بھی خود سے چھپائیں
ہیں ایسے بھی شرم و حیا کرنے والے

برہمن کفر میں پورا نہ شیخ اسلام میں کامل،
کرشمہ ہے یہ سب تیرے حجاب نیم حایل کا

ملامت کر نہ اے ذوقِ طلب گر چھٹ گئی منزل
خیال قطع منزل میں کسے تھا دھیان منزل کا

[1] محبی و محسنی جناب سید اسد علی صاحب انورؔ فرید آبادی ۔ امید

کچھ اب کے عجب حسرت دیدار ہے ورنہ
کیا گل نہیں دیکھے کہ گلستاں نہیں دیکھا

ٹوٹا تو طلسم امید ان سے شرمگیں آنکھوں کا
آپ اپنے ہی کو دیکھا ظالم نے مگر دیکھا

ہنستے ہیں یونہی خوبیِ تقدیر پر اپنی
تو اور کچھ اے رہبرِ کامل نہ سمجھنا

پھر دل مجھے خود ہی کبھی رونا کبھی ہنسنا
دل کو کبھی دل اور کبھی دل نہ سمجھنا

طور ہو یا کلیم ہوں مجھ کو تو ہے یہ دیکھنا
عشق و ہوس کا فیصلہ تیری نظر نے کیا کیا

پہلے تو مجھ کو غم یہ تھا آہ میں کچھ اثر نہیں،
اب تو مجھے یہ رنج ہے ہائے اثر نے کیا کیا

کھو گیا میں خود تلاش یار میں انجام کار
سعیِ بے حاصل سے آخر کچھ تو حاصل ہو گیا

بے نیاز آگہی ہے ماجرائے حسن و عشق،
کیا خبر کس کی ادا پر کون مایل ہو گیا،

ہم لئے پھرتے ہیں آنکھوں میں چمن اے باغباں
جس طرف اُٹھی نگاہ شوق گلشن ہو گیا

ظلمت ہستی عاشق ہے حجاب معشوق
عید نظارہ ہے اس شب کا سحر ہو جانا

حباب و موج کو بھی دیکھکر آنکھیں نہیں کھُلتیں
غضب کی نیند میں ڈوبا ہوا ہے ناخدا میرا

خبر کیا اس محیط آوارہ کو ڈوبے ہوئے دل کی
جو قطرہ جذب ہو کر رہ گیا دامان ساحل میں

دیکھتے تھے سب اُسے وہ دیکھتا تھا آپ کو
کل اک ایسا بھی تماشا یار کی محفل میں تھا،

قیس کے حسن تصور کی کرے تصدیق کون
ورنہ اب محمل میں کوئی ہے نہ جب محمل میں تھا

کچھ درد محبت کا اس کو بھی دیا ہوگا
کیا اے مرے رب تو نے ایسا بھی کیا ہوگا

کہاں کا حشر، کس کی داد، اک خواب پریشاں تھا
کھلی جب آنکھ تو اپنا ہی ہاتھ اپنا گریباں تھا

مجھے میرے تصور نے بڑا دھوکا دیا ورنہ
کسی کا میزباں تھا میں نہ کوئی میرا مہماں تھا

گلوں سے بھی شکایت بلبلوں کو ہو گئی پیدا
خدا معلوم کل امید کا رنگِ فغاں کیا تھا

کل تک جن کے نالوں سے تھا شکوہ نیند اُچٹنے کا
آج کسی نے ان کو نہ پوچھا کہاں پہ کیسے سوتے ہیں

خدا معلوم کیا وعدہ ہے اس جانِ تغافل سے
کہ اب جینا بڑی مشکل ہے مر جانا تو آساں تھا

امید خیر سے کہئے تو اس بے خبر سے آپ
آئینہ اپنا دیکھئے میری نظر سے آپ

اللہ رے فریب تمنا کہ بارہا،
اپنے ہی خط کو لیکے پڑھا نامہ بر سے آپ

کیا سے کیا ہو گئے ہم دیکھتے ہی دیکھتے آج،
اب وہ پہلی سی طبیعت ہے نہ پہلا سا مزاج

جس طرح گزری ہے کل آج بھی کٹ جائے گی
اور جو آرام کی پوچھو تو نہ کل ہی تھا نہ آج،

کون کس سے چھپائے کس کا راز
ذرہ ذرہ یہاں کا ہے غماز

خاک سے خاک مل گئی امید
اب حقیقت اسے کہیں کہ مجاز

کنجِ قفس میں کیا کہیں کس گل کی تھی نمود
اکبار گی جو ٹوٹ پڑے آشیاں سے ہم

امید، پاسِ چشمِ مروت کا ہو برا،
دل لیگئے وہ کہہ نہ سکے کچھ زباں سے ہم

پرستش کے ہے قابل ذرہ ذرہ میری ہستی کا
مگر یہ بات کہنے کی نہیں شیخ و برہمن میں

زہے یادِ غمِ ایام کی کلفت فراموشی
قفس میں مطمئن یوں ہوں کہ جیسے ہوں نشیمن میں

بتائیں کیوں نکلوائے گئے امید کعبہ سے
وہاں بھی کوئی شے پوشیدہ تھی حضرت کے دامن میں

مرہونِ التفاتِ مسیحا نہیں ہوں میں
آخر برا ہی کیا ہے جو اچھا نہیں ہوں میں

میری طرح بھی محوِ تماشا نہ ہو کوئی
یوں ہوں کسی کی بزم میں گویا نہیں ہوں میں

تو اس دروغِ مصلحت آمیز پر نہ جا
قطرہ کہے ہزار کہ دریا نہیں ہوں میں

وہ اک اک سانس میں سو سو امید و بیم کی دنیا
نہ بھولے گی ترے بیمارِ غم کی داستاں برسوں

نہ ہو گر سادگیِ اعتبار یاس کا رونا
عجب اک لطف ہے ظالم کے جورِ بے نہایت میں

بگڑ بیٹھے اگر امید اس جانِ تمنا سے
تعجب کیا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے محبت میں

جلوہ باعتبارِ تماشا تھا اسے بکلیم،
ورنہ ابھی وہ شمعِ حقیقت بجھی نہیں

غیر کا سر اور ترا خنجر کہاں
اعتبار دیدۂ جوہر کہاں،

حساب کیا کرمِ بے حساب کا تیرے
ہماری حسرتِ دل کا اگر شمار نہیں،

بس اب نہ پوچھئے جوشِ نشاط وعدۂ یار
یہ بیخودی ہے کہ تکلیفِ انتظار نہیں

کہیں وہ شوخ نہ سنتا ہو چپ رہو امید
جفا شعار تو ہے، گو وفا شعار نہیں

تم کو تو بیمار کا دل توڑنا لازم نہ تھا،
گو یہ ظاہر ہے کہ امید شفا باقی نہیں

مجھ کو غیروں سے شکایت ہے نہ اپنوں کا گلہ
دل کا دشمن اب کوئی دل کے سوا باقی نہیں

چھوڑیئے شعر و شاعری امید
حال دل کا اگر چھپانا ہے

اُدھر ان کو اُبھارا ان کے حسنِ جلوہ مائل نے
اِدھر تابِ نظر سے جھوٹے وعدے پھر لئے دل نے

اُدھر اک برقِ حاصل سوز گرمِ سعیِ بے حاصل
اِدھر محرومِ حاصل کر دیا تحصیلِ حاصل نے

ہوائے شوق ہاتھوں ہاتھ اڑا لائی سبھی ورنہ
بہت بوئے تھے کانٹے رہبرِ بیگانۂ منزل نے

نہ صاف اقرار کا پہلو نہ صاف انکار کی صورت
بڑے دھوکے دئے تیرے حجابِ نیم حائل نے

مبادا پھر زباں کھلتی لبِ کاوشِ تقاضا کی،
کلیجے سے لگا رکھا ہے دل کی پھانس کو دل نے

بیخود دہلوی

نام سید وحید الدین، تخلص بیخود۔ ولادت ۳۰ رمضان ۱۲۷۹ھ کو بمقام بھرت پور ہوئی، لیکن ان کے والد سید شمس الدین عرف سید احمد سالم انھیں اپنے ساتھ دہلی لے آئے۔

آپ کو ابتدا سے شاعری کا شوق تھا اس لئے آپ مولانا حالی کی تحریک سے داغ کے شاگرد ہوگئے۔ آپ کے دو دیوان گفتار بیخود اور شہوار بیخود طبع ہو چکے ہیں۔

فرق کچھ عالم ایجاد سے پہلے تو نہ تھا — ایک ہی رنگ تھا اُسوقت تو میرا تیرا

گستاخ و بے ادب کی نظر سے نہاں ہیں آپ — اتنا تو چشم غیر سے پردہ ضرور تھا

ہجر میں موت نے آکر مجھے صحت بخشی — کرلیا دردِ جدائی نے مسیحا پیدا

وہی ہم ہیں وہی راتیں وہی ہے جستجو تیری — وہی آنکھوں کی حالت ہے اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا

دردِ دل جس کا صلہ ہے وہ دعا تو یہ تھی، — آدمی مجھکو بنانا مجھے انساں کرنا

سوگواروں میں مرے حسن ادا بھی ہو شریک — آئینہ دیکھ کے زلفوں کو پریشاں کرنا

کافر عشق ہے کمبخت خرابی یہ ہے — ہو سکے تم سے تو بیخود کو مسلماں کرنا

شمع مزار تھی نہ کوئی سوگوار تھا — تم جسپہ رو رہے تھے یہ کس کا مزار تھا

تڑپوں گا عمر بھر دل مرحوم کے لئے — کمبخت نامراد لڑکپن کا یار تھا

سودائے عشق اور ہے وحشت کچھ اور شے — مجنوں کا کوئی دوست فسانہ نگار تھا

جادو ہے یا طلسم تمھاری زبان میں — تم جھوٹ کہہ رہے تھے مجھے اعتبار تھا

کیا کیا ہمارے سجدہ کی رسوائیاں ہوئیں — نقش قدم کسی کا سر رہگزار تھا

اسوقت تک تو وضع میں آیا نہیں ہے فرق — تیرا کرم شریک جو پروردگار تھا

سمجھ سکتا جسے کوئی نہ تھا وہ مدعا میرا — مری بیتابیوں نے راز افشا یہ کیا میرا

اے نالۂ دل سننا۔ تھم تھم کے اثر کرنا
نازک ہے بہت کوئی اس پر بھی نظر کرنا

جواب سوچ کے دل میں وہ مُسکراتے ہیں
ابھی زبان پہ میری سوال بھی تو نہ تھا

سہے ہیں ظلم مگر یہ ستم نہیں دیکھا
جفا کے بعد تجھے انفعال بھی تو نہ تھا

آپ کے نیرنگِ قدرت کا تماشائی ہوں میں
یہ بھی کہہ سکتا نہیں یہ کیوں ہوا یہ کیا ہوا

باغِ عالم کے تماشائی مجھے بھی دیکھ لیں،
میں بھی اس گلشن کا ہوں اک پھول کملایا ہوا

یا تو ہے دیکھنے میں نظر کا مری قصور
یا کچھ بدل گیا ہے زمانے کا حال اب

پھر بے وفا سے عہدِ وفا لے رہے ہیں ہم
بے اعتباریوں کا نہیں اعتبار آج

ہم اسے دیکھا کئے جب تک ہمیں غفلت رہی
پڑ گیا آنکھوں پہ پردہ ہوش آجانے کے بعد

میں حقیقت آشنا ہوں ہستی موہوم کا
دیکھتا ہوں غور سے پھولوں کو مرجھانے کے بعد

راہ میں بیٹھا ہوں میں تم سنگِ رہ سمجھو مجھے
آدمی بن جاؤں گا کچھ ٹھوکریں کھانے کے بعد

بزمِ دشمن میں بنا بیٹھا تھا میں تصویرِ غم
چھیڑ کر مجھکو کسی نے چھیڑ دی تفسیرِ غم

کافرِ عشق سے خالی نہ رہے گی دُنیا
کوئی ہو جائے گا اللہ کا بندا پیدا

ہوگیا درِ طلب سے یہ زمانہ خالی،
سو میں دس بھی نہیں ہوتے ترے جویا پیدا

چوٹ کھا کر ہی تو انسان بنا کرتا ہے،
دل تھا بیکار اگر درد نہ ہوتا پیدا

اللہ رے بیقدریِ اربابِ زمانہ،
یوسف اُسے سمجھیں گے جو زنداں میں رہیگا

اقرار سے لیتی ہے مرے دل میں جو چٹکی
اک طعن کا انداز بھی "جی ہاں" میں رہیگا

ہر اک گل کے لئے لازم ہے بو کیا
نہیں ہوتا دل بے آرزو کیا

زباں پر راز کی باتیں ہیں بیخود
کہیں سے آج پی آیا ہے تو کیا

تم سے کھلنے نہیں دیتا دلِ بدظن میرا
میرے پہلو میں چھپا بیٹھا ہے دشمن میرا

چاک کے ساتھ ہے گریہ کا اثر بھی موجود
باغ میں چھین لیا پھول نے دامن میرا

جب تک تھا دل میں آپ کے اقرارِ وصل تھا
جب آگیا زبان پہ انکار ہوگیا،

کھولنے میں کوئی ٹوٹا جو ترا بندِ نقاب
وہ گلا گھوٹنے کو میرے گریباں میں رہا

امیدِ وصل میں کاٹے ہیں دن جدائی کے
خزاں کا رنگ نظر میں بہار ہو کے رہا،

چھپ کر رہے دل میں مرے کانوں سے سنو تم
کہتا ہے زمانہ سرِ بازار تمھیں کیا

وہی ہے بیخودِ ناکام تم سمجھ لینا،
شرابخانے سے جو ہوشیار آئے گا

آپ ہی لے کے تو اشارہ سے ہر اک کام ہوا چھپ گئے آپ تو، میں مفت میں بدنام ہوا
کہیں تنہا بھی نہ تھا، رات اندھیری بھی نہ تھی قتل میں تو سرِ بازار سرِ شام ہوا
خوفِ رسوائی سے آیا جو لحد تک خاموش لوگ سمجھے ترے بیمار کو آرام ہوا
بادۂ عشق کا یہ خاص اثر ہے بیخودؔ، سل گئے ہونٹ جہاں لب سے جدا جام ہوا

مشرق کی سمت کیوں شب وعدہ ہے روشنی نکلے گا آج رات کو بھی آفتاب کیا،
دم بھر کے بعد تم مجھے پہچانتے نہیں، اب اس سے بڑھکر اور مٹے گا شباب کیا
بیٹھے ہوئے ہیں سامنے صورت تو دیکھئے بیخودؔ ہیں نام کے یہ پئیں گے شراب کیا

بہت دشوار تھا میدان ہستی سے گزر جانا بہت مشکل سے سیکھا عمر بھر میں ہم نے مرجانا

زخم دل ہوں مسکرانا بھی مرا رونا ہوا میرا ہنسنا تو نہیں معلوم کیا ہو جائے گا
پہلے ہی زخمی نہ کر لوں دل کو نوکِ تیر سے کیا کروں گا تیر جب ان کا خطا ہو جائے گا

شرم عصیاں بھی مرے ساتھ ہو مظلومی بھی داورِ حشر، مرا حشر جدا ہونا تھا
آپ کی یاد نے سب کام بنائے میرے عشق سے کچھ نہ ہوا عشق سے کیا ہونا تھا

دل صاف اگر ہوتا پردے کا گلہ ہوتا میں آئینہ بن جاتا وہ جلوہ نما ہوتا
کیوں دل کے تقاضے پر بیوقت دعا مانگی کچھ جبر کیا ہوتا کچھ صبر کیا ہوتا
مے تلخ نہ تھی اتنی تلخی تھی جدائی کی وہ ساتھ اگر پیتے کچھ اور مزا ہوتا
بیخودؔ نے محبت کو بدنام کیا آخر، یہ جام جو پینا تھا، ہونٹوں کو سیا ہوتا

تمھارے بعد سنا ہے مری اجل آئی تمھارے ساتھ سنا تھا مرا شباب گیا
گنتی مصیبتوں کی شب غم نہ پوچھئے ایسا ہجوم تھا کہ مرا دم اُلٹ گیا
دامن کسی کا کھینچ رہا تھا خیال میں اب دیکھتا ہوں میرا گریبان پھٹ گیا

پیامِ عشق بھیجا تھا اُدھر سے یہ جواب آیا بلایا کس نے اس کو کیوں دلِ خانہ خراب آیا
مجھے کس طرح باور ہو کہ وہ تشریف لاتے ہیں کلیجہ میں نہ ٹیس اُٹھی نہ دل میں اضطراب آیا
چراغِ طور روشن ہو گیا حُسنِ جوانی سے صدائے لن ترانی آئی جب اُن کا شباب آیا
تمھاری ایک محفل، اس میں یہ دو رنگ کیسے ہیں کہیں آنکھوں میں اشک آئے کہیں جامِ شراب آیا
نہ تھا پھر مدعی دیدار کا کوئی وہی وہ تھے غرورِ حسن جب بڑھکر اُلٹنے کو نقاب آیا
بھری محفل میں حُسن و عشق کا باہم اثر دیکھا کبھی اُس نے اِدھر دیکھا کبھی ہم نے اُدھر دیکھا

ترے دیدار سے بڑھکر نہیں کوئی خوشی ہم کو ہلال عید بھی ہم نے ترا منہ دیکھ کر دیکھا
محبت دل میں لائے تھے محبت سے غرض رکھی غرض یہ ہے یہی اک خواب ہم نے عمر بھر دیکھا

خواب میں بیخود وہ آئے مسکرا کر کہہ گئے جاگ کر سو جائے پھر تقدیر یہ ممکن نہیں

جفائیں تم کئے جاؤ، وفائیں میں کئے جاؤں تم اپنے فن میں کامل ہو میں اپنے فن میں یکتا ہوں
اجل نے منہ پہ منہ رکھکر دم آخر کہا مجھ سے ادھر تو دیکھ، آنکھیں کھول میں تیری تمنا ہوں

ہمیں ہم ہیں تو یہ آنکھوں پہ کیسا پڑ گیا پردہ تمھیں تم ہو تو کیوں پوشیدہ صورت ہم سے کرتے ہو
شکایت پر ستم کی اُس ستمگر نے کہا مجھ سے اسی منہ پر اسی دل سے محبت ہم سے کرتے ہو
نافل ہے وہ مجھ سے مجھے کس طرح یقیں ہو آنکھوں میں پھرا کرتا ہے ہر وقت کہیں ہو
جب عرش پہ رہتے تھے تو اب دل کے مکیں ہو پہچان لیا میں نے تمھیں تھے وہ تمھیں ہو
موسیٰ کی طرح اور بھی ہیں طالب دید جب جلوہ نما طور پہ تھے اب بھی کہیں ہو

غصہ میں بھی جھکتے ہوئے دیکھا جو نظر کو مرہم کی ضرورت نہ رہی زخم جگر کو
کیا آگ لگائے کوئی نالے کے اثر کو پہلو میں وہ بیٹھے ہیں جھکائے ہوئے سر کو
میں چشم عنایت کا بھروسہ نہ کروں گا سو رنگ بدلتے ہوئے دیکھا ہے نظر کو
میں پوچھ تو سکتا نہیں رستہ ترے گھر کا حیرت سے تکا کرتا ہوں ہر راہ گزر کو

موت رخصت ہوئی وہ صبح کا تارا چمکا اب سنبھلنے دے ذرا اے شب ہجراں مجھکو
رونق گلشن و گل تھی مرے دم سے صیاد پھوٹ کر روئے نہ کیوں ابر بہاراں مجھکو
رات بھر شمع کی مانند جلایا شب وصل رات بھر کا وہ سمجھتے رہے مہماں مجھکو

غیر کے نام کی تاثیر تھی یا شوخی تھی فکر تو یہ ہے تڑپتے ہوئے دیکھا تم کو
شعلۂ حسن نے جمنے ہی نہ دی رخ پہ نظر دیکھ کر بھی نہیں دیکھا ابھی گویا تم کو
جان بھی نذر حاضر تھی، اجل نے دیر کی آپ سمجھے بیٹھے ٹالا آپ کے ارشاد کو
وہ تو کیا اس کو بناتا، رنگ بھرتا، کھینچتا یاں تری تصویر نے چمکا دیا بہزاد کو

نیاز عشق و ناز حسن کی تصویر کھنچتی ہے ہمارے ہاتھ پر دل ہو تمھارا ہاتھ دل پر ہو

ملا ہو گا نہ مجھ سا قدرداں درد محبت کو نکل جاتا ہے دم میرا اگر تسکین دم بھر ہو

دل بخت امتیار رہو ہجر میں رُلوانے کو کیا سنبھالا ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کو
ہاتھ ہے ذبح کرو، اُٹھ نہیں سکتی جو چھری ہم تو بے موت بھی موجود ہیں مر جانے کو

چونک اُٹھتا ہوں کہ دُنیا سے سفر کرنا ہے کوئی تیار جو ہوتا ہے کہیں جانے کو
گئی میدان تو ایسے ہیں کہ تڑپا دیں گے ختم تک کون سنے گا مرے افسانے کو

دل ہو پہلو میں تو ہو دل میں محبّت کیوں ہو آدمی کے لئے دُنیا میں قیامت کیوں ہو
ہم نے بیخود تجھے ہنستے ہوئے دیکھا نہ کبھی زندگی خواب سہی صرف متانت کیوں ہو

آنکھوں سے رواں اے دلِ یوں اشک، تمنا ہو رک جائے تو موتی ہو بہ نکلے تو دریا ہو
جھگڑا یہ مٹے کیونکر دل ہو گیا جب خود سر میں کہتا ہوں میرا تھا، تم کہتے ہو میرا ہو

تمھیں غرض جو دلِ داغدار کو دیکھو تم اپنے حسن کو اپنی بہار کو دیکھو
اسی پہ کہتے تھے قایل نہ ہم کبھی ہونگے یہ کیا ہوا نگہ شرمسار کو دیکھو

مجھکو مٹا رہے ہو کہ میری وفا کو تم، اب میں وفا سے پہلے مٹوں یا وفا کے ساتھ
بلبل کہیں قفس میں بنائے گی آشیاں، تنکے چمن سے اُڑ کے چلے ہیں صبا کے ساتھ.

وحشت نے باریاب کیا، کیا کہوں، کہاں دیوانگی کو عشق کو دولت عطا ہوئی،
جب آہ کھینچتا ہوں دلِ داغدار سے آتی ہے یہ صدا کہ نسیم بہار ہوں

تم آنکھ مجھ سے پھیر لو، مٹ جاؤں گا ابھی کیوں پائمال گردش لیل و نہار ہوں؛
پہلے تو منہ ہی منہ میں خدا جانے کیا کہا: اب مجھ پہ یہ عتاب ہے تو نے سنا نہیں

خلوت سمجھ رہا ہوں تری بزم ناز کو میں کیا کروں کہ غیر مجھے سوجھتا نہیں
سہے ہیں ظلم اتنے بن گیا ہوں درد کا پُتلا جو توڑا پھول گلشن میں تو کانٹا چُبھ گیا دل میں

دُعائے با اثر پیدا کروں گا توڑ کر دل کو دوائے درد دل مل جائے گی ٹوٹے ہوئے دل میں
دم آخر نہیں ارمان میری زندگی کے ہیں وہ اب سمجھے کہ یہ سارے تعلق جیتے جی کے ہیں

جدائی میں بھی پیمانِ ازل بھولے نہیں اب تک وہاں بھی آپ ہی کے تھے یہاں بھی آپ ہی کے ہیں
منہ پھیر کے بیٹھو ابھی غصّہ ہے نظر میں اب تیر سے پڑ جائے گا ناسور جگر میں

طے راہِ فنا کرتا ہوں میں شمع کی مانند اک پاؤں مرا گھر میں ہے اک پاؤں سفر میں.
ہو نہ رونے میں اثر اے بیکسی تو کیا کریں یہ تو ہو سکتا ہے ہر آنسو کو ہم دریا کریں

یوں وفق اُلٹے زمانے کا تو کیسی سیر ہو روز تم ہم کو مناؤ، روز ہم روٹھا کریں
ہم نے یہ مانا نہیں دشوار کچھ ترک وفا گفتگو تو صرف اس میں ہے کہ ہم ایسا کریں

کچھ ایسی بات مجھ سے منہ بنا کر گل نے کہدی ہے مزا آتا نہیں بلبل کی اب نغمہ سرائی میں

قیامت میں اجل کب آئے گی دیدار تو ہو گا
تمنا تھی ہمیں ہم جان دیتے رونمائی میں،

میرے سب کام ہیں جب تیری خوشی پر موقوف
تیری ہر بات کو کیوں اپنا مقدر نہ کہوں

ہم کو رسوائی کا شکوہ ہے تو اپنے دل سے ہے
آپ نے جو کچھ کیا اس کا گلہ کچھ بھی نہیں

درِ مسجد ہی پہ میخانہ ہے بیخود افسوس
مجھ کو بدنام مرے نقش قدم کرتے ہیں

نکالوں پاؤں سے کانٹے مگر جب ہاتھ خالی ہو،
ابھی کچھ تار باقی رہ گئے ہیں جیب و داماں میں

خزاں میں کون پی کر آنسوؤں سے خون کے رہئے
مزے وہ رنگ و بو کے چھوڑ آئے ہم گلستاں میں

وہ بیوفا کہے مجھے، جس سے وفا کروں
میں بدنصیب اپنے مقدر کو کیا کروں

چبھے کسی کے نہ دل میں الٰہی یہ کانٹا
ہزار طرح کی تکلیف ہے محبت میں

وصال و ہجر کو ہم ایک ہی سمجھتے ہیں
کسے خبر ہے کہ کیا ہے ہماری قسمت میں

کیا محبت بھی گئی بیخود کے ساتھ
اب کہیں اس بات کے چرچے نہیں

بہارِ گل کو کب وہ سیر کے قابل سمجھتے ہیں،
ہر اک ٹوٹے ہوئے غنچے کو میرا دل سمجھتے ہیں

ہمارا قتل کیا دشوار تھا باتوں سے مر جاتے
مگر مشکل تو یہ ہے وہ اسے مشکل سمجھتے ہیں

وہی ہم وہی دل وہی دل کی حسرت
قیامت میں بچھڑے ہوئے مل گئے ہیں

قلق ہے رنج ہے غم ہے الم ہے داغِ فرقت ہے
محبت میں یہ سب سامان میری بیکسی کے ہیں،

سبھے رونا وفا کا ہے مجھے رونا محبت کا
مرے رونے پہ ہنستے ہو محل یہ کب ہنسی کے ہیں

وہ سن کر حور کی تعریف پردے سے نکل آئے
کہا پھر مسکرا کر حسنِ زیبا اس کو کہتے ہیں

اجل کا نام دشمن دوسرے معنی میں لیتا ہے
تمہارے چاہنے والے تمنا اس کو کہتے ہیں

مرے مدفن پہ کیوں روتے ہو عاشق مر نہیں سکتا
یہ مر جانا نہیں ہے صبر آنا اس کو کہتے ہیں

نمک بھر کر مرے زخموں میں تم کیا مسکراتے ہو
مرے زخموں کو دیکھو مسکرانا اس کو کہتے ہیں

زمانے سے عداوت کا سبب تھی دوستی جن کی
اب ان کو دشمنی ہے ہم سے دنیا اس کو کہتے ہیں

دکھاتے ہم نہ آئینہ تو یہ کیونکر نظر آتا
بشر حوروں سے اچھا تم نے دیکھا اسکو کہتے ہیں

بلاؤ بزم میں غیروں کو تم اس کی ضرورت کیا
جہاں تم ہو جہاں ہم ہوں وہاں سارا جہاں بھی ہو

جان دینے نہیں دیتے مرے ارماں مجھکو
زندہ در گور سمجھ اے شبِ ہجراں مجھ کو

ناامیدی نے کیا ہے یہ پریشاں مجھکو
اب تو ہے اُن کی تمنا کا بھی ارماں مجھ کو

غیر کی بزم سے آئے تھے عیادت کے لئے
یاد ہے، یاد ہے وہ آپ کا احساں مجھ کو

تاجور نجیب آبادی

میں نسباً درانی افغان ہوں، اپنے وطن نجیب آباد میں فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم میں نے اپنے برادر معظم سے حاصل کی۔ ماہ صفر سنہ ۱۳۲۶ھ میں دس سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند کا طالب علم بنا۔ دس سال وہاں رہ کر درس نظامیہ کی تکمیل کر کے اگست سنہ ۱۹۱۴ء میں لاہور آیا۔ اور حسب ایما حضرت شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی، اورینٹل کالج میں داخل ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی سے سنہ ۱۹۱۵ء میں مولوی فاضل اور سنہ ۱۹۱۶ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ سنہ ۱۹۱۶ء ہی میں رسالہ مخزن کا اڈیٹر بنا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں دیال سنگھ کالج لاہور میں فارسی اور اُردو کے اُستاد کی حیثیت میں میرا تقرر ہوا۔ اسی سال رسالہ ہمایوں لاہور میں معاون مدیر بنایا گیا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں رسالہ ادبی دنیا اور سنہ ۱۹۳۲ء میں رسالہ شاہکار جاری کیا۔ ادبی دنیا میری انتظامی ناقابلیت اور زود اعتمادی کے سبب میرے ہاتھ سے منتقل ہو کر دوسرے ہاتھوں میں پہونچ گیا اور شاہکار ابتک میری نگرانی میں جاری ہے۔ میں نے سارا عہد طالب علمی امتیازی شہرت میں بسر کیا تھا۔ مگر غالباً کسی گناہ کبیرہ کی پاداش کے طور پر قدرت نے مجھے اُردو کے جنون خدمت میں مبتلا کر دیا۔ اُردو زبان و ادب کی راہ میں اپنا ذاتی سرمایہ تیس ہزار روپیہ کاروباری آمدنی کا، اپنی جوانی صحت و طاقت اور متعلقین کا حال و مستقبل سب کچھ نثار کر دیا

اُردو مرکز کے نام سے سنہ ۱۹۲۶ء میں ایک ادارہ تصنیف و تالیف قایم کیا تھا۔ جو اب تک قائم ہے میرے ہندوستان گیر شہرت رکھنے والے شاگردوں کی ایک جماعت اُردو اصنافِ ادب کے ہر شعبے میں رہنمایانہ خدمت انجام دے رہی ہے یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جدید دور ادب کی تعمیر کرنے والوں میں ۸۰ فیصدی میرے شاگرد ہیں۔ اُردو میری تفریح تھی لیکن شامتِ اعمال سے یہ تفریح عذاب زندگی بن گئی۔ چونکہ میرا مجموعۂ کلام ابھی تک شایع نہ ہو سکا۔ اس لئے جدید دور کے نام نہاد نقادوں کے دائرۂ تعارف سے آج تک خارج ہوں، متعدد اصنافِ ادب میں بیسیوں شاگردوں کو آسمانِ شہرت پر پہونچا دیا۔ لیکن ماہناموں کے صفحات سے اُردو نثر کی تاریخ مرتب کرنے والے اُن تابناک ستاروں کے مبدأ نور سے بےخبر بن رہے ہیں۔ اِدھر جس ادبی فضا میں زندگی کے ۲۵ سال بسر کر چکا ہوں، وہ میرے لئے اس وجہ سے ناسازگار چلی آتی ہے کہ میں دریائے ستلج کے اُس پار کیوں پیدا ہوا۔

اوائل مشق کا کلام تو اگر گم نہ ہوتا تو میں اُسے خود گم کر دیتا۔ البتہ اواسطِ مشق کے ایک مجموعے کے گم ہونے کا افسوس ہے۔ غالباً کسی شاگرد کی سعادتمندی اس سرقے کی مرتکب ہوئی۔ اِس مجموعے کے گم ہو جانے سے میری ہمت شکست ہو گئی اور پھر کبھی میں نے اپنے کلام کی فراہمی کی جانب توجہ نہیں کی۔

میرا کلام وقتاً فوقتاً پنجاب کے اخبارات اور ماہناموں میں شایع ہوتا رہا ہے۔ میرے پاس اس کی کوئی نقل بھی نہیں نہ یہ یاد کہ کس پرچے میں کب شایع ہوا۔ حافظہ بھی اب کمزور ہو چکا ہے۔ تاہم مدیر محترم نگار کے امتثال امر کے لئے چند اشعار منتخب کرکے پیش کر رہا ہوں:

تاجور

اب عشق سے لو لگائیں گے ہم
اس درد کو دل بنائیں گے ہم
اب آپ بنیں گے اپنی دُنیا
دُنیا تجھے بھول جائیں گے ہم

غم کی تنہائی میں جب وہ خوابِ حسیں یاد آتا ہے
یوں ہی بیٹھے بیٹھے دل کو جانے کیا ہو جاتا ہے،
راتوں کو جب تارے گنتے گنتے گھبرا جاتا ہوں
دوست کی یاد میں دوست کی یاد سے دل مجھکو بہلاتا ہے

یہ قطرۂ خوں دل نام ہے جس کا اے چشمِ مستِ ساقی
اس فتنے کو مت چھیڑ مبادا حشر کوئی برپا کر دے
اے دوست ترے ہوتے بھی طلسمِ راز بنی ہو کیوں ہستی؟
اس چہرے سے بھی نقاب اُٹھا اس راز کو بھی رسوا کر دے
محرومِ نظر ہے دل میرا اے حسنِ اتم اے بحرِ کرم
اس ذرّے کو خورشید بنا، اس قطرے کو دریا کر دے
اے واعظ کیا سمجھاتا ہے؟ میں اُس کا دیکھنے والا ہوں
جو اپنی ایک نظر سے پتھر میں بھی دل پیدا کر دے

غمِ محبت میں دل کے داغوں سے رشکِ لالہ زار ہوں میں
فضا بہاریں ہے جسکے جلووں سے وہ حریفِ بہار ہوں میں
کھٹک رہا ہوں ہر اک کی نظروں میں، بچ کے چلتی ہے مجھ سے دُنیا
زہے گراں باریٔ محبت کہ دوشِ ہستی پہ بار ہوں میں
کہاں ہو تو وعدۂ وفا کرکے او مرے بھول جانے والے!
مجھے بچالے کہ پائمالِ قیامتِ انتظار ہوں میں
تری محبت میں میرے چہرے سے ہے نمایاں، جلال تیرا
ہوں تیرے جلووں میں محو ایسا کہ تیرا آئینہ دار ہوں میں
وہ حسنِ بے التفات اے تاجور ہوا التفات فرما
تو زندگی اب سنا رہی ہو کہ عمرِ بے اعتبار ہوں میں

ہر عشق تری اُلفت کے سوا آئینہ ہے خود غرضی کا
جو تجھ سے محبت کرتے ہیں وہ تجھ سے محبت کرتے ہیں

یہ ستم قیدِ قفس میں صیاد!
کس نے پوچھا تھا بہار آئی ہے؟

خانہ بربادِ چمن برسوں قفس میں ہمصفیر!
آشیاں سے چھُٹ کے خوابِ آشیاں دیکھا کئے

اب قفس میں تو کسے چھیڑے گی اے بادِ بہار
رہ گئے ہیں یادگارِ بلبلِ ناشاد، پر

چمن والو چمن جب ہو چکا تاراج بربادی،
قفس کی زندگی اپنے لئے دشوار کر لینا،

رہ رہ کے برق گرتی ہے اِن پہ ہی بار بار
گلشن میں چار تنکے مرے آشیاں کے ہیں

اہلِ چمن کو قیدِ قفس کی ہے آرزو
صیاد سے بھی بڑھ کے ستم باغباں کے ہیں

تجھے کیا سناؤں یہ حادثہ کہ چمن میں جوشِ بہار ہے
تجھے ہمصفیر! قفس کی قید میں کیا نویدِ بہار دوں

غمِ آشیاں مرے بال و پر کے قفس کو پھونک نہ دے کہیں
یہ نویدِ مرگ ہے ہم قفس! کہ چمن میں جوشِ بہار ہے

یہ لُٹی ہوئی سی بہار کیوں ہے کہاں وہ جانِ بہار ہے؟
یہ چمن سے کون چلا گیا کہ کلی کلی کو فشار ہے

یہ انیسِ غمکدۂ قفس، ہے عزیز جاں مجھے ہمنفس!
دلِ داغدار غمِ بہار میں یادگارِ بہار ہے

ترے باغ میں ہے بہار، تجھ کو مبارک، اے مرے باغباں!
جو کھُبا ہے میری نظر میں پھول وہ انتخابِ بہار ہے

بس رہا ہے مری آنکھوں میں وہی جانِ بہار
جس کا ہم رنگ کوئی پھول چمن بھر میں نہیں

محفلِ حشر بھی سونی نظر آتی ہے مجھے
ڈھونڈتی ہیں جسے نظریں وہی محشر میں نہیں

نہ دے بشارتِ بادِ بہار اے صیاد
چمن سے کیا اُنھیں جو بال و پر نہیں رکھتے

وفا کے گائے ہوئے گیت گا رہا ہوں میں
سنی سُنائی کہانی سنا رہا ہوں میں

جفائے دوست بنی رہنمائے منزلِ دوست
وہ کھو رہے ہیں مجھے اُن کو پا رہا ہوں میں

ہے میری خاک کے ذروں میں پھر نمودِ حیات
کہیں اُنھیں تو نہیں یاد آ رہا ہوں میں

محبت! آہ محبت کی زندگی مت پوچھ،
بڑی مصیبتوں میں مبتلا رہا ہوں میں

ہے کائنات کا ہر ذرہ ہمنوا میرا
کچھ ایسا محفلِ ہستی پہ چھا رہا ہوں میں

مرا فسانۂ غم دل نے بھی کبھی نہ سُنا
قتیلِ شکوۂ درد آشنا رہا ہوں میں

سچ ہے کہ دل فریبئ رنگِ رخِ بہار کیا
حُسن پہ اعتماد کیوں وقت کا اعتبار کیا

نے غمِ مرگ بے کسی جان ترے سپرد ہے
دوست بہانہ ساز کا کیجئے اعتبار کیا

اپنی نظر میں بھی مجھے وقفِ جنوں بنا گئی
یہ مری بات بات پر آپ کی بار بار کیا،

مان لیا کہ تاجورؔ وہ نہیں اختیار میں
کہئے تو اپنے دل پہ ہے آپ کو اختیار کیا

محبت آہ جو تو کامیاب ہو نہ سکی،
ہوس میں عمر کو صرفِ گناہ کر دوں گا

جو مجھ سے چھین لیا دہر خود غرض نے تجھیں
مٹوں گا لیکن اسے بھی تباہ کر دوں گا

نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی نہ وہ بدلے
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

سبب ہر ایک مجھ سے پوچھتا ہے میرے رونے کا
الٰہی ساری دنیا کو میں کیونکر رازداں کر لوں

حشر میں پھر وہی نقشہ نظر آتا ہے مجھے
آج بھی وعدۂ فردا نظر آتا ہے مجھے

خلشِ عشق مٹے گی مرے دل سے جب تک
دل ہی مٹ جائیگا ایسا نظر آتا ہے مجھے

رونقِ چشمِ تماشا ہے مری بزمِ خیال، اِس میں وہ انجمن آرا نظر آتا ہے مجھے
اُن کا ملنا ہے نظر بندیِ تدبیرِ دل صاف تقدیر کا دھوکا نظر آتا ہے مجھے
تجھ سے میں کیا کہوں اے سوختۂ جلوۂ طور دل کے آئینے میں کیا کیا نظر آتا ہے مجھے
دل کے پردوں میں چھپایا ہے ترے عشق کا راز خلوتِ دل میں بھی پردہ نظر آتا ہے مجھے
عبرت آموز ہے بربادیِ دل کا نقشہ رنگِ نیرنگیِ دُنیا نظر آتا ہے مجھے

اے آرزوے شوق تجھے کچھ خبر ہے آج حُسنِ نظر نواز حریفِ نظر ہے آج
ہر رازداں ہے حیرتیِ جلوہ ہائے راز جو باخبر ہے آج وہی بے خبر ہے آج
کیا دیکھئے کہ دیکھ ہی سکتے نہیں اُسے اپنی نگاہِ شوق حجابِ نظر ہے آج
دل بھی نہیں ہے محرمِ اسرارِ عشقِ دوست یہ رازداں بھی حلقۂ بیرونِ در ہے آج
کل تک بھی دل میں حسرتِ آزادیِ قفس آزاد آج ہیں تو غمِ بال و پر ہے آج

دامنِ نگاہ میں جلوہ ہائے حُسنِ دوست بجلیاں بھری ہوئی دامنِ نگاہ میں
حُسنِ بے نیاز کی ٹھوکروں کے پائمال عشق! بے پناہ آئے ہیں تری پناہ میں
شش جہت بنی ہے جلوہ گاہِ دوست تاجور جب سے جلوہ گر ہے دوست وسعتِ نگاہ میں

میرا ہونا تہمتِ ہستی بنا میرے لئے اپنی فطرت پر میں اک الزامِ بے بنیاد ہوں

ملامت گرو! اُن کو ضد پر بٹھا رہی نہیں بھی اگر چاہتا، چاہتا ہوں
خدا مجھ کو تجھ سے ہی محروم کر دے جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں،
میں کیا چاہتا ہوں؟ بتاؤں تمھیں کیا؟ میں خود سوچتا ہوں میں کیا چاہتا ہوں
نظر بھر کے جو دیکھ سکتے ہیں تجھ کو میں اُن کی نظر دیکھنا چاہتا ہوں

جو دیکھتے ہیں تجھے اور دیکھ سکتے ہیں مری نگاہ میں ذوقِ نظر نہیں رکھتے

کہیں رسوا نہ ہوں رنگینیاں دردِ محبت کی مرا اتنا خیال اے دیدۂ خوں بار کر لینا
بس اتنی داد دینا بعد میرے میری اُلفت کی کہ یاد آؤں تو اپنے آپ کو تم پیار کر لینا

دل کے ہاتھوں آہ اُٹھوائے گئے محفل سے ہم آج دل برداشتہ سے ہو رہے ہیں دل سے ہم
بیکسی میں اک انیسِ کُنجِ تنہائی ہے دل، دل کی باتیں کرتے رہتے ہیں شبِ غم دل سے ہم

نوازشِ گردشِ زمانہ حریفِ عمرِ رواں رہے گی حواسِ خمسہ بجا ہیں جب تک جفائے ہمت آسماں رہیگی
محبتِ دوست تا دمِ مرگ راحت افروزِ جاں رہے گی زباں پہ جاری رہیگا یہ نام مُنھ میں جب تک زباں رہیگی

کس کی یاد آکر تجھے محوِ تحیّر کر گئی
تو ہوا نذرِ قفس اے نو گرفتارِ قفس

برداشت دردِ عشق کی دشوار ہو گئی
ہے وجہ انبساط محبّت میں اعتدال
خود داریِ جنوں نے نہ جانے دیا وہاں
اُلفت ہے راز، راز کی حدتک ہی سرفراز
اُس بزمِ خاص میں تھا کبھی عشق باریاب
اُف وہ نظر کہ سب کے لئے دل نواز ہے
جنسِ ہنر مذاق خریدار دیکھکر

خانہ بربادی کے ہاتھ آئی نہ میری بزمِ عیش
مٹا نہ مجھکو محبّت کی خود فراموشی !

محبّت میں زیاں کاری مرادِ دل نہ بن جائے
مجھی پر پڑرہی ہے ساری محفل میں نظر اُن کی
کروں گا عمر بھر طے راہِ بے منزل محبت کی
یہ متوالی نظر یہ بادۂ بے جام ارے توبہ
ترے انوار سے ہے نبضِ ہستی میں تڑپ پیدا
کہیں رسوا نہ ہو اب شانِ استغنا محبت کی

خود فراموش جنوں اِسوقت کس عالم میں ہے؟
باغ میں ہر گُل گریباں چاک تیرے غم میں ہے

اب زندگی بھی جان کا آزار ہو گئی
جب حد سے بڑھ گئی رسن و دار ہو گئی
کمبخت راہِ دوست میں دیوار ہو گئی
جب داستانِ بزم بنی خوار ہو گئی،
بے امتیازیوں سے آج جو بازار ہو گئی،
میری طرف اُٹھی ہے تو، تلوار ہو گئی،
خود بے نیازِ چشم خریدار ہو گئی،

بجلیوں کو میرے خرمن کا پتہ ملتا نہیں
کہ اپنے بھولنے والے کی یادگار ہوں میں

یہ لاحاصل ہی عمرِ عشق کا حاصل نہ بن جائے
یہ دلداریِ حسابِ دوستاں دردِ دل نہ بن جائے
اگر وہ آستاں اس راہ کی منزل نہ بن جائے
کسی پر بے بنی اے ساقی محفل نہ بن جائے
کہیں سارا نظامِ کائنات اک دل نہ بن جائے
مری حالت تمہارے رحم کے قابل نہ بن جائے

طلسمِ عمل

اُردو زبان میں پہلی کتاب جس میں "نفسیات" کے اس راز کو کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ ایک انسان کیونکر کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے۔ یہ ترجمہ ہے مسٹر ڈیل کارنیگی کی اس مشہور کتاب کا جو شایع ہوتے ہی لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو گئی۔ ترجمہ اس قدر سلیس و سادہ ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ مصنف نے اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ سے نفسیاتی حقایق کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ایک افسانہ کی دلچسپی اس میں پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب کو ایک بار شروع کرنا اسے ختم کر دینا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

منیجر نگار، لکھنؤ

میرزا ثاقب لکھنوی

میرزا ذاکر حسین نام، ثاقب تخلص، وطن طبرستان، مولد اکبرآباد (آگرہ) گہوارۂ تعلیم و تربیت لکھنؤ۔ سلسلۂ نسب حاجی علی قزلباش ماژندرانی المعروف بہ علی قلی خاں شاملو سے ملتا ہے، جو شاہ طہماسپ صفوی کے معتمد علیہ تھے۔

میرزا ثاقب کے آباؤ اجداد نے اکبرآباد میں سکونت اختیار کی اور ۲ ماہ جنوری ۱۸۶۹ء مطابق ۱۹ ماہ مبارک رمضان ۱۲۸۵ھ کو یہیں پیدا ہوئے۔ میرزا کی ولادت کو تقریباً چھ ماہ کا زمانہ گزرا تھا کہ نامساعدت روزگار نے میرزا کے والد ماجد کو اکبرآباد چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ بڑے میرزا صاحب مرحوم معہ اہل و عیال لکھنؤ چلے آئے اور یہیں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔

میرزا کی ابتدائی تعلیم قدیم اسلوب پر ہوئی اور پھر انگریزی تعلیم کے لئے آگرہ بھیجے گئے، وہاں تقریباً چار سال قیام رہا اور یہیں میر مومن حسین صفی کی صحبت میں اُن کی شاعرانہ اہلیت بروئے کار آئی۔ ماہ دسمبر ۱۸۹۱ء میں میرزا کی شادی ہوئی۔ اب عرصہ سے ریاست محمود آباد کے وثیقہ دار ہیں۔

دیارِ دل میں کہیں دوست کا پتا نہ ملا
وہ بدنصیب ہوں کعبے میں بھی خدا نہ ملا

شریکِ قید تھے جذباتِ دل مگر بیکار
قفس تھا ایسا کہ نالوں کو راستا نہ ملا

متاعِ عشق کا ہو دل کے بعد کیا سودا
کہ گم شدہ کا بھروسا نہیں ملا نہ ملا

کس نے غمکدہ دنیا کا نام رکھا ہے
ہمیں تو کوئی یہاں درد آشنا نہ ملا،

میں امتحاں کدۂ دہر سے اُٹھا جب سے
خبر نہیں مگر اتنی کہ دوسرا نہ ملا

چھپا و آپ کو جس رنگ یا جس بھیس میں چاہو
مگر چشمِ حقیقت بیں سے پردا ہو نہیں سکتا،

کس جلوے پہ مرتے ہیں ہم سے نہ کوئی پوچھے،
پہچان نہیں سکتے لیکن کبھی دیکھا ہے

ہے طور پہ اک خلوت بجلی کی تجلّی میں، ہشیار، سرک جائیں، سنتے ہیں کہ پردا ہے

جو کچھ ہوا عالم میں ہوتا نہ تو کیا ہوتا بہتر تھا بگڑنے کو یہ دل نہ بنا ہوتا،

دم نہیں لیتا دھواں دل کا نظر آئے تو کیا سیکڑوں پردے پڑے ہیں دیدۂ ادراک پر

میں تو ہوں مارا ہوا دل کا اگر شک ہو تو آپ اور اسی صورت کا اک بیمار پیدا کیجئے

دل سے جھگڑا کس لئے بیکار پیدا کیجئے توڑ کر شیشے کو کیوں تلوار پیدا کیجئے

سوائے رحمتِ رب کچھ نہیں ہے بہت کچھ تھا مگر اب کچھ نہیں ہے

نہ پوچھو دل سے اُسکی راہ کا حال سوائے عشق مذہب کچھ نہیں ہے

اندھیرے میں وہ سوجھی یہ نہ سوجھی تری شب ہے مری شب کچھ نہیں ہے

جو سر پہ بلا آئی وہ غفلت ہی سے آئی، بے سوئے ہوئے خواب پریشاں نہیں دیکھا

ل گئے ہوں گے کہیں حسرت بھرا دل اور آپ خواب دیکھا ہے کہ اک افسردہ محفل اور آپ

آئے گا ہاں گھیرے، گزر جانے کے بعد ایک دن ہوگی یہی برباد منزل اور آپ

خوفِ محشر کس لئے، آنکھوں کو دھوکا ہو گیا ایک ہی صورت کے ہونگے میرا قاتل اور آپ

مجھ کو یقینِ وعدۂ فردا ضرور تھا، مشکل یہ آپڑی تھی کہ دل ناصبور تھا،

گلشن بہار پر تھا نشیمن بنا لیا میں کیوں ہوا اسیر مرا کیا قصور تھا،

پیدا ہوا ہے جو مری ہستی سے انقلاب، دل کا کیا دھرا ہے مجھے کیا شعور تھا،

گلچیں! برا کیا جو یہ تنکے جلا دئے تھا آشیاں مگر ترے پھولوں سے دور تھا

میں رو رہا ہوں جو دل کو تو بیکسی کے لئے وگرنہ موت تو دنیا میں ہے سبھی کے لئے

شبِ فراق کی روزانہ آفتیں، توبہ یہ امتحان تو ہوتا کبھی کبھی کے لئے

بہت سی عمر مٹا کر جسے بنایا تھا مکاں وہ جل گیا، تھوڑی سی روشنی کے لئے

قفس میں چپ نہ رہوں میں تو کیا کروں کہ یہ قید نہ دوستی کے لئے ہے نہ دشمنی کے لئے

بڑھائی جس نے تری نیند مجھکو تڑپا کے وہ میری عمرِ گزشتہ نہ تھی کہانی تھی

جہاں تھا تنگ جس طولِ امل کے پھیل جانے سے لحد میں آ گیا سارا وہ قصّہ مختصر ہو کر

وجودِ بے ضرر ہوں باغباں! گلشن میں رہنے دے کسی جا پڑا رہوں گا سایۂ برگِ شجر ہو کر

ابھی تو نقطۂ موہوم ہستی ہوں زمانے میں، کسی دن دیکھ لینا پھیل جاؤں گا خبر ہو کر —

گرنے لگی ہے قیمتِ دل آنسوؤں کے ساتھ کس نے اُلٹ دیا ورقِ اعتبار کو

جب زلف دیکھ لی ہے تو چہرہ بھی دیکھ لوں — گردش نہیں ہے کیا مرے لیل و نہار کو
عجب ہے اُترے دمِ ذبح اُن کی آنکھ میں خون — کٹیں کہاں کی رگیں اور کہاں لہو آئے

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے — جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے
بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی — ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے
مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقبؔ — کنارے پہ آہی لگی بہتے بہتے

اُنکی بزمِ ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی — نالہ کش برسوں کا اک تصویر بنکر رہگیا
خوب سنبھلا میں نگاہِ مست ساقی کے حضور — کانپتے ہاتھوں سے گرتے گرتے ساغر رہگیا

نزع اک عید ہے روتے ہوئے وہ آئے ہیں — اے دلِ زار یہی وقت ہے مرجانے کا
دیکھ خونِ سرِ فرہاد کا رنگیں تیشہ — یہ نگینہ ہے بنایا ہوا دیوانے کا

غنیمت ہے قفس فکرِ رہائی کیا کریں ہمدم! — نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہے گلشن میں
مرے دل کی لگی کب زندگی میں بجھنے والی تھی — دبا دی دوستوں نے مدتوں کی آگ مدفن میں

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن — زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے
جز زمینِ کوئے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ — جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے

عروسِ دہر کو دل دیکے آزماؤں کیا — سنوارنے میں جو بگڑے اُسے بناؤں کیا
جو اہلِ دل پہ گزرتی ہے، مجھ پہ بھی گزری — سُنا ہوا ہو جو قصہ اُسے سُناؤں کیا
شبِ فراق کو میں جانوں یا خدا جانے — جو تم سمجھ نہیں سکتے اُسے بتاؤں کیا

حیلۂ صبر بتائیں جو تمھیں یاد رہے — ہمکو دم توڑتے دیکھو تو خفا ہو جانا
دامِ اُلفت نے قفس مجھکو دکھایا آخر — خوف کہتا تھا کہ گلشن سے ہوا ہو جانا
پھول کو توڑکے دیکھو اثرِ وصل و فراق — موت ہے چاہنے والوں سے جدا ہو جانا
کس دوراہے میں کھڑا ہوں متحیر کی طرح — کہ بقا ہے مجھے ممکن نہ فنا ہو جانا
تہنیت موت کو دیتا ہے مرے دل کا مرض — عید ہے ماتمِ حسرت کا بپا ہو جانا

نہ ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں، — ابرِ سیاہ جانبِ گلزار دیکھکر
وہ کیا سمجھ سکیں گے نشیب و فرازِ دہر — جو چل رہے ہیں راہ کو ہموار دیکھکر

کہنے کو مشتِ پر کی اسیری تو تھی مگر
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

گلشن سے اُٹھ کے میرا مکاں دل میں آ گیا
اک داغ بن گیا ہے نشیمن جلا ہوا

کیا تیرگی لئے ہوئے آئی شعاعِ نور
دیکھا شبِ فراق ازل کا لکھا ہوا

دل سے میں کہہ رہا ہوں تجھ پر ہوا فدا میں
دل مجھ سے کہہ رہا ہے او بے خبر جلا میں

تڑپا دیا ہے دل کو شاباش ہم صفیرو
یونہی پھر اک صدا دو، ٹوٹا قفس، چلا میں

اُن کی رضا پہ مرنا اک قسمِ زندگی تھی،
اپنے دلِ حزیں سے پھر کیوں ہوا خفا میں

پھر اور کس طرح سے اُجڑے مکاں کو سجتا
قصرِ لحد میں آ کر تصویر ہو گیا میں

وہ نزع کی خموشی جامِ جہاں نما تھی
اک عمر کی کہانی دم بھر میں کہہ گیا میں

جلوۂ حسن اک اشارے میں بہت کچھ کہہ گیا
میں نہیں سمجھا مگر ہاں دل تڑپ کر رہ گیا

حادثوں کے زلزلوں سے جامِ دل چھلکا کیا
ایک چُلّو خون ہی کیا بہتے بہتے بہہ گیا

وہ شباب کے فسانے جو میں سن رہا ہوں دل سے
اگر اور کوئی کہتا تو نہ اعتبار ہوتا

یہ زمانہ بڑھ رہا ہے فقط اضطرابِ دل سے
شبِ غم نہ یوں ٹھہرتی جو مجھے قرار ہوتا

مری داستانِ غم کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں
کچھ انھیں کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا

قفس کی تیلیاں اچھی ہیں تنکوں سے نشیمن کے
یہ سب کچھ ہے مگر صیاد! دل پر کیا اجارا ہے

نزاعِ خواب و بیداری وہ فیصل کر نہیں سکتے
مقابل میرے نالوں سے جوانی کا تقاضا ہے

زمانے کی بھری محفل کی آبادی مٹانے کو
بہت کچھ حسن نے اُس آفتِ جاں کو سنوارا ہے

درد سے اک آہ بھی کرنے نہیں دیتے مجھے
موت ہے آساں مگر مرنے نہیں دیتے مجھے

عقلِ حقیقت آشنا اور ہے، ور قلب اور ہے
عشق نہیں یہ ضعف ہے، حسن نہیں شباب ہے

جنون اس کو جانئے کہ شغلِ زندگیٔ دل،
لگا کے آگ دیکھتا ہوں خانۂ شباب میں

کسی کا رنج دیکھوں یہ نہیں ہو گا مرے دل سے
نظر صیاد کی چھپکے تو کچھ کہہ دوں عنادل سے

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

امید و ناامیدی کا بھرم ہونا وہی جانے
کہ جس نے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہے ساحل سے

کیا سبب کچھ تجھے معلوم ہے اے ابرِ بہار
دل کے مرجھانے سے کیوں زخم ہرا ہوتا ہے

میرے راضی برضا ہونے سے سب راضی ہیں
ورنہ جو ہے وہ شکایت سے خفا ہوتا ہے

ندا دیتے تھے باہم راستے حسن و محبت کے
بغیر آنکھوں کے پہچانا یونہی منزل کو منزل نے

میں وہ ہوں جس کا زمانے نے سبق یاد کیا
غم نے شاگرد کیا پھر مجھے اُستاد کیا،

بو نکلنے لگی غنچوں سے؟ تو پھر ڈر کس کا
یہ خبر سچ ہے، تو صیاد نے آزاد کیا

نہ شرماؤ اگر ہم شکوۂ بیداد کرتے ہیں
محبّت ہے، تمھاری عادتوں کو یاد کرتے ہیں

عدو صیاد و گلچیں کیوں ہوئے میرے نشیمن کے
یہ تنکے بھی ہیں اس قابل جنھیں برباد کرتے ہیں

خود اُن کا حُسن میری دادخواہی ان سے کرتا ہے
وہ آئینہ لئے ہیں اور مجھکو یاد کرتے ہیں

کہے جا، بندھ چلا ہے داستاں کا رنگ محفل میں
مری سننے لگے ہیں روئے جاناں دیکھنے والے

رو کر، حریفِ گنبدِ خود کام ہوگیا
نالہ کیا تو جنگ کا پیغام ہوگیا

خوش گوئیاں مخالفِ طبعِ زمانہ تھیں،
ثاقب انھیں گنوں سے تو بد نام ہوگیا

کب اُس نے کی ہے پرسشِ غمہائے جاں گسل
جب حالِ دل بیان کے قابل نہیں رہا

آگ یہ کیسی لگی ہے سینۂ دلگیر میں
چھالے آتے ہیں نظر آئینۂ تقدیر میں

ظالم و مظلوم اُن کے زورِ بازو پر نثار
چھوڑتے ہیں دل پہ چٹکی لیکے پائے تیر میں

نامہ لکھتے وقت کیا جانے قلم کیونکر چلا،
اضطرابِ دل نظر آنے لگا تحریر میں

نالے کرتا جا کہ زورِ ناتوانی ہے بہت
جھک چلا ہے چرخ گر جائے گا دو اک تیر میں

پیشِ عاقل بولتا ہے عالمِ نقش و نگار
کہہ گئی سب کچھ خموشی پردۂ تصویر میں

وہ روح بخشِ جاں تھے، جانکاہ بن کے نکلے
کچھ دم تھے پاس اپنے جو آہ بن کے نکلے

جفا اُٹھانے کی عادت پڑے تو کیونکر جائے
ستم سہے گھبراتے کہاں کہ جی بھر جائے،

یہی سمجھ کے جفاؤں کا سلسلہ چھوڑو
کہ جس کی موت نہ آئے وہ کس طرح مر جائے

جب میں کہتا ہوں کوئی وصل کا ساماں نہ ہوا
کان میں آتی ہے آواز کہ 'جی ہاں' نہ ہوا

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی
میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

گوہرِ عشق کی نایابی و عزت کو سمجھ
بھر دیا صحنِ جہاں کو مگر ارزاں نہ ہوا

تاثیرِ ہجر کون بتائے کہ میں تو میں
ہوتے ہی شام دہر کی صورت بدل گئی

شبِ وصال بھی تا صبح مطمئن نہ رہا
ابھی تھی رات کہ پیغامِ آرزو آئے

وصال و ہجر میں چھپتا ہے دل کا حال کہیں
بجھے تو پیاس سوا ہو جلے تو بو آئے

سجدے کا کام آج نہ لیں گے جبیں سے ہم
نقشِ قدم اُٹھائیں گے اُنکے زمیں سے ہم

نغمے نہ جان نوحۂ اہلِ قفس ہے یہ
صیاد! ذبح ہوگئے اس آفریں سے ہم

ثاقب ملالِ اہلِ حسد بھی ہے ناگوار	کیا خوش ہوں اپنی طبعِ سخن آفریں سے ہم
جل کے بھی میں نے اُف نہ کی ہمتِ دل وہی رہی	برسوں دھواں گھٹا کیا پھر بھی یہ سینہ صاف ہے
خوب تھا قصۂ قفس سنتے جو میرے ہم نوا	قید میں ہوں کہ مر گیا اس میں بھی اختلاف ہے
اک کیفِ بیخودی میں کٹی شب وصال کی	اچھا ہوا خبر نہ ہوئی اپنے حال کی
اپنا سا زور کر کے تھکے منعمانِ دہر	مٹھی نہ کھل سکی مرے دستِ سوال کی
مجھ سے نہ پوچھ حالِ دل چور ہے جورِ چرخ سے	اُس پہ ہر ایک پارہ ہے اک ورق انقلاب کا
گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی	اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی،
برگشتہ ہوئی دنیا رسم و رہِ الفت سے	اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی
سحر کو بھی مری محفل میں برہمی نہ ہوئی	تمام رات ہوئی درد میں کمی نہ ہوئی
غرورِ حسن تمنائے دل کا دشمن تھا	وہ کون دن تھا کہ جس دن ہما ہمی نہ ہوئی
میری قسمت میں یہی لکھا ہے پھر کیا کیجئے	بند میری آنکھ ہو اور آپ دیکھا کیجئے
مفت بازیگاہِ دنیا میں ہیں بدنام اہلِ عشق،	جان ہی کا کھیل ہوتا ہو تو پھر کیا کیجئے
واہ وا، اے بیکسیِ عشق! کیا کہنا ترا	دل پہ چل جائے چھری آنکھوں سے دیکھا کیجئے
ہم تو دل بیچیں مگر ثاقب وہ دل والے کہاں	ہے بھری بازار لیکن کس سے سودا کیجئے
طینتِ آدم میں تھی اللہ! کیا نشو و نما،	ایک مٹھی خاک یوں پھیلی کہ دنیا ہو گئی
قیدِ غم بھی دل لگی ہے ہنسنے والوں کے لئے	عندلیب آ کر قفس میں اک تماشا ہو گئی
یہ بے مروتیاں دیکھئے کہ لب نہ ہلے	جو پاس تھے ہم انھیں دور تک پکار آئے
قریب ہو کے نہ سننا دلیلِ الفت ہے	پکارے جاؤ کوئی ہم کلام ہو کہ نہ ہو
حجاب پڑ نہیں سکتا نگاہِ الفت پر	سخن طراز ہیں آنکھیں کلام ہو کہ نہ ہو
قوتِ غم دیکھ، زورِ ناتوانی پر نہ جا،	زلزلے عالم میں تھے جب دل مرا بیتاب تھا
شکر شانے کا کروں یا صبر کو ڈھونڈوں کہیں	زلف تو سمٹی مگر ہاں دل پریشاں ہو گیا
بڑے شباب پہ دردِ فراق مستی ہے	نہ ہو شراب تو بہرِ دل گھٹا برستی ہے
بھرے ہوؤں کو بھرا کرتے ہیں کرم والے	جہاں ہے سبزہ گھٹا بھی وہیں برستی ہے
نازاں نہ ہو کہ محفلِ ہستی میں سازِ عیش	ہوتا ہے بارِ خاطرِ انساں کبھی کبھی
رونے کو پوچھتے ہو تو آنکھیں ہیں سامنے	ہنسنے کو پوچھتے ہو تو جی ہاں کبھی کبھی

گزرے گی یونہی شام و سحر دیکھتے رہنا
جو ہے وہ نہ آئے گا نظر دیکھتے رہنا

صیاد! تری قید سے چھٹنا تو ہے معلوم
آفات سے کہدے مرا گھر دیکھتے رہنا

کیوں میرے داغِ دل کی ہے دشمن ہوائے دہر
ایسے چراغ بجھ نہیں سکتے زمانے میں

یوں تو مشتِ خاک تھا دل خون ہو کر بہہ گیا
لیکن اس قطرے میں وہ کچھ تھا جو دریا میں نہ تھا

دل یہ کہتا ہے کہ نالے بے اثر تھے شامِ غم
میں یہ کہتا ہوں کہ اُس شب کوئی دنیا میں نہ تھا

دیکھ میرے دل کو تو، اے منکرِ اعجازِ عشق،
گر نہیں سکتا ہے بادہ اور شیشہ چور ہے

یہ ہے بہتے ہوئے دریا کی آواز
وہیں جانا ہے آئے تھے جہاں سے

سراسر دفترِ عالم ہے رنگیں
فقط میری تمہاری داستاں سے

کسی کے سامنے کیونکر کہا جائے
خود اپنا دردِ دل اپنی زباں سے

موہوم ہے امید رہائی کی قفس میں
ممکن ہے، مگر دہر کا دستور نہیں ہے

سونے والوں کو کیا خبر اے ہجر
کیا ہوا ایک شب میں کیا نہ ہوا

ہنس کے بھی، رو کے بھی کہا لیکن
مطلبِ دل کبھی ادا نہ ہوا

بیانِ حال کا نیرنگِ عشق دشمن ہے
ادھر وہ سامنے آئے اُدھر گلا نہ رہا

کس منہ سے زباں کرتی اظہارِ پریشانی
جب تم نے مری حالت صورت سے نہ پہچانی،

رازِ غمِ الفت ہم سمجھے تو مگر چپ ہیں،
کہنے میں نہیں آتی جو بات ہو وجدانی

اب تک مجھے کچھ اور دکھائی نہیں دیتا
کیا جانئے کس آنکھ سے یہ آنکھ لڑی ہے

آدھی سے زیادہ شبِ غم کاٹ چکا ہوں
اب بھی اگر آجاؤ تو یہ رات بڑی ہے

معلوم تھا، پہ رسمِ دنیا، نباہتا تھا
کہتا تھا میں کہ "کیا ہے؟" جب دل کراہتا تھا

کیا ضبطِ درد کرتا دل کا علاج لیکن
جو کچھ میں کہہ چکا تھا اُس کو نباہتا تھا

سنتا ہوں مرا دل کی صفیں گرد ہیں اُنکے
محفل تو بہت خوب ہے دیکھوں جو گزر ہو،

ویرانہ جہاں دیکھ لیا راہِ سفر میں،
بڑھتا ہوں اُسی سمت کو شاید مرا گھر ہو،

سیکڑوں نالے کروں لیکن نتیجا بھی تو ہو،
یاد دلواؤں کسے جب کوئی بھولا بھی تو ہو،

یوں بدل دیں خوف نے سارے جہاں کی صورتیں
کھول کر آنکھیں جدھر دیکھا اُدھر ضیاد تھا

حشر میں میرا لہو چھپتا تو آخر کس طرح،
آپ بھی بھولے نہ تھے مجھکو بھی کچھ کچھ یاد تھا

قیدِ تنہائی نے بھیرا زندگی بھر کا ملال،
میں جو بھولا تھا چمن میں وہ قفس میں یاد تھا

یہ خندۂ طرب نما مبارک اہلِ دہر کو
بہت زمانہ ہوگیا کہ میں ہنسی کو رو چکا

یہ آشیانۂ ستم چمن میں ہو تو خوب ہے
یہ جی میں ہے کہ لے اُڑوں قفس تو میرا ہوچکا

موت وہ اچھی کہ جس کے بعد مل جائے حیات
جو سبب ہو موت کا وہ زندگی بیکار ہے

غیر ہیں پھر غیر، دل اپنا تھا اس سے پوچھئے
کیا خطا کی تھی جو اب تک درپئے آزار ہے

اپنی حالت کے سوا کچھ بھی نظر آتا نہیں،
جس کی صورت دیکھتا ہوں میں وہی بیمار ہے

یہ کتنے زخم تھے گھٹنے پہ جن کو داغ کہتے ہیں
ہر اک جا دامنِ دل پر رفو معلوم ہوتا ہے

چراغِ عقل بھی گل ہے شبِ غم کی سیاہی سے
نہ میں معلوم ہوتا ہوں نہ تو معلوم ہوتا ہے

عقدہائے غم سے وابستہ ہے اپنی زندگی
ہم کہاں یہ مشکلیں جب وقت آساں ہوگئیں

زندگی میں کیا مجھے ملتی بلاؤں سے نجات،
جو دُعائیں کیں وہ سب تیری نگہباں ہوگئیں

لوٹ لی گردوں نے آخر دل کی ساری کائنات
کچھ تمنائیں تھیں وہ بھی وقفِ نسیاں ہوگئیں

قید و آزادی سے کیا مطلب ہے مجھ دلگیر کو
تم نے جو پہنائی ہے پہنے ہوں اُس زنجیر کو،

اک نیا دل طلسم سہنے کو بنانا چاہیئے،
ہو تو سکتا ہے مگر اس کو زمانہ چاہیئے،

پتّی پتّی سے نہ خون اُبلے تو مجرم جاننا
ذبح میں ہو لوں تو پھر رنگ گلستاں دیکھنا

کائناتِ موت دامن میں لئے ہیں دل کے زخم
درد اگر کم ہو تو تم سوئے نمکداں دیکھنا،

ہستی فانی پہ اک اصرار تھا تقدیر کو
ورنہ کب منظور تھا خوابِ پریشاں دیکھنا

پیس ڈالا خواہشِ بیجا نے کوہِ طور کو
دل کی قوت دیکھ لے پھر روئے جاناں دیکھنا

اُس کی رحمت پہ گرے پڑتے ہیں عصیاں والے
حشر کا ہے کو ہے اک جلسۂ رندانہ ہے

دل کے قصے کہاں نہیں ہوتے
ہاں، وہ سب سے بیاں نہیں ہوتے

مری قید کا دل شکن ماجرا تھا،
بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا

شبِ غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو،
جدھر دیکھتا تھا خدا ہی خدا تھا

میں دُنیا کو میخانہ سمجھا کہ اس میں
کوئی ہنس رہا تھا کوئی رو رہا تھا

وہ گبر مسلماں صورت ہے دیندار نہیں ثاقب نہ سہی
خود صدق و صفا کہتے ہیں دلی اس رندِ خجستہ سیرت کو

جلیل مانک پوری

جلیل تخلص۔ جلیل حسن نام۔ خلف مولوی حافظ عبدالکریم مرحوم۔ سنہ ۱۲۸۳ھ میں بمقام مانک پور (اودھ) ولادت ہوئی۔ دس گیارہ سال کی عمر میں حفظ قرآن سے فراغت پائی۔ طالب علمی کا زمانہ اکثر لکھنؤ میں گزرا جہاں عربی اور فارسی میں استعداد بہم پہونچائی۔ ابتدا ہی [illegible] سخن گوئی کا شوق تھا۔ بیس سال کی عمر میں حضرت امیر مینائی کے سلسلۂ تلمذ میں وابستہ ہوئے اور تا دم واپسیں شفیق اُستاد کے قدموں سے جدا نہ ہوئے۔ عروض و قوافی کے ساتھ جملہ نکات و محاسن شاعری حضرت امیر ہی کے فیضانِ صحبت سے حاصل کئے۔ رام پور میں جب امیر اللغات کی تدوین کے لئے ایک وسیع دفتر کھولا گیا تو اس کی ادارت انھیں کے سپرد ہوئی۔ پھر سفر بنارس اور بھوپال وغیرہ میں حضرت امیر کے ہمراہ رکاب رہے۔

۱۰ر جمادی الاول سنہ ۱۳۱۸ھ کو حضرت امیر مینائی کے ہمراہ حیدرآباد پہونچے اور اس زمانے میں مہاراجہ بہادر سر یمین السلطنت کی اعانت اور مہماں نوازی ان کے شاملِ حال رہی اور دو رسالے محبوب الکلام اور دبدبۂ آصفی کی ترتیب و اشاعت کا کام بھی سپرد کیا گیا۔ سنہ ۱۳۳۶ھ میں چند احباب کے اصرار سے تذکیر و تانیث پر ایک مبسوط کتاب لکھی جس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث نہایت واضح طور پر بتائی گئی ہے۔ اس کا مقدمہ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی نے لکھا ہے۔ پھر اختر مینائی کی شرکت سے دکن کی ایک ضخیم تاریخ سرکار نظام کے حکم سے مرتب اور مطبوع ہوئی۔

حضرت داغ مرحوم کی وفات کے بعد سنہ ۱۳۲۲ھ میں حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں بہادر سابق تاجدار دکن نے اپنی اُستادی کا شرف بخشا اور داغ مرحوم کی جگہ پر مامور فرمایا اور "جلیل القدر" کے معزز خطاب سے سرفراز کیا پہلا دیوان تاج سخن اسی زمانے کی یادگار ہے۔ حضور پر نور نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف سابع خلد اللہ ملکہ جب سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے بھی اپنی اُستادی کے شرف سے مشرف فرمایا اور آج تک جلیل ہی سے مشورۂ سخن فرماتے ہیں۔ پہلے آپ نے "نواب فصاحت جنگ بہادر" کے خطاب سے سرفراز فرمایا پھر "امام الفن" کے لقب سے مزید عزت افزائی فرمائی۔ شہزادگان اور صاحبزادگان بھی حسب حکم سرکار انھیں کو اپنا کلام دکھاتے ہیں۔

تصنیفات کی فہرست یہ ہے:۔ تاج سخن — پہلا دیوان جو پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۱۰ء میں طبع ہوا —

جانِ سخن ۔ دوسرا دیوان - پہلی مرتبہ ۱۹۱۶ء میں شایع ہوا ـــــ سرتاجِ سخن :۔ (در مدح حضور نظام) قصاید، قطعات اور تاریخوں کا مجموعہ ـــــ معراجِ سخن ۔ نعتیہ کلام اور سلام وغیرہ کا مجموعہ ـــــ تعلیم الصلوٰۃ :۔ دینیات کا رسالہ ـــــ تذکیر و تانیث :۔ مفصل ذکر اوپر آچکا ہے ـــــ اُردو کا عروض :۔ اُردو میں مستعملہ بحروں کا مجموعہ ـــــ گل صد برگ :۔ رباعیات کا مجموعہ ـــــ سوانح حضرت امیر مینائی :۔ اس میں حضرت امیر کے حالات و واقعات زندگی اور کلام کے انتخاب کے ساتھ محاسن شاعری کو واضح کیا گیا ہے ۔ ۱۹۲۶ء میں شایع ہوئی ـــــ معیارِ اُردو :۔ محاورات کا مجموعہ ـــــ روحِ سخن :۔ تیسرا دیوان (غیر مطبوعہ)

انتخاب از تاجِ سخن :

میری وحشت بھی تماشا ہو گئی — جو اِدھر گزرا کھڑا دیکھا کیا،

آج ہی آ جو تجھ کو آنا ہے — کل خدا جانے میں ہوا نہ ہوا

مزہ لیں گے ہم دیکھ کر تیری آنکھیں — اُنھیں خوب تو نامہ بر دیکھ لینا

یہ رنگ گلاب کی کلی کا، — نقشہ ہے کسی کی کمسنی کا،

بلبل کی بہار میں نہ پوچھو — منہ چومتی ہے کلی کلی کا،

منہ پھیر کے یوں چلی جوانی — یاد آگیا روٹھنا کسی کا

اے جلیل آنسو بہائے تم نے کیوں — اُن کو ہنسنے کا بہانا مل گیا

میں نے جو تمھیں چاہا کیا اس میں خطا میری — یہ تم ہو یہ آئینہ انصاف ذرا کرنا

جاتے ہو خدا حافظ ہاں اتنی گزارش ہے — جب یاد ہم آجائیں ملنے کی دعا کرنا

تھی عشق و عاشقی کے لئے شرطِ زندگی — مرنے کے واسطے مجھے جینا ضرور تھا

وہ بیخودی کی آڑ میں لپٹے جلیل سے — کیونکر کہوں کہ ہوش نہ تھا، تھا ضرور تھا،

چمن سے توڑ کر گل لے گیا بولی نہ کچھ بلبل — جو میں ہوتا تو گلچیں کے گلے کا ہار ہو جاتا

دن جو دشمن کے پھرے میرے بھی پھرنا چاہئے — کیا زمانہ ایک ہی کروٹ بدل کر رہ گیا

خاک چمن میں شبنم و گل کا عجب ہے رنگ — ساغر کسی سے چھوٹ پڑا ہے شراب کا

چلے ہائے دم بھر کو مہمان ہو کر — مجھے مار ڈالا مری جان ہو کر :

ہم بھولے ہوئے راہ ہیں اے کعبہ نشینو — جاتے تھے کہیں اور نکل آئے کہیں اور

یہ جو سر نیچے کئے بیٹھے ہیں   جان کتنوں کی لئے بیٹھے ہیں
جھوٹے وعدے بھی نہیں کرتے آپ   کوئی جینے کا سہارا ہی نہیں

وعدہ کرکے وہ ہائے جاتے ہیں   روگ دل کو لگائے جاتے ہیں

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں   وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

سونے میں کھل گئی ہے جو وہ زلفِ مشکبو   کیا کیا ملا رہا ہوں نسیمِ سحر کو میں
اچھا نہیں کہ ہو رُخِ محبوب بے نقاب   پردہ اُٹھے تو ڈال دوں اپنی نظر کو میں
اک شمع ہے مزار پہ وہ بھی بجھی ہوئی،   کیا دیکھ کر بلاؤں نسیمِ سحر کو میں

او آنکھ چُرا کے جانے والے   ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں

جگر تھامے ہوئے بیٹھے ہیں جتنے سننے والے ہیں   مرے پُر درد نالے بھی بڑے بیدرد نالے ہیں

نصیب سے کہیں مرنا کسی پہ ہوتا ہے،   مزہ جو اس میں ہے وہ عمرِ جاوداں میں نہیں

آپ نے تصویر بھیجی میں نے دیکھی غور سے   ہر ادا اچھی خموشی کی ادا اچھی نہیں

راہِ طلب میں ایسا خود رفتہ کون ہوگا   منزل پہ ہم پہونچکر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

تڑپتے لوٹتے ہیں نالہ و فریاد کرتے ہیں   ہم اپنے بھولنے والے کو یوں ہی یاد کرتے ہیں
ہماری بیخودی کا حال وہ پوچھیں تو اے قاصد   یہ کہنا ہوش اتنا ہے کہ تم کو یاد کرتے ہیں
جلیل اچھا نہیں آباد کرنا گھر محبت کا   یہ اُن کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

مزے بے تابیوں کے آ رہے ہیں   وہ ہم کو، ہم انھیں سمجھا رہے ہیں

چال ہے مست، نظر مست، ادا میں مستی،   جیسے آتے ہیں وہ لوٹے ہوئے میخانے کو

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی   کرکے توبہ توڑ ڈالی جائے گی
آتے آتے آئے گا اُن کو خیال   جاتے جاتے بے خیالی جائے گی
دیکھتے ہیں غور سے میری شبیہ   شاید اس میں جان ڈالی جائے گی
اے تمنا تجھ کو رو لوں شامِ وصل   آج تو دل سے نکالی جائے گی
قبر میں بھی ہوگا روشن داغِ دل   چاند پر کیا خاک ڈالی جائے گی
فصلِ گل آئی جنوں اچھلا جلیل   اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

میری ہر بات کو اُلٹا وہ سمجھ لیتے ہیں   اب کے پوچھا تو یہ کہہ دوں گا کہ حال اچھا ہے
نقاب کہتی ہے میں پردۂ قیامت ہوں،   اگر یقیں نہ ہو دیکھ لو اُٹھا کے مجھے

میں ڈر رہا ہوں تمھاری نشیلی آنکھوں سے
کہ لوٹ لیں نہ کسی روز کچھ پلا کے مجھے

ہوئی مدت کہ چمن چھوٹ گیا،
اب ہمیں کیا جو بہار آئی ہے
آپ اور سوگ مرا کیا کہنا،
دیکھئے لب پہ ہنسی آئی ہے
تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں
دو قدم کوچۂ رسوائی ہے،

بھلا توبہ کا میخانے میں کیا ذکر
جو ہے بھی تو کہیں ٹوٹی پڑی ہے

ناز بھی ہوتا رہے ہوتی رہے بیداد بھی
سب گوارا ہے جو تم سنتے رہو فریاد بھی
تم جو کہتے ہو بگڑ کر ہم نہ آئیں گے کبھی
یہ بھی کہدو اب نہ آئے گی ہماری یاد بھی
ہائے کیا حسرت کدہ تھا دل ہمارا اے جلیل
ہوگیا دو روز میں آباد بھی برباد بھی

آنکھوں میں کون آ کے الٰہی نکل گیا
کس کی تلاش میں مرے اشکِ رواں چلے
جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

دن کی آہیں نہ گئیں رات کے نالے نہ گئے
مرے دلسوز مرے چاہنے والے نہ گئے

اظہارِ حال پر مجھے قدرت نہیں رہی
ان کو یہ وہم ہے کہ محبت نہیں رہی
یا عمر بھر کا شوق تھا یا اک نگاہ میں
دیدار کی کلیم کو حسرت نہیں رہی.

آج آنسو تم نے پونچھے بھی تو کیا
یہ تو اپنا عمر بھر کا کام ہے

کہدو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال
مر مر کے ہجرِ یار میں جینا کمال ہے
اس محویت پہ آپ کی قربان میں جلیل
اتنا نہیں خیال کہ کس کا خیال ہے

اب کون پھر کے جائے تری جلوہ گاہ سے
او شوخ چشم پھونکدے برقِ نگاہ سے

دل گیا دل لگی نہیں جاتی،
روتے روتے ہنسی نہیں جاتی

کتنی گہری مرے ساقی کی نظر ہوتی ہے
مجھکو پھر دن میں کہیں اپنی خبر ہوتی ہے
بے وفائی ہو کہ شکوہ کہ ستم کی فریاد
سب کا توڑ ایک لگاوٹ کی نظر ہوتی ہے

مار ڈالا مسکرا کر ناز سے
ہاں مری جاں پھر اُسی انداز سے
کس نے کہدی اُن سے میری داستاں
چونک چونک اُٹھتے ہیں خوابِ ناز سے
دزدِ دل پہلے تو وہ سنتے نہ تھے
اب یہ کہتے ہیں ذرا آواز سے

زندگی کیا جو بسر ہو چین سے
دل میں تھوڑی سی تمنا چاہئے:

بنی ہے جان پہ جانے کی تم نے خوب کہی
مرا یہ حال! پھر آنے کی تم نے خوب کہی

مجھے زمانہ بُرا کہہ رہا ہے کہنے دو
غرض ہے تم سے زمانے کی تم نے خوب کہی

پھر کہاں جلوۂ جاناں کی بہار اے موسیٰ
ایسے موقع پہ تمھیں نیند نہ آئی ہوتی

محبت رنگ دیجاتی ہے جب دل دل سے ملتا ہو
مگر مشکل تو یہ ہے دل بڑی مشکل سے ملتا ہے

اُن سے اظہارِ محبت جو کوئی کرتا ہے
دور سے اُس کو دکھا دیتے ہیں تربت میری

یہ کون زیرِ زمیں اس کو گدگداتا ہے
کہ مسکراتی ہوئی ہر کلی نکلتی ہے

رُکی رُکی جو چھری دستِ نازنیں میں رہی
تڑپ تڑپ کے تمنا دلِ حزیں میں رہی

دلچسپ ہو گئی ترے چلنے سے رہگزر
اُٹھ اُٹھ کے گردِ راہ لپٹتی ہے راہ سے

سب اپنا حال کہتے رہے چارہ ساز سے
میں تھا کہ محوِ لذتِ دردِ جگر رہا

انتخاب از جانِ سخن

ذرا ذرا سی شکایت پہ روٹھ جاتے ہیں
نیا نیا ہے ابھی شوق دلربائی کا

رہا اسیر تو شکوے رہے اسیری کے
رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہائی کا

کچھ اس ادا سے یار نے پوچھا مرا مزاج
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا

خوب انصاف تری انجمنِ ناز میں ہے
شمع کا رنگ جمے خون ہو پروانے کا

میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی
کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا

وعدہ کر کے اور بھی آفت میں ڈالا آپ نے
زندگی مشکل تھی اب مرنا بھی مشکل ہو گیا

رازداری کی ہے پابند مری مے نوشی،
ہو کے لبریز چھلکتا نہیں ساغر میرا

منتظر موسمِ گل کے ہیں ترے دیوانے
ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پر

یا خدا دردِ محبت میں اثر ہے کہ نہیں،
جس پہ مرتا ہوں اُسے میری خبر ہے کہ نہیں،

آپ سے آنکھ ملاؤں یہ مری طاقت ہے
دیکھتا یہ ہوں کہ اگلی سی نظر ہے کہ نہیں

مست کر دے مجھے ساقی مگر اس شرط کیساتھ
ہوش اتنا رہے باقی کہ تجھے یاد کروں،

ان شوخ حسینوں پہ جو آتی ہے جوانی،
تلوار بنا دیتی ہے ایک ایک ادا کو

دیر و کعبے کی زیارت تو فقط حیلہ ہے
جستجو تیری لئے پھرتی ہے گھر گھر مجھ کو

کرتا ہوں یاد شام سے ابروئے یار کو
خنجر سے کاٹتا ہوں شبِ انتظار کو

آنکھوں نے جلیل آج کیا مجھکو پشیماں
پہچان گئے لوگ محبت کی نظر کو

یہاں اُڑ گئی خاک اہلِ وفا کی
وہاں امتحانِ وفا ہو رہا ہے

سچ پوچھئے تو نالۂ بلبل ہے بے خطا
پھولوں میں ساری آگ لگائی صبا کی ہے

دل ہے عجیب گل چمنِ روزگار میں
رنگت تو پھول کی ہے مگر بو وفا کی ہے

اہلِ غرض کو منھ نہ لگاؤ بلا کے ہیں
یوسف کہیں گے تم کو پیمبر بنائیں گے

مجھے تمام زمانے کی آرزو کیوں ہو
بہت ہے میرے لئے ایک آرزو تیری

چمن کے پھول بھی تیرے ہی خوشہ چیں نکلے
کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں بو تیری

غرض کے آشنا ہیں ساقیا سب بزمِ عالم میں
جہاں شیشہ ہوا خالی جدا پیمانہ ہوتا ہے

حُسن دیکھا جو بتوں کا تو خدا یاد آیا
راہ کعبہ کی ملی ہے مجھے بتخانے سے

ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال
اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

ساقیا کیوں نہ ہوس ہو مجھے میخانے کی
دل ہے شیشہ کا مری آنکھ ہے پیمانے کی

آپ پہلو میں جو بیٹھیں تو سنبھل کر بیٹھیں
دلِ بیتاب کو عادت ہے مچل جانے کی

بے پئے کہتے ہیں سب رندِ سیہ کار مجھے
بیخودی تو نے کیا مفت میں بدنام مجھے

میں نہ سمجھا تھا کہ ہے اتنی گراں قیمت ہے
پارسائی ہوئی صدقے تو ملا جام مجھے

نسیم صبح سے کہہ دو کہ گُل شمع لحد کر دے
کوئی چھپ چھپ کے روتا ہے لپٹ کر میرے مدفن سے

آئینہ بھی یہ سمجھتا ہے کہ معشوق ہے تو
تیری تصویر کو سینے سے لگا رکھا ہے،

میری توبہ بھی کوئی توبہ ہے
جب بہار آئی توڑ ڈالی ہے

شمع کو تم اُٹھا دو خلوت سے
یہ ہمیشہ کی جلنے والی ہے

چھپنے والے تجھے خبر بھی ہے
نگہِ شوق پردہ در بھی ہے

ساقیا صحبتِ دیرینہ جو یاد آتی ہے
چشمِ تر صورتِ پیمانہ چھلک جاتی ہے

مجھے جس دم خیالِ نرگسِ مستانہ آتا ہے
بڑی مشکل سے قابو میں دلِ دیوانہ آتا ہے

حواس آئے ہوئے پھر کھو دئے لیلےٰ نے مجنوں کے
یہ کہنا تازیانہ تھا مرا دیوانہ آتا ہے

کوئی ساغر بکف ہے کوئی محوِ چشمِ ساقی ہے
ہمارے ہاتھ دیکھیں کونسا پیمانہ آتا ہے

مشیت جب یونہیں ٹھیری تو میری کیا خطا ناصح،
حرم کو ڈھونڈتا ہوں سامنے بتخانہ آتا ہے

درد سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی
ہائے کیا دن تھے طبیعت جب کہیں آئی نہ تھی

سچ کہا زاہد یہ تو نے زہرِ قاتل ہے شراب
ہم بھی کہتے تھے یہی جب تک بہار آئی نہ تھی

عجب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے
کلی کلی سے مجھے بوئے یار آتی ہے

کچھ اختیار کسی کا نہیں طبیعت پر
یہ جب یہ آتی ہے بے اختیار آتی ہے

بیاباں سے نکلنا اب ترے مجنوں کا مشکل ہے
یہ کانٹا بھی اُلجھ کر رہ گیا صحرا کے دامن سے

انتخاب از "روح سخن" (غیر مطبوعہ)

آرام گیا صبر گیا دل سے نکل کر
کمبخت تمنا بھی نکل جائے تو اچھا

اِس اتفاق کو فضلِ خدا سمجھ واعظ
کہ ہجو مے ترے لب پر تھی مجھکو ہوش نہ تھا

دکان مے پہ پہونچکر کھلی حقیقت حال
حیات بیچ رہا تھا وہ مے فروش نہ تھا

منحصر موسمِ گل پر نہیں سودا میرا
آگیا ذکر ترا اور میں دیوانہ ہوا

توبہ جس روز سے کی آکے سرِ چرخ جلیل
بجلیاں مجھ پہ گراتی ہیں گھٹائیں کیا کیا

قاصد چلا یہاں سے جو لیکر پیامِ شوق
کچھ کہتے کہتے میں کئی منزل نکل گیا

حقیقت میں پتہ دیتا ہے در پردہ محبت کا
جلیل اُن کا تمھارے نام پر خاموش ہو جانا

ملتی جلتی سی ہے قیامت سے شباہت لیکن
اک ذرا رنگ ہے گہرا شبِ تنہائی کا

جان دینے کے لئے لوگ مرے جاتے ہیں
ابتو قاتل کو بھی دعوے ہے مسیحائی کا

ضبط نالہ سے آج کام لیا
گرتی بجلی کو میں نے تھام لیا

پائے ساقی پہ توبہ لوٹ گئی،
ہاتھ میں اس ادا سے جام لیا،

منحصر تھا تری زلفوں کے سلجھ جانے پر
کسی شیرازۂ ہستی کا پریشاں ہونا

مرکے یاد آئے مزے دُنیا کے
گھر کو چھوڑا تھا کہ گھر یاد آیا

بیخودی کا ہے مرے یہ عالم
تیغ کو دیکھ کے سر یاد آیا

میرے آنے کی تو بندش ہے مگر
کیا کریں گے، میں اگر یاد آیا

ابر اُٹھا تھا بڑے دعوے سے
دیکھ کر دیدۂ تر لوٹ گیا

اے چرخ کتنے خاک سے پیدا ہوئے حسین
تو ایک آفتاب کو چمکا کے رہ گیا

ملا یا گلِ مراد نہ جھونکا نسیم کا
دامن میں ہر بہار میں پھیلا کے رہ گیا

کسی کا حُسن اگر بے نقاب ہو جاتا
نظامِ عالمِ ہستی خراب ہو جاتا

اگر میں ہوش میں ہوتا تو یہ طلسمِ جہاں
مری نگاہ میں بھولا سا خواب ہو جاتا

کون بلکیس غریقِ بحر ہوا — سر پٹکتی ہیں موجیں ساحل پر

آنکھوں کو چھوڑ جاؤں الٰہی میں کیا کروں — ہٹتی نہیں نظر رُخِ جاناں نہ چھوڑ کر

ہائے وہ درد آشنا تھا کس قدر — جس نے ڈالی ہے بنائے دردِ دل
آپ آئیں پوچھنے میرا مزاج — میں تصدق میں فدائے دردِ دل

محتسب سے میکشی کا ڈھنگ سیکھا چاہئے — مست ہے لیکن ذرا اس پر گماں ہوتا نہیں
نکہتِ گل کی پریشانی نہ پوچھو باغ میں، — اس طرح طائر کوئی بے آشیاں ہوتا نہیں،

اگر یہ سچ ہے تو مرنے پہ ناز ہے مجھ کو — تر آنسوؤں سے رہی انکی آستیں برسوں

پریاں ہیں سب یہ غنچہ و گل اے نسیمِ صبح — کچھ اُٹھ چکی ہیں کچھ ہیں ابھی خوابِ ناز میں

میں شمعِ بزم ہوں نہ چراغِ مزار ہوں — راتیں مگر گزرتی ہیں سوز و گداز میں

قاصد پیامِ شوق کو دینا بہت نہ طول — کہنا فقط یہ اُن سے کہ آنکھیں ترس گئیں
گزریں جو اس طرف سے حسینوں کی ٹکڑیاں — کچھ رو گئیں تو کچھ مرے رونے پہ ہنس گئیں
گم قافلے سے کون ہوا جس کے واسطے — جائیں نکل کے صورتِ بانگِ جرس گئیں

آکے دو دن کو فصلِ گل ساقی — مبتلا کر گئی گناہوں میں،
خضر کو ڈھونڈنے میں نکلا تھا — مل گئے میکدہ کی راہوں میں

تبسم تھا اس رنگ سے اُن کے لب پر — میں سمجھا کوئی جام چھلکا رہے ہیں
بہار ایک دم کی ہے کھلتا نہیں کچھ — یہ گل کھل رہے ہیں کہ مرجھا رہے ہیں
ہے آباد میرے تصور کی دُنیا — حسیں آرہے ہیں حسیں جا رہے ہیں

عدم کے دشت میں پایا گیا ہوں — کہاں سے میں کہاں لایا گیا ہوں
نفس کی طرح کوچے میں کسی کے — ہزاروں بار میں آیا گیا ہوں

سب باندھ چلے کب کے سرِ شاخ نشیمن — ہم ہیں کہ گلستاں کی ہوا دیکھ رہے ہیں

کس کا میں دیکھنے والا ہوں نہ پوچھو یہ کلیم — اک نظر میں مجھے سو طور نظر آتے ہیں
نہ اشارہ نہ کنایہ نہ تبسم نہ کلام، — پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں

ستم کرنے والے یہاں اور بھی ہیں — تہہِ آسماں آسماں اور بھی ہیں
نگاہیں تری دیکھ کر میں یہ سمجھا — سوا اس جہاں کے جہاں اور بھی ہیں

لاکھ دل مست ہو مستی کا عیاں راز نہ ہو — یہ وہ شیشہ ہے کہ ٹوٹے بھی تو آواز نہ ہو

اُس گرفتار کی پوچھو نہ تڑپ جسکے لئے
در قفس کا ہو کُھلا، طاقت پرواز نہ ہو

میں کسی سرزمیں کا قصد کروں
آسماں ساتھ ساتھ چلتا ہے

نہ وہ آئیں کہ راحت ہو نہ موت آئے کہ فرصت ہو
پڑی ہے جان جھگڑے میں نہ دم نکلے نہ غم نکلے

کیا کہوں مر مر کے جینے کا مزہ
اے خضر یہ زندگانی اور ہے

موسمِ گل میں حسینوں کا مرقع ہے چمن
جو کلی کھلتی ہے تصویر نظر آتی ہے

حال باقی نہ رہا کچھ ترے دیوانے میں
اب تو زنجیر ہی زنجیر نظر آتی ہے

ہوا گلستاں کی کھا کے دل کو قرار کچھ آچلا تھا لیکن
کسی کی پھر یاد تازہ کر دی گلوں کا منھ چوم کر صبا نے

فایدہ کیا ہوسِ دل کے بڑھانے سے جلیل
وہی نکلیں گے جو ارماں ہیں نکلنے والے

تھا شب کو جو سرور ان آنکھوں میں اب کہاں
آباد ہو کے میکدے ویران ہو گئے

غضب ہوتا تری صورت جو بے پردہ کہیں ہوتی
کہ تجھ پر جو نگہ پڑتی نگاہِ واپسیں ہوتی

سجودِ آستانِ یار سے سیری نہیں ہوتی
کئے جاتے جبیں سائی اگر باقی جبیں ہوتی

ٹپکتے ہیں شبِ غم دل کے ٹکڑے دیدۂ تر سے
سحر کو کیسے کیسے پھول چنتا ہوں میں بستر سے

الٰہی آگ برقِ طور نے کیسی لگائی تھی
نکلتے ہیں شرارے آج تک ایک ایک پتھر سے

نظر پڑتی ہے تم پر سب کی مجھکو رشک آتا ہے
چلو خلوت میں چل بیٹھیں نکلکر بزمِ محشر سے

پھولوں کی سیر کرکے میں دیوانہ ہو گیا
ہر گل پہ ہو رہا ہے کسی کا گماں مجھے

واماندگی سے پا نہ سکا قافلے کو میں
تھک تھک گئی پکار کے بانگِ درا مجھے

افسانہ طلب حسن ہے اسکا مجھے ڈر ہے
ظالم مری ہستی کو نہ افسانہ بنادے

پھر شوقِ تماشا لئے جاتا ہے کسی سمت
پھر ذوقِ طلب مجھکو تماشا نہ بنادے

ہوائے خُلد کہاں میکدہ کہاں ساقی
یہ آہِ سرد کسی مست نے بھری ہوگی

جو کی ہے توبہ تو پھر میکدے میں کیوں جائیں
کھنچی شراب صراحی بھری بھری ہوگی

کہوں کیا ماجرا اپنا حقیقت ہے عیاں میری
اُداسی حال ہے میرا خموشی ہے زباں میری

بچھڑ کر کارواں سے میں کبھی تنہا نہیں رہتا
رفیقِ راہ بنجاتی ہے گردِ کارواں میری

خوشی ہو جائے گی اُن کی اُنھیں کے نذر کرنے دے
اجل تو کیا کرے گی لیکے جانِ ناتواں میری

جب تک خلشِ درد تھی یک گونہ مزا تھا
جب سے مجھے آرام ہے آرام نہیں ہے

تم یاں سے گئے کیا مری دُنیا ہی بدل دی
وہ لطف نہیں وہ سحر و شام نہیں ہے

رُخ پہ قایم مری نظر نہ ہوئی، — دیدِ جاناں ہوئی مگر نہ ہوئی
سب شرابی مجھے کہیں تجھکو — شرم اے بیخودی نہیں آتی
ساقی کی چشمِ مست کا عالم نہ پوچھئے — اک اک نگاہ ہے کئی عالم لئے ہوئے
ادا ادا تری موجِ شراب ہوکے رہی — نگاہ مست سے دُنیا خراب ہوکے رہی
کسی میں تاب کہاں تھی کہ دیکھتا اُنکو — اُٹھی نقاب تو حیرت نقاب ہوکے رہی
جلیلؔ فصلِ بہاری کی دیکھئے تاثیر — گری جو بوند گھٹا سے شراب ہوکے رہی
تم نے آکر مزاج پوچھ لیا، — اب طبیعت کہاں سنبھلتی ہے
آتی نہیں اب دیر سے آوازِ جرس بھی — ہے کون جو آوارۂ منزل کی خبر لے
تو جو آیا جان آئی تو گیا دل بھی گیا، — اک خوشی آنے میں تیرے اک خوشی جانے میں ہے
بہاریں لٹا دیں جوانی لٹا دی — تمھارے لئے زندگانی لٹا دی
عجب حوصلہ ہم نے غنچے کا دیکھا — تبسم پہ ساری جوانی لٹا دی
آج تک دل کی آرزو ہے وہی — پھول مرجھا گیا ہے بو ہے وہی
آج ہے وہ بہار کا موسم، — پھول توڑوں تو ہاتھ جام آئے
رنگِ مستی کو انقلاب نہیں، — صبح آئے یہاں کہ شام آئے
مرغِ تصویر پہ رشک آئے نہ کیوں بلبل کو — نہ رہائی کا اسے غم نہ گرفتاری کا
مان لیتا ہوں تیرے وعدے کو — بھول جاتا ہوں میں کہ تو ہے وہی
دے رہے ہیں مے وہ اپنے ہاتھ سے — اب یہ شے انکار کے قابل نہیں
زمانہ ہے کہ گزرا جا رہا ہے، — یہ دریا ہے کہ بہتا جا رہا ہے
زمانے پر ہنسے کوئی کہ روئے — جو ہونا ہے وہ ہوتا جا رہا ہے
رواں ہے عمر اور انسان غافل، — مسافر ہے کہ سوتا جا رہا ہے
ہائے پھر چھیڑ دیا ذکرِ گلستاں تونے — خشک آنسو نہ ہوئے تھے مرے صیاد ابھی
سب دل کے داغ مٹ گئے اُس گل کو دیکھکر — قربان ایک پھول پہ سارا چمن ہوا
بجلی کی تانک جھانک سے تنگ آگئی ہے جان — ایسا نہ ہو کہ پھونکدوں خود آشیاں کو میں
مدت ہوئی ہے، سیرِ گلستاں کئے ہوئے — گل منتظر ہیں چاک گریباں کئے ہوئے
لیتے رہے قفس میں مزے آشیاں کے ہم — دامن کو اشکِ خوں سے گلستاں کئے ہوئے

جگر مرادآبادی

علی سکندر نام - جگر تخلص، وطن مرادآباد - سنہ ولادت ۱۸۹۰ء - آپ کے مورث اعلیٰ مولوی محمد سمیع دہلی کے باشندے تھے اور شاہجہاں کے اُستاد - لیکن کسی وجہ سے عتاب ہوا اور مرادآباد چلے آئے - آپ کے دادا حافظ محمد نور بھی شاعر تھے اور آپ کے والد مولوی علی نظر بھی وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے -

انگریزی میں انٹرنس تک تعلیم پائی اور شاعری میں پہلے داغ - اور پھر امیر اللہ تسلیم کا تلمذ حاصل کیا - اس دور کی شاعری کے نمونے داغ جگر میں پائے جاتے ہیں، دوسرا دور شاعری کا وہ ہے جو اصغر گونڈوی کے زیر اثر شروع ہوا اور شعلۂ طور اسی دور کی یادگار ہے - اب کچھ زمانہ سے مستقلاً گونڈہ میں قیام ہے -

---

اللہ اللہ رے ہستی شاعر
قلب غنچے کا آنکھ شبنم کی

ترے بیان میں قاصد کچھ اشتباہ نہیں
مُجز ایں قدر، کہ یہ فرمودۂ نگاہ نہیں

وہ میری طرف بڑھادے گلچیں،
جن پھولوں میں رنگ ہے نہ بو ہے

بیٹھے ہیں بزم دوست میں گم شدگان حسن دوست
عشق ہے اور طلب نہیں، نغمہ ہے اور صدا نہیں

ازل ہی سے چمن بندِ محبت
یہی نیرنگیاں دکھلا رہا ہے

کلی کوئی جہاں پر کھل رہی ہے
وہیں اک پھول بھی مرجھا رہا ہے

اربابِ چمن سے نہیں پوچھو یہ چمن سے
کہتے ہیں کسے نکہتِ برباد کا عالم

سحر ہونے کو ہے بیدار شبنم ہوتی جاتی ہے
خوشی منجملۂ اسبابِ ماتم ہوتی جاتی ہے

اپنے کو میں آپ پوجتا ہوں،
آئینۂ حُسن روبرو ہے،

جو ساز کہ خود نغمۂ حرماں تھا اُسی کو
اندیشۂ مضراب ہے معلوم نہیں کیوں

ہر اک صورت ہر اک تصویر مبہم ہوتی جاتی ہے
الٰہی کیا مری دیوانگی کم ہوتی جاتی ہے

ترے بغیر تو جینا روا نہیں لیکن،
میں کیا کروں جو ترا غم ہی جاں نواز رہے

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب اُن کا

آنکھوں کا تھا قصور نہ دل کا قصور تھا
آیا جو میرے سامنے میرا غرور تھا

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
محبت کا زمانہ آ رہا ہے

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی مجھے پھر بھی غیر عزیز ہے
جسے خاکِ پا تری چھو گئی وہ بُرا بھی ہو تو بُرا نہیں

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

جو ہیں خاص چشم و چراغِ محبت
وہ آنسو نہیں ہیں نظر آنے والے

کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی
بجھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی

جب تک شباب عشق مکمل شباب ہے
پانی بھی ہے شراب ہوا بھی شراب ہے

وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج
دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے

صبا یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

اُنھیں کے دل سے کوئی اسکی عظمتیں پوچھے
وہ ایک دل جسے سب کچھ لٹا کے لوٹ لیا

اور تو کچھ کمی نہیں، آپ کے اقتدار میں،
آپ مجھے بھلا سکیں یہ نہیں اختیار میں

فتنۂ روزگار میں امن ہے کیا قرار کیا
حاصلِ زیست غم سہی غم کا بھی اعتبار کیا

جیسے حسن کی دیوی جھانکتی ہے چلمن سے
نیم وا سی آنکھوں میں اُف وہ کیفِ خواب اُن کا

اک لفافۂ رنگیں ایک پرچۂ سادہ
اے دلِ سکون دشمن۔ لے ترا جواب آیا

کیوں آتشِ گل میرے نشیمن کو جلائے
تنکوں میں ہے خود برق چمن زاد کا عالم

جوانی حاصلِ حُسنِ دو عالم ہوتی جاتی ہے
ارے توبہ قیامت قدِ آدم ہوتی جاتی ہے

جسے رونق ترے قدموں نے دیکر چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہو۔ اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی،

اُن لبوں کی جاں نوازی دیکھنا
منھ سے بول اُٹھنے کو ہے جامِ شراب

دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں،
کچھ خوشی بھی ہے، کچھ ملال بھی ہے

آ- کہ- تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

کوئے جاناں کی ہوا تک سے بھی تھراتا ہوں میں
کیا کروں بے اختیارانہ چلا جاتا ہوں میں

میری ہستی شوقِ پیہم، میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں

اُن کے بہلائے بھی نہ بہلا دل،
رائگاں سعیِ التفات گئی،

ترکِ اُلفت- بہت بجا ناصح،
لیکن اُس تک- اگر یہ بات گئی،

دن کا کیا ذکر تیرہ بختوں میں،
ایک رات آئی، ایک رات گئی،

سینۂ سنے پہ جو گزرتی ہے
وہ لبِ سنے نواز کیا جانے،

عبرتِ بندگی و ناچاری،
کوئی بندہ نواز کیا جانے،

دل تو سینے ہی میں رہتا ہے مگر اُن کے حضور
جیسے اب جاتا ہے دل سینے سے اب جاتا ہے دل

اس عشق کی تلافی مافات دیکھنا
رونے کی حسرتیں ہیں جب آنسو نہیں رہے

ہم نہ مرتے ترے تغافل سے
پرسشِ بے حساب نے مارا

ہائے یہ مجبوریاں محرومیاں ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے، تم کیا کرو ہم کیا کریں

کس طرف جاؤں کدھر دیکھوں کسے آواز دوں
اے ہجومِ نامرادی جی بہت گھبرائے ہے

ہم سے پوچھو تو عشق کی بھی نگاہ
سخت کافر نگاہ ہوتی ہے،

وہ بھی ہے اک مقامِ عشق جہاں،
ہر تمنا گناہ ہوتی ہے،

کہاں کے حُسن و محبت کہاں کے مہر و وفا
بس ایک سحرِ جوانی تھا اور زمانا تھا،

الٰہی ترکِ محبت بھی کیا محبت ہے
بھلاتے ہیں اُنھیں وہ یاد آئے جاتے ہیں

حُسن کی معیّت میں اس طرح شباب آیا
جیسے کچّی نیند اُٹھ کر کوئی مست خواب آیا

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

دریا کی زندگی پر صدقے ہزار جانیں،
مجھ کو نہیں گوارا ساحل کی موت مرنا

میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا
اس سوال و جواب نے مارا

دیکھا گیا نہ یہ بھی صیاد و باغباں سے
اک شاخِ گل تھی لپٹی اک شاخِ آشیاں سے

جو خود نہ زندگی ہو نہ پیغامِ زندگی
وہ حُسن قہر ہے، وہ محبت عذاب ہے

زمانے کے ہم دوش و ہمراز کب تک
زمانے کو پیچھے ہٹاتا چلا جا

دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن
کشتی بھی تہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں

دیرِ تاثیرِ محبت - کا تماشا دیکھیں
اب وہ آئینے میں رنگِ رخِ زیبا دیکھیں

ہر حقیقت کو بہ اندازِ تماشا دیکھا
خوب دیکھا ترے جلووں کو مگر کیا دیکھا

زمانہ گرمِ رفتارِ ترقی ہوتا جاتا ہے
مگر اک چشمِ شاعر ہے کہ پُرنم ہوتی جاتی ہے

ساون کی رین، اندھیری تنہائیوں کا عالم
بھولے ہوئے فسانے سب یاد آ رہے ہیں

جو پڑی دل پہ سہہ گئے لیکن
ایک نازک سی بات نے مارا

شکن کاش پڑ جائے اپنی جبیں پر
پشیماں بہت ہیں ستم ڈھانے والے

سراپا محبت بنے جا رہے ہیں
سلامت رہیں اُن کو بہکانے والے

دل دھڑکتے ہی پھر گئی وہ نظر
لب تک آئی نہ تھی کہ بات گئی

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن
اک مسیحا نفس کی بات گئی

شکرِ شباب و یادِ یار درد فراق و انتظار
آنکھ کھلی سُلا دیا، آنکھ لگی جگا دیا،

شوق نے بیخودی میں جب دستِ طلب بڑھا دیا
عبرتِ عشق نے وہیں پہلو دل دبا دیا،

حسن ہے حسنِ بےاماں، ضد نہ کرائے غمِ نہاں
پھر یہ نگاہ دل کہاں پردہ اگر اُٹھا دیا

خیر ہو اے نسیمِ ناز، پھیل نہ جائے بوئے راز
تو نے یہ کیا غضب کیا، غنچۂ دل کھلا دیا

عشق فنا کا نام ہے۔ عشق میں زندگی نہ دیکھ
جلوۂ آفتاب بن، ذرے میں روشنی نہ دیکھ

ہو کے رہے گا ہم نوا وہ بھی ترے ہی ساتھ ساتھ
نغمۂ شوق گائے جا حسن کی برہمی نہ دیکھ

سوزِ تمام چاہیے رنگِ دوام چاہیئے
شمع سرِ مزار ہو، شمع سرِ مزار کیا

بھول جاؤں کہ مرا ذوقِ محبت کیا ہو
اس طرح تو نہ مری حوصلہ افزائی ہو

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہو

ستم عشق میں آپ آساں نہ سمجھیں
تڑپ جائیے گا جو تڑپائیے گا،

"ترا جذبۂ عشق ہے بےحقیقت"
ذرا پھر تو ارشاد فرمائیے گا

محبت میں ہم تو جیے ہیں جئیں گے
وہ ہوں گے کوئی اور مر جانے والے

یہ تو نہیں کہ عرضِ غم درخورِ اعتنا نہیں
عالمِ حسن کو مگر فرصتِ ماسوا نہیں

کچھ جو پشیمانِ جفا ہو گئے
اور وہ گھبرا کے خفا ہو گئے

دیرینہ دوستیِ خوشِ انفاس کا لحاظ
اے محتسب نزاکتِ احساس کا لحاظ

اُن کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی،
جس طرف دیکھا کیا۔ دیکھا کیا

نظر سے اُن کی، پہلی ہی نظر یوں مل گئی اپنی،
کہ جیسے مدتوں سے تھی کسی سے دوستی اپنی

وہ ان کی بےرُخی وہ بےنیازانہ ہنسی اپنی
بھری محفل تھی لیکن بات بگڑی بن گئی اپنی

پھول وہی چمن وہی، فرق نظر نظر کا ہے
عہدِ بہار میں تھا کیا دورِ خزاں میں کیا نہیں

رہ گیا ہے اب تو بس اتنا ہی ربط اک شوخ سے
سامنا جس وقت ہو جاتا ہے بھر آتا ہے دل

تو نے جس اشک پر نظر ڈالی
جوش کھا کر وہی شراب ہوا

شاعر ہے محوِ فطرت جذبات چھا رہے ہیں
پیغام آ رہے ہیں پیغام جا رہے ہیں

جب مِلی آنکھ ہوش کھو بیٹھے
کتنے حاضر جواب ہیں ہم لوگ

اللہ تجھے رکھے محفوظ حوادث سے
اے کفر ترے دم تک آرائشِ ایماں ہے

پیتا بغیرِ اذن یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

کدھر سے برق چمکتی ہے، دیکھیں اے واعظ
میں اپنا ساغر اُٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا

جدھر کو مستیِ دریا نے رخ کیا اپنا
تڑپ کے موج اُٹھی جھوم کر حباب اُٹھا

مجھے اُٹھانے کو آیا ہے واعظِ ناداں
جو اُٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اُٹھا

کہاں فراغ تلوّن مزاجیوں سے تری
یہ دردِ ہجر ہی اے کاش جاوداں ہوتا

بہار توبہ شکن چشمِ مستِ یار مُصر
میں آج پی جو نہ لیتا وہ بدگماں ہوتا

ہم سے نظر پھیر لی اُس شوخ نے
ہم بھی ہیں انسان خفا ہو گئے

عشق ہی تنہا نہیں آشفتہ سر میرے لئے
حسن بھی بیتاب ہے اور کس قدر میرے لئے

اب نظر کو کہیں قرار نہیں،
کاوشِ انتخاب نے مارا

کوئی حسیں حسیں ہی ٹھہرتا نہیں جگر
باز آئے اس بلندیِ ذوقِ نظر سے ہم

ذروں سے باتیں کرتے ہیں دیوار و در سے ہم
مایوس کس قدر ہیں، تری رہگزر سے ہم

اتنی سی بات پر ہے بس اک جنگِ زرگری
پہلے اُدھر سے بڑھتے ہیں وہ یا اِدھر سے ہم

لازم خودی کا ہوش بھی ہے بے خودی کے ساتھ
کس کی اُسے خبر، جسے اپنی خبر نہ ہو

ممکن نہیں کہ جذبۂ دل کارگر نہ ہو،
یہ اور بات ہے تمھیں اب تک خبر نہ ہو

وہ بدگمانیاں ہیں نہ وہ سرگرانیاں
اتنی بھی دل کی دل کو الٰہی خبر نہ ہو

جسے میں بھی خود نہ بتا سکوں، مرا راز دل ہے وہ رازِ دل
جسے غیرِ دوست سمجھ سکے، مرے ساز میں وہ صدا نہیں

عرضِ شوق پر میری، پہلے کچھ عتاب اُن کا
خاص اک ادا کے ساتھ اُف وہ پھر حجاب اُنکا

نہ ہو جس میں شامل ستم کا بھی پہلو
مرے حق میں وہ مہربانی نہیں ہے

صیاد و باغباں کی توجہ نہیں تو پھر
مجھ کو حصولِ خار و خسِ آشیاں سے کیا،

یہ عالم ہے اب خشک آنکھوں میں اپنی
کہ طوفاں ہے برپا روانی نہیں ہے

حدودِ کوئے محبوب ہیں، وہیں سے شروع
جہاں سے پڑنے لگیں پاؤں ڈگمگائے ہوئے

لے کے خط اُن کا کیا ضبط بہت کچھ لیکن
تھرتھرائے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا

ملاکے آنکھ نہ محرومِ ناز رہنے دے
تجھے قسم جو مجھے پاکباز رہنے دے،

اب تجھے میری محبت کا یقیں ہو کہ نہ ہو
میں نہ کھاؤں گا ترے دردِ محبت کی قسم

جب سے اُس نے پھیر لیں نظریں رنگ، تباہی آہ نہ پوچھ
سینہ خالی - آنکھیں ویراں - دل کی حالت کیا کہئے

خطا معاف، کسی اور کا تو ذکر ہی کیا،
نیاز مند ترے تجھ سے بے نیاز رہے

مانوسِ اعتبارِ کرم کیوں کیا مجھے
اب ہر خطائے شوق اُسی کا جواب ہے

خجل جس سے ہونا پڑے دل ہی دل میں
وہ کچھ اور ہے - مہربانی نہیں ہے

ترے حسنِ حیات افروز کو دیکھا ہے جس دن سے
بہت مجھ کو عزیز اُس دن سے اپنی زندگانی ہے

خوشا بیداد خونِ حسرتِ بیداد ہوتا ہے
ستم ایجاد کرتے ہو کرم ایجاد ہوتا ہے

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی
سناتا جا رہا ہے، جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانا ہے
رونے کو نہیں کوئی - ہنسنے کو زمانا ہے

جو مسرتوں میں خلش نہیں جو اذیتوں میں مزا نہیں
ترے حسن کا بھی قصور ہے مرے عشق ہی کی خطا نہیں

مرا ذوق بھی، مرا شوق بھی ہے بلند سطحِ عوام سے
ترا ہجر بھی، ترا وصل بھی، مرے دردِ دل کی دوا نہیں

چپ ہیں وہ یوں سن کے مری عرضِ شوق
جیسے کہ سچ مچ ہی خفا ہو گئے

کہئے حالِ دل لیکن - دیکھئے کن آنکھوں سے
ہر سکوں کے پردے میں - حشرِ اضطراب اُن کا

اللہ رے اس گلشنِ ایجاد کا عالم
جو صید کا عالم وہی صیاد کا عالم

تصور رفتہ رفتہ اک سراپا بنتا جاتا ہے
وہ اک شے جو مجھی میں ہو مجسم ہوتی جاتی ہے

کرے نہ کام جو بلبل کا نالۂ خونیں
نہ غنچے نیند سے چونکیں، نہ رنگ و بو آئے

خبر نہیں مجھے، میں کیا ہوں آرزو کیا ہو
کسی نے جب سے یہ سمجھا دیا کہ تو کیا ہے

غنچۂ و نسرین و گل انجم و خورشید و ماہ
یہ بھی مری رہ گزر وہ بھی مری گردِ راہ

کوچۂ عشق میں نکل آیا
جس کو خانہ خراب ہونا تھا

لاکھوں میں انتخاب کے قابل بنا دیا
جس دل کو تم نے دیکھ لیا دل بنا دیا

اُف رنگِ رخِ بانیِ بیداد کا عالم
جیسے کسی مظلوم کی فریاد کا عالم

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی
جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں،

چمن سوز گلشن کی گل کاریاں ہیں
یہ کس سوختہ دل کی چنگاریاں ہیں،

میرے جنونِ عشق کی کیوں نہ ہو عاقبت خراب
مجھ کو ہنسا ہنسا کے آج اُن کو رُلا رُلا دیا،

ہمیں کیوں اب کوئی سمجھائے دل اپنا خوشی اپنی
گریباں اپنا، ہاتھ اپنے جنوں اپنا ہنسی اپنی،

اُن کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی
جس طرف دیکھا کیا، دیکھا کیا،

یہ تیرِ ناز نیں تو شوق سے چلائے جا
خیالِ خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے

لٹا دے دولتِ کونین اور میرے لئے
بس اک تبسمِ عاجز نواز رہنے دے

حاصلِ صد عرضِ غم، مایۂ صد عرضِ شوق،
اک مترنم سکوت، اک متبسم نگاہ،

مانا غرورِ عشق بھی اک چیز ہے مگر
اتنے بھی دور، دور، ترے آستاں سے کیا

ناصح فسانہ اپنا، ہنسی میں اُڑا گیا
خوش فکر تھا کہ صاف یہ پہلو بچا گیا،

یہ فریبِ جلوہ ہے سربسر مجھے ڈر یہ ہے دلِ بےخبر
کہیں جم نہ جائے تری نظر انھیں چند نقش و نگار پر

کبھی شاخ و سبزۂ و برگ پر کبھی غنچۂ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصلِ بہار پر

ان کی وہ آمد آمد اپنا یہاں یہ عالم
اک رنگ آ رہا ہے، اک رنگ جا رہا ہے

دل سے خطا ہوئی تو، اب دل ہے اور میں ہوں
نازک معاملہ ہے، تم فیصلہ نہ کرنا!

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

وہی قیامت ہے قدِ بالا وہی ہے صورت وہی سراپا
لبوں کو جنبش، نگہ کو لرزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

کرشمے ذات و صفات کے ہیں جمالِ قدرت دکھا رہے ہیں
کہ ہر تصور سے دور رہ کر وہ ہر تصور میں آ رہے ہیں

لگا دے آگ او برقِ تجلّی دیکھتی کیا ہے،
نگاہِ شوق ظالم نارسا یوں بھی ہے اور یوں بھی

آج کچھ اپنا پتا ملتا نہیں،
میں کہاں ہوں اور نگاہِ باریاب

یوں تو پیاسے ہیں سبزہ و گل بھی
کس نے دیکھی ہے پیاس شبنم کی

حسن آیا تھا خود منانے کو
سو توجہ ہی عشق نے کم کی،

یہی جی چاہتا ہے چھیڑتے ہی چھیڑتے رہئے
بہت دلکش ادائے حسن برہم ہوتی جاتی ہے

مجھے کیا پڑی ہے ترے در سے اُٹھوں
ٹھہرنے جو دے اضطرابِ محبت

یہ کیا ہے، کہ پہلو میں وہ بھی ہیں لیکن،
شبِ ماہ پھر بھی سہانی نہیں ہے

عجب انقلابِ زمانہ ہے، مرا مختصر سا فسانہ ہے
یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوئے یار پر

حشر کے دن وہ گنہگار نہ بخشا جائے
جس نے دیکھا تری آنکھوں کا پشیماں ہونا

دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا

امیدِ عفو کو بھی میں نے اب دل سے مٹا ڈالا
یہ تھا اک بدنما دھبا مرے دامانِ عصیاں کا،

بجھتی ہی نہیں اب کسی ساغر سے مری پیاس
شاید مرا مقصد ہی مری تشنہ لبی ہے

قلزم آشامی یک قطرۂ بیتاب کو دیکھ
گم کئے دیتی ہے میری ہی محبت مجھ کو

چاندنی ہے ہوا ہے کیا کہئے
مفلسی کیا بلا ہے کیا کہئے

یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حسن
جب دیکھئے کچھ نیند سی آنکھوں میں بھری ہے

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

نکہتِ گل کا بھی دماغ نہیں
کتنا آزردۂ بہار ہوں میں

ارباب چمن سے نہیں، پوچھو یہ چمن سے
کہتے ہیں کسے نکہتِ برباد کا عالم

مجھ ناتوانِ عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا
دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا

ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا
منھ سے بول اُٹھنے کو ہے جامِ شراب

پھر وہ ہم سے خفا ہے کیا کہئے
زندگی بے حیا ہے کیا کہئے

کیا بتائیں عشق ظالم کیا قیامت ڈھائے ہے
یہ سمجھ لو جیسے دل سینے سے نکلا جائے ہے

حرم و دیر میں رندوں کا ٹھکانا ہی نہ تھا
وہ تو یہ کہئے، اماں مل گئی میخانے میں

وہ بھی نکلی ایک شعاعِ برقِ حُسن
میں جسے اپنی نظر سمجھا کیا

نویدِ بخششِ عصیاں سے شرمسار نہ کر
گناہ گار کو یارب گناہ گار نہ کر

جب ملی آنکھ ہوش کھو بیٹھے
کتنے حاضر جواب ہیں ہم لوگ

ناز کرتی ہے خانہ ویرانی
ایسے خانہ خراب ہیں ہم لوگ

اُس سے بھی شوخ تر ہیں اس شوخ کی ادائیں
کر جائیں کام اپنا لیکن نظر نہ آئیں

جنونِ محبت یہاں تک تو پہونچا
کہ ترکِ محبت کیا چاہتا ہوں

محوِ تسبیح تو سب ہیں مگر ادراک کہاں
زندگی خود ہی عبادت ہے مگر ہوش نہیں

حُسن کی سحر کاریاں عشق کے دل سے پوچھئے
وصل کبھی ہے ہجر سا، ہجر کبھی وصال سا

حُسن کی شانیں تھیں جتنی سب نمایاں ہو گئیں
جو ترے رخ سے بچیں رنگِ گلستاں ہو گئیں

فلسفۂ مذہب

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت عہ رعایتی ۱۲ار محصول علاوہ۔ منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

جوشؔ ملیح آبادی

نام شبیر حسن خاں ۔ جوشؔ تخلص ۔ ولادت ۱۸۹۶ء آپ کے بزرگ کابل سے آئے اور عرصہ تک قائم گنج ضلع فرخ آباد میں قیام کیا ۔ پھر ملیح آباد آ گئے ۔ اکثر افراد اس خاندان کے سلطنت اودھ میں اعلےٰ عہدوں پر مامور رہے آپ کے جدِ امجد نواب فقیر محمد خاں، آپ کے دادا نواب محمد احمد خاں اور آپ کے والد نواب بشیر الدین خاں سب کے سب شاعر تھے ۔

جوشؔ کی شاعری بارہ تیرہ سال کی عمر سے شروع ہو گئی تھی ۔ ابتدا میں کچھ دنوں عزیزؔ لکھنوی سے اصلاح لی اور پھر خود اپنی طبیعت کی رہنمائی میں ترقی کی ۔ آپ کے کلام کے کئی مجموعے شایع ہو گئے ہیں ۔ فی الحال لکھنؤ میں قیام ہے

صبح، بالیں پہ یہ کہتا ہوا غمخوار آیا
اُٹھ، کہ فریاد رسِ عاشقِ بیمار آیا

للہ الحمد کہ گلزار میں ہنگامِ صبوح
علم آزادیٔ مرغانِ گرفتار آیا

اے نظر! شکر بجا لا کہ کھلی زلفِ دراز
اے صدف! آنکھ اُٹھا، ابرِ گہربار آیا

خوش ہو اے گوش! کہ جبریلِ ترنم چہکا
مژدہ اے چشم! کہ پیغمبرِ انوار آیا

اے حسن! اگر عشق خریدار نہ ہوتا
یہ غلغلۂ گرمیِ بازار نہ ہوتا

میں آہ نہ بھرتا تو ترا لعلِ نگاریں
گل بیز و گل افشاں و گہربار نہ ہوتا

صد شکر کہ پھر زیست کا ساماں نظر آیا
پھر در پہ کوئی فتنۂ دوراں نظر آیا

پھر کاکلِ ژولیدہ سے جھلکا رخِ رنگیں
پھر ابر کے سائے میں گلستاں نظر آیا

اب تک نہ خبر تھی مجھے اُجڑے ہوئے گھر کی
تم آئے تو گھر بے سر و ساماں نظر آیا

محفلِ عشق میں وہ نازشِ دوراں آیا
اے گدا خواب سے بیدار کہ سلطاں آیا

دور اے زہد! کہ وہ زہد شکن آ پہونچا
رخصت، ایماں! کہ وہ غارتگرِ ایماں آیا

کج کلاہی کا سرِ و برگ مبارک اے جوشؔ
سر پہ پیامِ شکنِ طرۂ جاناں آیا

گزر رہا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا، چراغِ مجلسِ روحانیاں جلاتا جا
اُٹھا کے نازسے شب آفریں نگاہوں کو کسی کی سوئی ہوئی رُوح کو جگاتا جا،
اُٹھا کے عارضِ گلگوں سے دو گھڑی کو نقاب نظر سے ارض و سما کا حجاب اُٹھاتا جا
اگر یہ لطف گوارا نہیں تو مستِ خرام! جبینِ جوشؔ پہ ٹھوکر ہی اک لگاتا جا

ارض و سما کو ساغر و پیمانہ کر دیا رندوں نے کائنات کو میخانہ کر دیا
کچھ روز تک تو نازشِ فرزانگی رہی آخر ہجومِ عقل نے دیوانہ کر دیا
دنیا نے ہر فسانہ "حقیقت" بنا دیا ہم نے حقیقتوں کو بھی "افسانہ" کر دیا
آواز دو کہ جنسِ دو عالم کو جوشؔ نے قربانِ یک تبسّمِ جانانہ کر دیا

جب دل نے مجھکو شعلہ بداماں بنا دیا میں نے ہر ایک خار کو بُستاں بنا دیا
زلفوں کی ہر گرہ کو عطا کی متاعِ دل ابرو کی ہر شکن کو رگِ جاں بنا دیا
خالِ سیہ کو بخشش کے مُہرِ پیمبری زلفوں کی موجِ کفر کو ایماں بنا دیا
کج کر کلاہِ فخر کو تیرے شباب کو میں نے خدائے عالمِ امکاں بنا دیا
لیکن بہ ایں ہمہ ترا احساں ہے جوشؔ پر دل کو دسنئے وہ داغ کہ انساں بنا دیا

حرم ہو، مدرسہ ہو، دیر ہو، مسجد کہ میخانہ یہاں تو حسرتِ جلوے کی تمنا ہے کہیں آ جا
بڑے دعوے ہیں اہلِ انجمن کو صبر و تمکیں کے کبھی جلوت میں بھی اے فتنۂ خلوت نشیں آ جا

چلا ہے سوئے حرم، دل سے ساز کرتا جا طوافِ کعبۂ حسنِ مجاز کرتا جا
فراغِ روزِ مسرت کے ڈھونڈنے والے شبوں کو محرمِ سوز و گداز کرتا جا
چلا ہے خدمتِ یارِ درست پیماں میں پرستشِ صنمِ حیلہ ساز کرتا جا

نہ جانے رات کو کیا میکدے میں مشغلہ تھا کہ ہر نفس میں قیامت کا جوش و ولولہ تھا
زباں پر آئیں تو ہر حرف سے لہو ٹپکے ہر ایک سانس میں ان ولولوں کا قافلہ تھا
بساطِ خاک سے تا اوجِ ثابت و سیار شمیمِ کاکلِ عنبر فشاں کا سلسلہ تھا

دوربینی و جوانی، یہ تماشا کیسا؟ عیشِ امروز کے طوفان میں فردا کیسا
رامش و رنگ کی گونجی ہوئی آوازوں میں قصۂ جنت و افسانۂ عقبےٰ کیسا.
جس شبِ ماہ میں ہو بربط و فرشِ سنجاب اُس شبِ ماہ میں تسبیح و مصلےٰ کیسا
جوشؔ، باغی ہے مشیت کا جوانِ صالح موسمِ کفر میں اسلام کا دعوےٰ کیسا

ادھر بھی بادِ صبا! آ، بہار کی سوگند
شمیم طرۂ گیسوئے یار کی سوگند
چھڑا دو رنگیِ امید و بیم سے دل کو
طلسمِ گردشِ لیل و نہار کی سوگند
مرے دماغ پہ بھی ڈال پرتوِ محبوب
تجھے شعاعِ سرِ کوہسار کی سوگند
وفا کے دُکھتے ہوئے پہلوؤں کو دے آرام
کنارِ یار و لبِ جوئبار کی سوگند
سُنا فسانۂ رفتارِ دل فروزِ نگار
جواں خرامیِ ابرِ بہار کی سوگند
بتا، بکھرتی ہے کس طرح زلف شانوں پر؟
نزولِ رحمتِ پروردگار کی سوگند
ٹھہر ٹھہر کے سنا داستانِ عشوہ و ناز
نزاکتِ دلِ امیدوار کی سوگند
سُنا دے جوشؔ کو بھی نغمہائے لعلِ نگار
خروشِ آمدِ فصلِ بہار کی سوگند

آ، اور جہاں کو غرقِ لبِ نوش خند کر
آوازۂ فسونِ جوانی بلند کر،
سنتا ہوں دردِ عشق ہے ہر درد کی دوا
آ، اور میرے دردِ جگر کو دوچند کر
اے خواجہ! زندگی میں اسیری ہے ناگزیر
دل کو اسیرِ کاکلِ مشکیں کمند کر
آیا ہے جوشؔ تحفۂ داغِ جگر لئے
مرضی تری پسند نہ کر یا پسند کر!

اُٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر
گہر پاشیاں کر، زر افشانیاں کر
وہ چہکے عنادل، وہ سنکیں ہوائیں
گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر
سکوں پاؤں چومے وہ ہلچل مچا دے
خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر
عَلم کھول کر جوشؔ بدمستیوں کے
جہاں داریاں کر، جہاں بانیاں کر

شیخ اور خلشِ بندگی و زحمتِ پرہیز
میں اور مئے دیرینہ و معشوقۂ نوخیز
کہسار ہیں۔ تیشے کی صدا گونج رہی ہے
افسوس ہے اے زمزمۂ عشرتِ پرویز
اے گیسوئے شبرنگ! وہی نکہتِ فردوس
اے نرگسِ مخمور! وہی ساغرِ لبریز

پھر مہرباں وہ خسروِ خوباں ہے آجکل
پھر دستِ شوق و دامنِ جاناں ہے آجکل
ہر ذرۂ حقیر ہے فردوسِ رنگ و بو
ہر دشتِ بے گیاہ گلستاں ہے آجکل
ہر فکر، پھر ہے فکرِ الٰہی سے ہم عناں
ہر عزم پھر ارادۂ یزداں ہے آجکل

پھر ابرِ تیرہ اُٹھا، پھر چلی نسیمِ شمال
کدھر ہے ساقیِ جادو نگاہ و زہرہ جمال
مچل رہی ہے بلندی پہ موجِ آبِ بقا
دمک رہی ہے گلابی میں آتشِ سیال
فضا ہے پرتوِ ابرِ سیہ سے رنگا رنگ
صبا ہے دولتِ بوئے چمن سے مالا مال

وہ جوشؔ سوئے چمن جھومتا ہوا آیا
اُٹھ اے زمان و مکاں، اُٹھ برائے استقبال

زلفِ شکیب و صبر پریشاں ہے آجکل
پھر اضطراب سلسلہ جنباں ہے آجکل

پھر عاشقی کے روبہ ترقی ہیں ولولے
پھر سعیِ عقل سر بگریباں ہے آجکل

وہ سجدہ جس کے واسطے فرشِ حرم ہے ننگ
پھر آستانِ یار میں غلطاں ہے آجکل

اللہ رے گدازِ محبت کے معجزے
کافر تھا جو دماغ مسلماں ہے آجکل

وہ جان، جس پہ مایۂ کون و مکاں نثار
پھر نذرِ یک تبسمِ جاناں ہے آجکل

پھر آشنائے لذتِ دردِ جگر ہیں ہم
پھر محرمِ کشاکشِ ہر خیر و شر ہیں ہم

پھر عشق کی نظر میں ہے معشوقیت کا ناز
پھر حسنِ دل نواز سے شیر و شکر ہیں ہم

جینے کے اشتیاق سے ہے پھر رمیدگی
پھر سینۂ حیات میں عزمِ سفر ہیں ہم

ہشیار باش، ظلمتِ غمخانۂ حیات
پھر مرکزِ تجلیِ شمس و قمر ہیں ہم

کس زعم میں ہے اے شبِ دیجورِ زندگی؟
پھر رازدارِ نورِ طلوعِ سحر ہیں ہم

پھر زندگی ہے غم کی امانت لئے ہوئے
ہر دولتِ نشاط سے پھر بہرہ ور ہیں ہم

آنکھوں میں نورِ مصحفِ جاناں لئے ہوئے
پھر کردگارِ عشق کے پیغامبر ہیں ہم

کھلتے نہیں ہیں جوشؔ، دماغوں پہ دل کے راز
بالاتر از رسائیِ نقد و نظر ہیں ہم،

نہ جادو، نہ افسوں گری چاہتا ہوں
فقط حسن سے دلبری چاہتا ہوں،

مزاجِ تمنائے خود دار توبہ
عبادت میں بھی داوری چاہتا ہوں

جو "پیغمبری" میں بھی دشواریاں ہوں
تو ہنگامۂ کافری چاہتا ہوں

دوستو! وقت ہے، پھر زخمِ جگر تازہ کریں
پردہ جنبش میں ہے، پھر آؤ نظر تازہ کریں

تا کجا نالۂ غربت، کہ چلی بادِ شمال
دل میں پھر زمزمۂ عزمِ سفر تازہ کریں

آؤ پھر جلوۂ جاناں پہ لٹا دیں کونین
شغلِ پارینۂ اربابِ نظر تازہ کریں

مری مجال، تیری بزم، اور لن ترانیاں!
میں نقشِ پائے رہرواں، تو افسرِ جہانیاں

شدید بدگمانیوں پہ حسنِ ظن ہے یا رب
عمیق حسنِ ظن میں ہیں ہزار بدگمانیاں،

عجیب طرفہ راز ہیں، مری شبوں کے راز بھی
جنھیں نہاں کئے ہوئے ہیں سیکڑوں جوانیاں

شبابِ رفتہ کے قدم کی چاپ سن رہا ہوں میں
ندیم! عہدِ شوق کی سنائے جا کہانیاں

اٹھ، کہ تعمیرِ حیاتِ گزراں کچھ بھی نہیں
جز مئے ناب، سر و برگِ جہاں کچھ بھی نہیں

جام اُٹھا جام، کہ سرشاریِ ہستی کے بغیر
ایک ذرہ بھی ہو محسوس تو سب کچھ ہے وہی

نہ جانے رات کو تھا کون زینتِ پہلو
مٹا چکا تھا فلک رسمِ ساغر و سنداں
ہوا کی جیب میں تھا تیر از کماں رفتہ
اُدھر اُڑا ہوا طولِ شبِ فراق کا رنگ
چھڑی ہوئی ہے حکایت شبِ جوانی کی

فکر ہی ٹھہری تو دل کو فکرِ خوباں کیوں نہ ہو؟
اِک نہ اِک رفعت کے آگے سجدہ لازم ہے تو پھر
جب قریبوں ہی میں رہنا ہے تو اے اہلِ خرد
یاں جب آویزش ہی ٹھہری ہے تو ذرے چھوڑ کر
اِک نہ اِک ظلمت سے جب وابستہ رہنا ہے تو جوش

پا چکا طاعت کی لذت، درد کے پہلو بھی دیکھ
فرشِ مسجد سے اُٹھا بھی خاک آلودہ جبیں
حُسن ذروں سے اُبلتا ہے کبھی تو جام اُٹھا

وہ شیشۂ شفق سے چھلکی مئے مغانہ
ہر شے سے پھوٹ نکلیں چشمے جوانیوں کے
نغموں کو تیز تر کر ہاں اے جوان مغنی!

سرشار ہوں، سرشار ہے دُنیا مرے آگے
ہوں کتنی ہی تاریک شبِ زیست کی راہیں
جب چاند جھلکتا ہے مرے ساغرِ زر میں
جب جھوم کے مینا کو اُٹھاتا ہوں گھٹا میں
آتی ہے دُلہن بن کے مشیت کی جلو میں

آ، فصلِ گل ہے غرقِ تمنا ترے لئے
اُٹھ چشمِ بادہ دانۂ ساغر فروش، اُٹھ

خندۂ حور و تماشائے جناں کچھ بھی نہیں
ہو نہ محسوس تو خلّاقِ جہاں کچھ بھی نہیں

مچل رہی تھی ہوا میں شراب کی خوشبو
بھلا چکا تھا زمانہ نزاعِ سنگ و سبو
کشش کے دام میں تھی کاوشِ رمِ آہو
اِدھر شباب پر آرائشِ خمِ گیسو
تڑپ کے جوش! پھر اک بار نعرۂ یاہو

خاک ہونا ہے تو خاکِ کوئے جاناں کیوں نہ ہو؟
آدمی محوِ سجودِ سرو خوباں کیوں نہ ہو؟
لذتِ پیمانِ یارِ سست پیماں کیوں نہ ہو؟
آدمی خورشید سے دست و گریباں کیوں نہ ہو؟
زندگی پر سایۂ زلفِ پریشاں کیوں نہ ہو؟

شیخ! آ محراب سے باہر، خمِ ابرو بھی دیکھ
رکھ کے زیرِ سر کسی معشوق کا زانو بھی دیکھ
دیکھتی ہیں جوش کی آنکھیں جو عالم، تو بھی دیکھ

اے ساقیِ شبینہ! وا کر شراب خانہ
ہاں اے نگارِ نورس! ایسا کوئی ترانہ
وہ آ رہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

کونین ہے اک لرزشِ صہبا مرے آگے،
اک نور سا رہتا ہے جھلکتا مرے آگے،
چلتا نہیں خورشید کا دعویٰ مرے آگے
ہلتا ہے سرِ گنبدِ مینا مرے آگے
آوارگیِ آدم و حوا مرے آگے

ڈوبا ہوا ہے رنگ میں صحرا ترے لئے
مچلی ہوئی ہے لرزشِ صہبا ترے لئے

آ، اور داد دے، کہ بایں چشمِ حق نگر
کھائے ہوئے ہوں زیست کا دھوکا ترے لئے

سبزے کا فرش، ابر کا خیمہ، گلوں کا عطر،
گلشن میں اہتمام ہے کیا کیا ترے لئے

طغیانِ گل شباب پہ، بلبل خروش میں
اِک حشر سا ہے باغ میں برپا ترے لئے

ہنوز چرخ پہ چھائی نہیں ہے مست گھٹا
چمن کی خاک ہے خود کو دُلہن بنائے ہوئے

نہیں ملا ہے صبا کو ہنوز اذنِ خرام
مگر چراغ ابھی سے ہیں جھلملائے ہوئے

سلگ رہے ہیں برابر ہزارہا خرمن،
ہنوز ابر میں بجلی ہے منھ چھپائے ہوئے

کھلے ہوئے ہیں صبا میں ہزارہا نافے
ہنوز زلف میں ہیں وہ گرہ لگائے ہوئے

ہنوز یار ہے خلوت گزین و حجلہ نشیں،
تمام بزم کے چہرے ہیں مُسکرائے ہوئے

سنا ہے جوشؔ، اُٹھے گی کسی کی آنکھ اِدھر
دلوں کو لوگ کلیجے سے ہیں لگائے ہوئے

یہ مانا دونوں ہی دھوکے ہیں رندی ہو کہ درویشی
مگر یہ دیکھنا ہے کونسا رنگین دھوکا ہے؟

کھلونا تو نہایت شوخ و رنگیں ہے تمدن کا
معرفت میں بھی ہوں، لیکن کھلونا پھر کھلونا ہے

مجھے معلوم ہے جو کچھ تمنا ہے رسولوں کی!
مگر کیا درحقیقت وہ خدا کی بھی تمنا ہے؟

سوزِ غم دے کے مجھے اُس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا۔

وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا

اے میں سو جان سے اِس طرزِ تکلّم کے نثار
پھر تو فرمائیے کیا آپ نے ارشاد کیا

اتنا مانوس ہوں فطرت سے، کلی جب چٹکی
جُھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا

مجھ کو تو ہوش نہیں، تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

کچھ نہیں اِس کے سوا جوشؔ حریفوں کا کلام
وصل نے شاد کیا، ہجر نے ناشاد کیا

وہ غریب دل کو سبق ملے کہ خوشی کے نام سے ڈر گیا
کبھی ہنس کے تم نے بھی بات کی تو ہمارا چہرہ اُتر گیا،

تمہیں آہیں سننے کا شوق تھا، مگر اب بتاؤ کروگے کیا؟
جو کراہتا تھا تمام شب، وہ مریضِ جوشؔ تو مر گیا

مٹ چلی تھی خلشِ سجدۂ شوق
پھر ترا نقشِ قدم یاد آیا

ہمنشیں! تو نے بھلایا تھا جسے
پھر ترے سر کی قسم یاد آیا

موت کی جانب مُڑا ہے بڑھ کے ہر اک راستہ
زندگی نے عافیت کی راہ دکھلائی تو کیا

سلسلہ خوابِ پریشاں کا نہ ٹوٹا صبح تک
ہم کو ہجرِ یار میں اے جوشؔ نیند آئی تو کیا

یا رب! یہ بھید کیا ہے کہ راحت کی فکر نے
انساں کو اور غم میں گرفتار کر دیا

دل کچھ پنپ چلا تھا تغافل کی رسم سے / پھر تیرے التفات نے بیمار کر دیا
کل اُن کے آگے شرحِ تمنا کی آرزو / اتنی بڑھی کہ نطق کو بیکار کر دیا
یہ دیکھ کر کہ اُن کو ہے رنگینیوں کا شوق / آنکھوں کو ہم نے دیدۂ خونبار کر دیا

جو چاہنا اختیار کرنا / دنیا پہ نہ اعتبار کرنا
اے حشر! یہ تجھ سے التجا ہے / اب ہم کو نہ ہوشیار کرنا
اے بادِ صبا! اُس آشنا کو / ہم سے بھی کبھی دوچار کرنا
حاصل ہو خدا کرے تجھے جوش / نظارۂ روئے یار کرنا

یہ صبا نے خاک اُڑائی کیوں، یہ چٹک کے غنچے نے کیا کہا؟ / تجھے وہم ہوتا ہے ہمنوا! کوئی بھید اس میں ضرور تھا

وہ صبر دے کہ نہ دے، جس نے بیقرار کیا / بس اب تمھیں پہ چلو ہم نے انحصار کیا
تمھارا ذکر نہیں ہے، تمھارا نام نہیں / کیا نصیب کا شکوہ ہزار بار کیا
ثبوت ہے یہ محبت کی سادہ لوحی کا / جب اُس نے وعدہ کیا، ہم نے اعتبار کیا

"کیوں چپ ہیں سب، مریضِ محبت کو کیا ہوا؟" / اُن کا یہ پوچھنا تھا کہ محشر بپا ہوا
زحمت نہ ہو تو در پہ ذرا چل کے دیکھ لو / آیا ہے کوئی اپنا پتا پوچھتا ہوا
اک تم کہ اہلِ دل کی نظر پر چڑھے ہوئے / اک میں کہ ہوں خود اپنی نظر سے گرا ہوا
شاعر کا دل، مناظرِ قدرت سے بے نیاز!! / پیغمبر، اور کلامِ خدا سے پھرا ہوا!!!

تم بھی آؤ، ورنہ کلیوں کا چٹکنا باغ میں / میرے دل کے ٹوٹ جانے کی صدا ہو جائیگا

مطرب! بربط ہات سے رکھدے، ماضی نے در کھولا ہے / فریاد کہ چبھ کر ٹوٹ گیا، پھر کانٹا سا ارمانوں کا،
اے دینِ وفا، اے جانِ کرم! یوں غم میں نہ میرا ہاتھ بٹا / مرجاؤں گا میں، اے شمع! خدارا، روپ نہ پھر پروانوں کا
اے جوش! جنوں کی شام و سحر میں، رو وقت کی یہ رفتار نہیں / داناؤں کی طولانی صدیاں اور ایک نفس دیوانوں کا

فغاں، کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے / سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا

ہٹ گئے دل سے تیرگی کے حجاب / آفریں اے نگاہِ عالمتاب
آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں، / مشورے دے کے ہٹ گئے احباب
کیا قیامت تھی صبر کی تلقین، / اور بھی روح ہو گئی بیتاب
بارے اُٹھو تو ناصحِ مشفق! / ہاں کدھر ہے صراحیِ مئے ناب
ہاں، اثر اب ہوا محبت کا / ہم سے آنے لگا ہے اُن کو حجاب

شب جو بیٹھے وہ میرے پہلو میں
مسکرانے لگی شبِ مہتاب
جوشؔ، کِھلتی تھی جن سے دل کی کلی
کیسے وہ لوگ ہو گئے نایاب

کشتیٔ مے کو اے خدائے صبوح
بخش دے قسمتِ سفینۂ نوح
بخش اس جسمِ پاک جوہر کو
مرگ فرسائی جلالتِ روح
چشمۂ زندگی ہو مدحِ سرا
ارغوانی شراب ہو ممدوح
بادہ ہے اس طرف، اُدھر کوثر
اس کو فاتح بنا، اُسے مفتوح
آنچ آئے نہ مے پر اے معبود!
تیرے بندے ہیں خستہ و مجروح

ہوئی جاتی ہے زندگی برباد
اے مرے دیر آشنا! فریاد
جی کڑا کرکے، حالِ دل اُن سے
اب تو کہتے ہیں، ہرچہ بادا باد
مست باش اے نگاہِ بادہ فروش
ہو گئے کتنے میکدے برباد
ہم بھی آخر خدا کے بندے ہیں
کوئی حد بھی ہے، او ستم ایجاد؟
جوشؔ اپنی سحر پرستی سے
جاگ اُٹھی قسمتِ ملیح آباد

عشووں کو چین ہی نہیں آفت کئے بغیر
تم اور مان جاؤ شرارت کئے بغیر؟
اہلِ نظر کو یارو دکھاتا رہِ وفا
اے کاش ذکرِ دوزخ و جنّت کئے بغیر
اب دیکھ اُس کا حال، کہ آتا نہ تھا قرار
خود تیرے دل کو جس پہ عنایت کئے بغیر
اے ہمنشیں محال ہے ناصح کا ٹالنا
یہ، اور یہاں سے جائیں نصیحت کئے بغیر!!
تم کتنے تند خو ہو کہ پہلو سے آج تک
اک بار بھی اُٹھے نہ قیامت کئے بغیر

اپنی ان انکھڑیوں کی تجھکو قسم
ہاں اِدھر بھی کبھی نگاہِ کرم،
آنے والی ہے کیا بلا سر پر
آج پھر دل میں درد ہے کم کم
لذّتِ مرگ، اے معاذ اللہ
وائے بر خضر و عیسےٰ مریم

کس حد کا دلنشیں ہے محبت کا بھی سبق
اک بار جسکو یاد ہوا بھولتا نہیں
اس نامرادِ عشق کی تلخی کو کیا کروں
ہرچند جس سے کام ہے وہ بیوفا نہیں
واقف ہے جوشؔ، عشق سے اپنے تمام شہر
اور ہم یہ جانتے ہیں کوئی جانتا نہیں

یہ بات، یہ تبسّم، یہ ناز، یہ نگاہیں
آخر تمہیں بتاؤ کیونکر نہ تم کو چاہیں
اب سر اُٹھا کہ میں نے شکووں سے ہاتھ اُٹھایا
مر جاؤں گا ستمگر، نیچی نہ کر نگاہیں

پھر گُل ہی سے نہیں ہے روحِ نمو کو رغبت — گردن میں خار کی بھی ڈالے ہوئے ہے باہیں،
اللہ ری دلفریبی جلووں کے بانکپن کی — محفل میں وہ جو آئے کج ہو گئیں کلاہیں،
یہ بزم، جوشؔ، کس کے جلووں کی رہگزر ہے — ہر ذرّہ میں ہیں غلطاں اُٹھتی ہوئی نگاہیں

جاں بلب ہوں فراق کے مارے — چار دن کی ہے زندگی پیارے!
اے مرے وعدہ بھولنے والے — ڈوبنے کے قریب ہیں تارے
جوشؔ سے کل جو نام اک پوچھا — ہو گیا زرد شرم کے مارے

دل کا رونا ہے دل کا ماتم ہے — اب تو ہر سانس نوحۂ غم ہے
میرا صدموں میں مسکرا دینا — بدتر از صد ہزار ماتم ہے
دیکھ، وہ دل نہ توڑ او ظالم — رازِ کونین کا جو محرم ہے
یاد اُن کی بہت نہیں آتی، — شاید اب دل کی زندگی کم ہے
خونِ دل کی ہر ایک بوند میں جوشؔ، — وسعتِ عرصۂ دو عالم ہے

آپ سے، ہم سے، رنج ہی کیسا، — مسکرا دیجئے، صفائی ہے
آئی عاشق میں شانِ محبوبی — یعنی اب عشق انتہائی ہے
حد ہے، اپنی طرف نہیں میں بھی — اور اُن کی طرف خدائی ہے

خلافِ مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں، مگر ناصح! — وہ آتے ہیں تو چہرے پہ تغیر آ ہی جاتا ہے
شگوفوں پہ بھی آتی ہیں بلائیں، یوں تو کہنے کو — مگر جو پھول بن جاتا ہے وہ کمھلا ہی جاتا ہے
سمجھتی ہیں مآلِ گل، مگر کیا زورِ فطرت ہے — سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

وہ جوشِ خیرگی ہے، تماشا کہیں جسے — بے پردہ یوں ہوئے ہو کہ پردا کہیں جسے
زلفِ حیاتِ نوعِ بشر میں ہے آج تک — وہ خم، گناہِ آدم و حوّا کہیں جسے،
کتنی حقیقتوں سے فزوں تر ہے وہ فریب — دل کی زباں میں وعدۂ فردا کہیں جسے
میرے نشاط خانۂ امروز میں نہیں — وہ بزدلی کہ خطرۂ فردا کہیں جسے
خنجر ہے جوشؔ ہات میں، دامن لہو سے تر — یہ اُس کے طور ہیں کہ مسیحا کہیں جسے
عشاق بندگانِ خدا ہیں، خدا نہیں، — تھوڑا سا نرخِ حُسن کو ارزاں تو کیجئے،

ہزار بار ہوئی گو مآلِ دل سے دوچار — کلی سے خو نہ گئی پھر بھی مسکرانے کی
چراغِ دیر و حرم کب کے بجھ گئے اے جوشؔ — ہنوز شمع ہے روشن شراب خانے کی

حسرت موہانی

نام سید فضل الحسن، حسرت تخلص - وطن موہان ضلع اُناؤ - ولادت ۱۸۷۵ء - ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی - اس کے بعد فتحپور گورنمنٹ اسکول سے انٹرنس پاس کیا اور پھر علیگڈھ کالج سے گریجویٹ ہوئے - آپ کو بہت ابتدا سے غزل کہنے کا شوق ہے اور اسی ادبی ذوق کی بنا پر آپ نے علیگڈھ سے اُردوئے معلی کا پرچہ جاری کیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ کو سیاسیات سے بھی دلچسپی ہوگئی اور کئی بار اسی کی وجہ سے جیل جانا پڑا -

حسرت نے تسلیم لکھنوی سے مشورہ کیا ہے اور خاندان مومن کے اب تنہا یادگار رہی ہیں - کچھ عرصہ سے آپ کا مستقل قیام کانپور میں ہے، آپ کے متعدد دیوان شایع ہو چکے ہیں اور اساتذۂ قدیم و جدید کے کلام کا انتخاب بھی متعدد جلدوں میں آپ نے شایع کیا ہے -

---

لاؤں کہاں سے حوصلہ آرزو سپاس کا
جبکہ صفات یار میں دخل نہ ہو قیاس کا

حسن بے پروا کو خود بیں و خود آرا کر دیا،
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

جور پیہم نہ کرے شانِ توجہ پیدا
دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا،

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

تجھسے وہ ملا شوق سے اور تو نے نہ جانا،
حسرت کو ابھی یاد ہے تیرا وہ زمانا،

ہم نے کس دن ترے کوچے میں گزارا نہ کیا
تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا،

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاریِ دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارا نہ کیا

محفل یار کی رہ جائے گی آدھی رونق
ناز کو اُس نے اگر انجمن آرا نہ کیا

پیہم مجھے پیالۂ مے برملا دیا
ساقی نے التفات کا دریا بہا دیا

بر سرِ ناز وہ از راہِ کرم پہونچا تھا
شب عجب لطف کا سامان بہم پہونچا تھا

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا
باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق
ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا
تو نے حسرتؔ کی عیاں تہذیب رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

ادا نہ ہم سے ہوا حق تری غلامی کا
نصیبِ شوق رہا داغ ناتمامی کا
بچھی ہیں راہِ تمنا میں سیکڑوں آنکھیں
کہ تا ز جلوہ کرے تیری خوشخرامی کا
بقدرِ شوق کہاں تابِ التماس ہمیں
لکھیں جواب جو اُس نامۂ گرامی کا

اک برق تپاں ہے کہ تکلم ہے تمھارا
اک سحر ہے لرزاں کہ تبسم ہے تمھارا

پیروِ عشق رہ نما نہ ہوا،
زاہدِ خشک باخدا نہ ہوا
ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا
لٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
تیرے اس التفات کا ہوں غلام
جو ہوا بھی تو برملا نہ ہوا
لطفِ ساقی تھا بیدریغ۔ مگر
مجھ بلا نوش کا بھلا نہ ہوا
ہو کے بیخود کلامِ حسرتؔ سے
"آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا"

شوقِ پوشیدہ کا اظہار نہ ہونے پایا
داغِ دل کوئی نمودار نہ ہونے پایا
دل کچھ اس ڈھب سے لئے اُن نے کہ برسوں کوئی
حال سے اپنے خبردار نہ ہونے پایا
اس سلیقے سے کیا ذبح کہ دامن اُن کا
خونِ عشاق سے گلنار نہ ہونے پایا

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا
اب تو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

گماں نہ کیوں ہو زاہد کو پرہیزگاری کا،
کہ ذکر کرتا رہتا ہے شغلِ بیقراری کا

بہار آئی سب شادماں ہیں، مگر ہم
یہ دن کیسے کاٹیں گے بے جام و مینا

ہٹے عجیب سب عشقبازی میں حسرتؔ
نہ بغض و حسد ہے نہ غصہ نہ کینا،

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا
شغل بیکار ہیں سب ان کی محبت کے سوا
سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم
اس میں اک شان فراغت بھی ہے راحت کے سوا
عقل حیران ہے اسے جانِ جہاں راز ترا
کون سمجھے دلِ دیوانۂ حسرتؔ کے سوا

شوق، وصالِ "یار" کے قابل بنا دیا
دل کیا تھا عاشقی نے اسے دل بنا دیا

آئی جوانی کی یاد مرا دل ٹھہر گیا — دعوئے غمِ فراق کا باطل ٹھہر گیا

عہدِ یک عمرِ فراغت سے بھی خوشتر گزرا — وہ جو یک لحظہ تری یاد میں ہم پر گزرا

کوچہ اس فتنۂ دوراں کا دکھا کر چھوڑا — دل نے آخر ہمیں دیوانہ بنا کر چھوڑا

کچھ خوف خدا کا ہے نہ ڈر خلق خدا کا — کیا آئے خیال اُن کو شہیدانِ وفا کا

نکلا نہ کرو خود پئے تعزیر کہ چسکا — پڑ جائے گا عصیانِ محبت کو سزا کا

ہیں اُن کے رضا کار بری لوث طلب ہے — کوئی بھی جو ہو اُن میں گنہگار دعا کا

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب — آن پہونچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب

کرمِ ساقیِ میخانہ مبارک باشد — گرمیِ مجلسِ رندانہ مبارک باشد

دلفروشانِ تماشا کو بصد عیش و نشاط — دولتِ جلوۂ جانانہ مُبارک باشد

جانِ حسرت کے لئے پایۂ نازش ہے یہی — اضطرابِ دلِ دیوانہ مبارک باشد

وہ قامتِ بلند نہیں در قبائے ناز — اک سرو ناز ہے جو بنا ہو برائے ناز

کچھ یونہیں اپنے حُسن پہ مغرور تھا وہ شوخ — کچھ لے اُڑی ہے اور بھی اُسکو ہوائے ناز

شوق لقائے یار میں مرتے تو ہو مگر — حسرت جو نقد جاں بھی نہ ٹھہرے بہائے ناز

ہر درد ہر مرض کی دوا ہے تمھارے پاس، — آتے ہیں سب یہیں کہ شفا ہے تمھارے پاس

بیمارِ غم ہیں دور سے آئے ہیں سُن کے نام — کہتے ہیں دردِ دل کی دوا ہے تمھارے پاس

حسرت کرو نہ دل میں زیارت حضور کی، — آئینۂ رسولنما ہے ہمارے پاس

پیمانِ وفا نہ کر فراموش، — اے حسرتِ بیقرار خاموش

پوشیدہ سکون یاس میں ہے — اِک محشرِ اضطراب خاموش

آزاد ہیں قید میں بھی حسرت — ہم دلشدگانِ خود فراموش

قوی دل، شادماں دل، پارسا دل — ترے عاشق نے بھی پایا ہے کیا دل

جفا کار ہی ہے تسلیم ستم بھی، — نہ ہوگا تابع جور و جفا دل

بڑی درگاہ کا سائل ہوں حسرت — بڑی امید ہے میری، بڑا دل۔

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام — دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

تصور میں وہ شوخ تھا ہم سے اہم — عجب لذتِ بیخودی تھی فراہم

اس تغافل پر بھی کرتے ہیں تجھی کو یاد ہم — کتنے ہیں مجبور دیکھ او بانیٔ بیداد ہم

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم　　گھبرا گئے ہیں بے دلیِ ہمرہاں سے ہم
اے زہدِ خشک تیری ہدایت کے واسطے　　سوغاتِ عشق لائے ہیں کوئے بتاں سے ہم
بیتابیوں سے چھپ نہ سکا حالِ آرزو　　آخر بچے نہ اُس نگہِ بدگماں سے ہم
ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق　　پھر آ گئے وہیں پہ، چلے تھے جہاں سے ہم

سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم　　ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
جب اُن سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا　　تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم
فنا ہو کے راہِ محبت میں حسرت　　سزاوارِ خلدِ بقا ہو گئے ہم

خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں　　دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں
حُسن جب تک رہا نظارہ فروش　　صبر کی شرمساریاں نہ گئیں
تھے جو ہم رنگِ ناز اُن کے ستم　　دل کی امیدواریاں نہ گئیں

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سرِ بام کہیں　　جلد اے حوصلۂ دید مجھے تھام کہیں
رنجِ بیسود سے حاصل ہو یونہیں کاش نجات　　مار ہی ڈالے ہمیں وہ بتِ خودکام کہیں،
کچھ کچھ اس راز کی ہم کو بھی خبر ہے حسرت　　آپ جاتے ہیں جو روزانہ سرِ شام کہیں

ان سے ملکر شکوۂ بے اعتنائی پھر کہاں　　شاد رہ اے دل کہ یہ لطفِ جدائی پھر کہاں
سب ہماری زندگی ہی تک ہیں انکے حوصلے　　ورنہ یہ ناز و غرورِ دلربائی پھر کہاں
لوٹ لے جی بھر کے حسرت لذتِ آزارِ عشق　　اُس ستمگر کا یہ رنگِ آشنائی پھر کہاں

اک طرفہ ماجرا ہے در کوئے میفروشاں　　سرگرمِ بادہ نوشی انبوہِ خرقہ پوشاں،

اثرِ عشق سے نکلیں جو تمہارے آنسو　　دامنِ جان میں وہ لے لیجئے سارے آنسو

وہ اب یہ کہتے ہیں دیکھا کرے نہ تو مجھ کو　　سمجھ لیا ہے جو مجبورِ آرزو تجھ کو

حُسن بے مہر کو پروائے تمنا کیا ہو　　جب ہو ایسا تو علاجِ دلِ شیدا کیا ہو
دیکھیں ہم بھی جو ترے حُسنِ دلآرا کی بہار　　اس میں نقصان ترا اے گلِ رعنا کیا ہو
رات دن رہنے لگی اُس ستم ایجاد کی یاد　　حسرت اب دیکھئے انجام ہمارا کیا ہو

نامرادوں کو شادکام کرو،　　کرم اپنا کبھی تو عام کرو
سب کی خاطر کا ہے خیال تمہیں،　　کچھ ہمارا بھی انتظام کرو
بڑھ چکے ہیں وہ جاں نثاروں کو　　تم بھی حسرت اُٹھو سلام کرو

اپنے آپے میں نہیں شوق کے مارے گیسو — پھیلے جاتے ہیں رخِ یار پہ سارے گیسو
مایلِ شوق مجھے پاکے وہ بولے ہنسکر — دیکھو تم نے جو چھوئے آج ہمارے گیسو
فاتحہ پڑھنے چلے مرقدِ حسرت پہ جو وہ — پہلے کس ناز سے رو رو کے سنوارے گیسو

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے — وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کردیا آزاد — ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑگیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ — تری نگاہ کو اللہ دلنواز کرے
ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت — اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

نہ ہو اس کی خطا پوشی پہ کیوں نازِ گنہ گاری — نشانِ شانِ رحمت بن گیا داغِ سیہ کاری

میں ہوں مجبور دل ہے سودائی — رخصت اے صبر اے شکیبائی

نہ کر اتنا ستم ہم دردمندوں پر کہ دنیا سے — مبادا ایک قلم اٹھ جائے آئینِ وفاداری
نہ دیکھے اور دلِ عشاق پر پھر بھی نظر رکھے — قیامت ہے نگاہِ یار کا حسنِ خبرداری
نہیں کھلتی مری نسبت تری اے حیلہ جو مرضی — کہ ہے اقرارِ دلجوئی نہ انکارِ ستمگاری
نسیم دہلوی کو وجد ہے فردوس میں حسرت — جزاک اللہ تیری شاعری ہے یا فسونکاری

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے — ہم نے اس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

دلِ مایوس کو سرچشمۂ صدق و صفا کر دے — گدازِ غم اگر چاہے تو مجھکو باخدا کر دے
تقاضا کر رہا ہے اب یہ حسنِ تازہ کار اُن کا — کہ جس نے دل دیا تھا جان بھی ہم پر فدا کر دے
گراں گزرے گا حرفِ آرزو اُس طبعِ نازک پر — نگاہِ شوق اُس مفہومِ رنگیں کو ادا کر دے

تاثیرِ برقِ حسن جو ان کے سخن میں تھی — اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی
واں سے نکل کر پھر نہ فراغت ہوئی نصیب — آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی،
اک رنگِ التفات بھی اُس بے رُخی میں تھا — اک سادگی بھی اُس نگہِ سحر فن میں تھی
محتاجِ بوئے عطر نہ تھا جسمِ خوبِ یار — خوشبوئے دلبری تھی جو اُس پیرہن میں تھی
کچھ دل ہی بجھ گیا ہے مرا، ورنہ آج کل — کیفیتِ بہار کی شدت چمن میں تھی:
معلوم ہو گئی مرے دل کو زراہِ شوق، — وہ بات پیار کی جو ہنوز اُس دہن میں تھی
غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی — جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

بہت خجل ہے ترے درد سے دوا میری
یہ خوف ہے کہ نہ سن لے کہیں خدا میری

چھپے وہ مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی
وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

کبھی چرا کے جو روزن سے بھی تجھے دیکھوں
تو چور کی جو سزا ہو وہی سزا میری

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے
مشتاق دید اور بھی للچا کے رہ گئے

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن،
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

ٹوکا جو بزمِ غیر سے آتے ہوئے اُنھیں
کہتے نہ کچھ بنا وہ قسم کھا کے رہ گئے

دعوائے عاشقی ہے تو حسرت کرو نباہ
یہ کیا کہ ابتدا ہی میں گھبرا کے رہ گئے

مستی کے پھر آ گئے زمانے
آباد ہوئے شراب خانے

ہر پھول چمن میں زر بکف ہے،
یا سنتے ہیں بہار نے خزانے

کر دوں گا میں ہر دلی کو میخوار
توفیق جو دی مجھے خدا نے

ہم نے تو نثار کر دیا دل،
اب جانے وہ شوخ یا نہ جانے

اب کاہیکو آئیں گے، وہ حسرت
آغاز جنوں کے پھر زمانے

اس محوِ تغافل کی جفا میرے لئے ہے
صد شکر کہ اتنا تو روا میرے لئے ہے

دعوت میں تری میں بھی ہوں معلوم ہے لیکن
کیا غیر کی خاطر سے ہے کیا میرے لئے ہے

زمانِ فصلِ گل آیا نسیم مشکبار آئی
دلوں کو مژدہ ہو پھر جوش مستی کی بہار آئی

پھلا پھولا رہے گلزار یارب حسنِ خوباں کا
مجھے اس باغ کے ہر پھول سے خوشبوئے یار آئی

تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے
تماشا کامیاب آیا تمنا بیقرار آئی

الٰہی رنگ یہ کب تک رہیگا ہجر جاناں میں
کہ روز بیدلی گزرا تو شامِ انتظار آئی

بجا ہیں کوششیں ترک محبت کی، مگر حسرت
جو پھر بھی دلنوازی پر وہ چشمِ سحر کار آئی

چھپ کے اس نے جو خود نمائی کی
انتہا تھی یہ دلربائی کی

دام سے ان کے چھوٹنا تو کہاں
یاں ہوس بھی نہیں رہائی کی

ہو کے نادم وہ بیٹھے ہیں خاموش
صلح میں شان ہے لڑائی کی

ترے درد کو جس سے نسبت نہیں ہے
وہ راحت مصیبت ہے راحت نہیں ہے

ترے غم کی دنیا میں اے جانِ عالم
کوئی روح محرومِ راحت نہیں ہے

مجھے گرمِ نظارہ دیکھا تو ہنس کر
وہ بولے کہ اس کی اجازت نہیں ہے

حفیظ جالندھری

میرا خاندان تقریباً ۲۰۰ (دوسو) برس پیشتر چوہان راجپوت کہلاتا تھا، میرے بزرگ ہندو سے مسلمان ہو گئے اور پاداش میں اپنی املاک وغیرہ کھو بیٹھے۔ البتہ سورج بنسی ہونے کا غرور مسلمان ہونے کے باوجود ساتھ رہا میری ذات تک پہونچا اور ختم ہو گیا۔

میں ننھا سا تھا۔ جب مجھے محلے کی قدیم مسجد میں داخل کیا گیا، میں یقیناً اُس زمانے میں ذہین لڑکوں میں شمار ہوتا تھا۔ کیونکہ میں نے چھ برس ہی میں ناظرہ قرآن شریف پڑھ لیا، بہت سے سورے زبانی یاد کر لئے۔ اور کریما و ماقیماں رٹ لیں

اس سے آگے میں مسجد میں نہ چل سکا، جس کے وجوہ کثیر ہیں۔ اخلاقی بھی مادی بھی۔ اب مجھے مشن اسکول میں داخل کیا گیا۔ وہاں سے میں دوسرے درجے سے بھاگ نکلا۔ سرکاری مدرسے میں داخل ہوا۔ چوتھی جماعت میں وہاں سے بھاگا، آریہ اسکول میں داخل ہوا۔ پھر مشن ہائی اسکول میں لے جایا گیا۔ لیکن حساب سے میری جان جاتی تھی ہر روز حساب کے وقت بھاگ جاتا تھا۔ دوسرے دن پٹتا تھا۔ یہ بھاگنے اور پٹنے کی جنگ چار سال تک جاری رہی آخر پٹنے پر بھاگنا غالب آیا اور میں ہمیشہ کے لئے بھاگ نکلا

شعر گوئی یوں تو میری عمر کے ساتویں برس ہی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن اس مرض کا باقاعدہ حملہ گیارہ سال کی عمر میں ہوا۔ جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور اس بیماری کا سبب عشق کی گرمی تھی۔ لڑکپن کا یہ عشق بھی عجیب چیز تھا۔ اے کاش، اس کو میں بیان کر سکتا۔

اس زمانے میں ناول افسانے، ڈرامے، شعراء کے دواوین، تھیٹر، مشاعرے، سب سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میرے گھرانے پر فرشتۂ موت سایہ ڈال رہا تھا، پانچ بھائی یکے بعد دیگرے نذر اجل ہو گئے۔ ایک طرف تو یہ آفت تھی۔ دوسری طرف میں گھر کے لئے ایک مصیبت بن گیا تھا۔ کیونکہ گھر سے بھاگتے وقت جو کچھ ہاتھ لگتا اُڑا لے جاتا

لوگ کہتے ہیں، کہ فن شاعری منحوس ہے، اس قول میں صداقت ضرور ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ شعر گوئی

آوارگی ساتھ لاتی ہے۔ تو نحوست کا سبب بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ کم از کم میرے ساتھ تو یہی گزری۔ آوارگی اور شعرگوئی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔

آنکھ اُسوقت کھلی، جب والدین نے میری شادی کردی۔ اسوقت مجھے معلوم ہوا کہ میرے گھرانے کی دولت پیدا کرنے والے افراد اجل کے ہاتھوں اور جمع جتھا میرے ہاتھوں غائب ہوچکی تھی اور یہ سب کچھ چند ہی برس میں ہوگیا تھا۔

اب مجھے ذمہ داریوں کا احساس ہوگیا۔ میرے والد بوڑھے، والدہ علیل، ایک سوتیلا بھائی جس کا خاندان بہت وسیع، آمدنی بہت قلیل، باقی بیوہ بہنیں، بیوہ بھاوجیں۔ یتیم بچے بچیاں۔ یہ سب کچھ تھا۔ لیکن مجھے کام کاج کوئی نہ آتا تھا۔ صرف فارسی کی چند کتابیں، "اُردو شعراء کے چند دواوین" میرا مبلغ علم اور مبتدیانہ غزل گوئی میرا مبلغ فن تھا۔

پنجاب میں اُردو شاعری کا رواج تازہ تازہ ہوا تھا اور عوام کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ البتہ میرے وطن جالندھر کو فارسی زبان کے مسلم الثبوت اُستاد مولانا گرامی کا جنم بھوم ہونے کی وجہ سے یہ شرف حاصل تھا، کہ وہاں باقاعدہ مشاعرے ہوتے تھے اور ان مشاعروں میں شہر اور مضافات کی بستیوں کے شعراء حصہ لیتے تھے۔ اُن میں ایک دو اچھا خاصہ کہتے تھے۔ لیکن ایک بہت بڑی تعداد متشاعروں کی تھی۔ حضرت مولانا گرامی اگرچہ دربارِ دکن سے منسلک اور حیدر آباد ہی میں رہتے تھے، لیکن وہ جالندھر کے مشاعروں کے لئے فارسی غزل بھجوا دیا کرتے اور جب کبھی وطن میں تشریف لاتے، تو ایک بڑا مشاعرہ ہوتا۔ جس میں وہ اپنا فارسی کلام سناتے تھے۔ ان دنوں جالندھر میں فارسی جاننے والے بہت سے بزرگ موجود تھے۔

میں نے سات آٹھ سال کی عمر میں گرامی کو ایک مشاعرے میں شعر پڑھتے سنا تھا۔ اس وقت تو مجھے یہ مجلس مضحکہ خیز سی نظر آئی۔ واہ وا، سبحان اللہ، مکرر ارشاد ہو، واللہ اعجاز ہے، واللہ سحر ہے، واللہ جادو ہے یا داد دینے والوں کا اُچھلنا۔ ہاتھوں کا ہلنا۔ سب کا مل کر شور مچانا، عجیب مسخرہ پن معلوم ہوتا تھا۔ کیا خبر تھی کہ آخر یہی مسخرہ پن، مجھے بھی کرنا پڑے گا اور عمر کا ایک حصہ اسی تماشا گاہ میں گزرے گا۔

جب میں نے باقاعدہ غزل گوئی شروع کی، تو حسب دستور قدیمی اُستاد کی ضرورت لاحق ہوئی۔ قریبی بستی میں سرفراز خاں صاحب سرفراز مدرس تھے۔ جیسا اُسوقت کہتے تھے۔ ویسا ہی آج بڑھاپے میں بھی کہتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے، کہ اگر ان کا کہا ہوا سب شایع ہوجائے، تو اُس کا حجم بیس تیس ہزار صفحات سے کم نہ ہوگا۔ خیر میں نے اُن کو آغاز کی دو تین غزلیں دکھائیں۔ انھوں نے کوئی خاص اصلاح نہ دی۔ لیکن میں اب تک انکا شکر گزار ہوں۔ مجھے کسی نے مشورہ دیا کہ اپنا کلام حضرت گرامی کی خدمت میں دکن ارسال کروں اور اصلاح چاہوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور چند غزلیں ان کی خدمت میں ارسال کیں، جواب ملا "گرامی فارسی کا شاعر ہے اُردو سے بہت دور

حفیظ جوہر قابل معلوم ہوتا ہے، حفیظ کو چاہئے کہ اپنا کلام بار بار خود ہی ناقدانہ نظر سے دیکھا کرے۔" وغیرہ وغیرہ
میں نے اس مشورہ پر عمل شروع کر دیا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ میری غور و فکر کی عادت اسی مشورہ کی بدولت ہے۔ پھر جب حضرت گرامی وظیفہ لیکر ہمیشہ کے لئے وطن میں مقیم ہوگئے۔ تو شاعری کے اس آفتاب لب بام کے سامنے میں نے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اب فارسی کے مطالعہ کا شوق تو بڑھ گیا، لیکن اپنے لئے میں نے اُردو ہی میں شعر کہنے کو بہتر سمجھا۔ اور گرامی صاحب کا مشورہ بھی یہی تھا۔

متاہل ہو جانے کے بعد میں نے کسب معاش کے لئے تھوڑے ہی عرصہ میں بیسیوں پاپڑ بیل ڈالے۔ ریلوے لائن پر پٹی۔ عطر فروشی۔ کلاہ سازی۔ خیاطی۔ فوج کی ٹھیکیداری۔ خطوط نویسی۔ ریلوے اسٹیشنوں پر مزدوری۔ آٹے کی مشین۔ تشاعروں کو غزلیں لکھ لکھ کر دینا۔ سنگر سیونگ مشین کمپنی کی مینجری، سب کچھ کر ڈالا۔ لیکن پوری نہ پڑی۔ فراغت نصیب نہ ہوئی۔ اتنے بڑے کنبے کا پیٹ پالنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ مکانات کو بیچ بیچ کر کھاتا کھلاتا رہا اور سچ یہ ہے کہ نوکری ہو یا کاروبار میں کسی کام کا نہ تھا۔ رات دن فکر شعر۔ طبیعت کمزور اور حساس۔ خلافت اور کانگرس دونوں میں شامل۔ لیکن لیڈروں سے تنفر۔ نتیجہ یہ کہ نہ اِدھر نہ اُدھر۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں سنگر کمپنی کی ملازمت چھوڑ دی۔ وطن میں آگیا اور وہاں سے اُردو زبان میں ایک ماہانہ رسالہ 'اعجاز' جاری کیا۔ جس کے سرپرست مولانا گرامی تھے۔ یہ رسالہ پانچ ماہ بعد آخری مالی چرکا دیکر مرگیا۔ اس وقت مایوسی سے میری حالت دیوانگی تک پہونچ گئی تھی۔ کیونکہ میں نے ایک بہت بڑا مکان فروخت کر دیا تھا، والد صاحب کو اطلاع بھی نہیں کی تھی۔ اُن کو معلوم ہوا۔ تو اُنھوں نے مجھ کو چپتیایا اور گھر سے نکال دیا۔ اس وقت میں ایک بچی کا باپ تھا۔

اب میں نے کشمیر کا پیدل سفر کیا۔ ارادہ تو کچھ اور تھا۔ لیکن غمدیدہ والدہ کا خیال۔ ننھی بچی کا تصور اور زوجہ کے متعلق ذمہ داریوں کا احساس سدِّراہ تھا۔ پلٹ آیا۔ رسالہ شباب اُردو لاہور میں ملازمت کرلی۔ اس کے بعد 'نونہال' اور 'ہزار داستان' کی ادارت میرے سپرد ہوئی۔ پھر پھول اور تہذیب نسواں میں کام کیا۔ یہاں سے خیرسے ریاست خیرپور سندھ کا شاعر دربار مقرر ہوا۔ لیکن یہ زندگی میرے مزاج کے خلاف تھی۔ پلٹ آیا۔ نظم رقاصہ اسی دوران میں لکھی گئی۔

اب مجھے ادبی اور صحافتی زندگی کا تجربہ ہوچکا تھا اور یہ معلوم ہوگیا تھا۔ کہ پانی کس رخ بہتا ہے۔ اس میدان میں جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ آپ بیتی اور جگ بیتی، دونوں اس قدر تلخ ہیں کہ اگر بیان کر دوں تو ایک آفت برپا ہو جائے۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں لاہور آیا تھا۔ اس وقت سے اب تک برابر ادب و شعر میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ مشاعرے کی واہ وا۔ اسلامی انجمنوں کی سبحان اللہ، داد کی وصولی اور چندوں کی فراہمی یہ میرے مشاغل رہے ہیں۔ بڑے بڑے مشاعرے دیکھ ڈالے ہیں۔ دھڑا دھڑ داد وصول کی ہے۔ ہزارہا انسانوں کو ہمہ تن گوش اور "ہمہ جان" پرجوش کر دیا ہے۔

لاکھوں روپے چندہ دوسروں کی جیبوں سے نکلوا کر انجمنوں کے خزانے میں داخل کرا دیا ہے۔ بڑی بڑی ریاستوں کے رؤسا سے شرفِ ملازمت حاصل کیا ہے بڑے بڑے لیڈروں۔ نامی گرامی ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات رہی ہے۔ درباروں میں حاضری کی عزت اور درگاہوں میں زمین بوسی کی سعادت مل چکی ہے۔

بزعمِ خود اُردو نظم میں نئی نئی اختراعیں کی ہیں۔ گیت لکھے ہیں۔ مناظرِ قدرت کی مصوری کی ہے۔ بحور و اوزان میں تصرفات کئے ہیں۔ بچوں کے لئے شاعری کی ہے۔

میں پنجابی ہوں، لیکن اُردو زبان سے مجھے ایک خاص لگاؤ ہے۔ غلط کہتا ہوں یا صحیح، اُردو ہی کہنا پسند کرتا ہوں۔ ابھی زندہ ہوں اور معلوم نہیں کبتک زندہ رہوں۔

حفیظ جالندھری

ذوقِ نگاہ کے سوا۔ شوقِ گناہ کے سوا　　مجھکو بتوں سے کیا ملا۔ مجھکو خدا نے کیا دیا
حُسنِ نظر کی آبرو صنعتِ برہمن سے ہے　　جس کو صنم سمجھ لیا۔ اُس کو خدا بنا دیا

وفا جس سے کی بیوفا ہو گیا،　　جسے بُت بنایا خدا ہو گیا
ہوا سے اُلجھتا رہا ناخدا،　　سفینہ سپردِ خدا ہو گیا

کرتا ہے تصوُّر تیرا اِس رنگ کی باتیں،　　سُن لے کوئی اک حرف تو افسانہ بنا دے
آخر کوئی صورت تو بنے خانۂ دل کی،　　کعبہ نہیں بنتا ہے تو بتخانہ بنا دے
دیوانگیِ عشق کے بعد آہی گیا ہوش،　　اور ہوش بھی وہ ہوش کہ دیوانہ بنا دے

اب اشتیاقِ عرض تمنا نہیں رہا　　اب ہر کوئی ہے عرض تمنا لئے ہوئے
میری یہ زندگی ہے کہ مرنا پڑا مجھے　　اک اور زندگی کی تمنا لئے ہوئے

چاہوں تو اب بھی جانبِ منزل پلٹ چلوں　　گمراہ اس لئے ہوں کہ رہبر خفا نہ ہو
حُسن بھی اب تو ٹھہرتا نہیں معیارِ نظر　　آدمی شانِ خدا ہے تو خدا کیا ہو گا

ہر قدم جس کو نئی چال نہ چلنی آئے　　وہ تو رہزن بھی نہیں، راہنما کیا ہو گا
اونگِ شوق سجدہ گوارا ہوا تجھے　　سر کاٹ کر نہ پھینک دیا سجدہ گاہ میں

اب وہ نوید ہی نہیں صوتِ ہزار کیا کرے　　نخلِ امید ہی نہیں ابرِ بہار کیا کرے
دن ہو تو مہر جلوہ گر، شب ہو تو انجم و قمر　　پردے ہی جب ہوں پردہ در۔ روئے نگار کیا کرے
عشق نہ ہو تو دل لگی۔ موت نہ ہو تو خودکُشی　　یہ نہ کرے تو آدمی آخرِ کار کیا کرے،
موت نے کس امید پر، سونپ دئے ہیں بحر و بر　　مُشتِ غبار ہے بشر، مشتِ غبار کیا کرے

گریۂ شرم واہ واہ - فردِ عمل ہوئی تباہ
دیکھئے اک یہی گناہ روزِ شمار کیا کرے

اپنے کئے پہ بار بار کون ہو روزِ شرمسار
بل گیا عذرِ پائدار قول و قرار کیا کرے

عفو و خطا میں ضد ہو گئی تھی
وہ بھی نہ ہارے، میں بھی نہ ہارا!

پھر یہ جہنم کس کے لئے ہے
آمرزگارا! آمرزگارا!

یوں میں نے جیتی اُلفت کی بازی
اک بار کھیلا، سو بار ہارا

او دل توڑ کے جانے والے، دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھکو بھی سمجھاتا جا

میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا، شرماتا جا

یہ دُکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی
شکرِ نعمت بھی کرتا جا - دامن بھی پھیلاتا جا

دونوں سنگِ راہ طلب ہیں راہنما بھی منزل بھی
ذوقِ طلب ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا

نغمے سے جب پھول کھلیں گے، چننے والے چُن لیں گے
سننے والے سن لیں گے، تو اپنی دھن میں گاتا جا

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات - یاد نہ تم کو آسکے
تم نے ہمیں بھلا دیا - ہم نہ تمھیں بھلا سکے

ہوش میں آچکے تھے ہم، جوش میں آچکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اُٹھا سکے

رونقِ بزم بن گئے، لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں رہیں، لب نہ مگر ہلا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی برہمیِ مزاجِ دوست
اب وہ کرے علاجِ دوست جسکی سمجھ میں آسکے

اہلِ زباں تو ہیں بہت - کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

برہمن نالۂ ناقوس مسجد تک تو پہنچا دے
بُرا کیا ہے موذّن بھی اگر بیدار ہو جائے

نہ کر ذکرِ نشیمن فکرِ آزادی میں اے ہمدم
مبادا اپنے ہاتھوں ہی قفس تیار ہو جائے

آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر
ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے
مجھ کو نہ لے چلو میری نیّت خراب ہے

او مبتلائے زیست - ٹھہر - خود کُشی نہ کر
تیرا علاج زہر نہیں ہے - شراب ہے

ہے اک یہی جھلک تو مری جانِ جستجو
کیوں مان لوں کہ آب نہیں ہے شراب ہے

توبہ کئے ہوئے بھی زمانہ گزر گیا
اب تک رگوں میں خون نہیں ہے شراب ہے

کیا ناخدا بغیر کوئی ڈوبتا نہیں،
مجھکو میرے خدا سے پشیمان نہ کیجئے

اُسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ
وہ بے حجاب سہی - میں تو بے حجاب نہیں

ناکامیِ عشق - یا کامیابی
دونوں کا حاصل - خانہ خرابی

دنیا و دین سے بیگانہ ہو جا
دیوانہ ہو جا بن جا شرابی

اُن کا بہانہ برجستہ گوئی
اپنا تبسم حاضر جوابی

بہت ہی مختصر ہے داستانِ گمرہی اپنی
قدم گھر سے نکالا اور منزل آگئی اپنی

پھر کدھر جائیں گے راندے ہوئے بتخانے کے
درِ کعبہ بھی اگر وا نہ ہوا، کیا ہو گا،

ابھی باقی ہے میعادِ مصیبت
ابھی کچھ اور جینا چاہتا ہوں

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے میرے لہو کو شراب کر دے

یہ خوب کیا ہے یہ زشت کیا ہے بشر کی اصلی سرشت کیا ہے
بڑا مزا ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے

کہو تو رازِ حیات کہہ دوں۔ حقیقتِ کائنات کہہ دوں
وہ بات کہہ دوں۔ کہ پتھروں کے دلوں کو بھی آب آب کر دے

خلافِ تقدیر کر رہا ہوں۔ پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں خدا اگر کامیاب کر دے

کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ
پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابرِ بہار میں

وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی
دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں،

جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ۔ جاؤ جاؤ،
جاؤ کہ تم نہیں ہو مرے اختیار میں،

رونے والوں نے مسیحا کو کیا جھک کر سلام
لائے تھے حضرت نویدِ زندگی میرے لئے

زمانے میں چرچے ہیں دیر و حرم کے،
بڑی رونقوں پر ہیں دونوں دکانیں

بھلائی نہیں جا سکیں گی یہ باتیں،
تمہیں یاد آئیں گے ہم۔ یاد رکھنا

لے جاؤ ساتھ ہوش کو اے اہلِ ہوش جاؤ
ہے خوب اپنی بے خبری کی خبر مجھے

اللہ اللہ کیا ہوا انجام کارِ آرزو،
توبہ توبہ کس قدر ہنگامہ آرائی ہوئی!

ہو گیا جب عشق ہم آغوشِ طوفانِ شباب
عقل بیٹھی رہ گئی ساحل پہ شرمائی ہوئی

اب تک اسیرِ دامِ فریبِ حیات ہوں
مجھ کو بھلا دیا میرے پروردگار نے

غالب رہی حفیظ حقیقت مجاز پر
کعبے سے مجھ کو کھینچ لیا کوئے یار نے

رہرو راہِ محبت کس قدر ہشیار ہے
راہ کتراتا ہے شکلِ رہنما کو دیکھ کر

ہاں میں تو لئے پھرتا ہوں اک سجدۂ بیتاب
اُن سے بھی تو پوچھو وہ خدا ہیں کہ نہیں ہیں،

جلوے کی طلب پیروی حضرتِ موسیٰ،
گمراہ مرے راہنما ہیں کہ نہیں ہیں،

ناصح کو بلاؤ میرا ایمان سنبھالے
پھر دیکھ لیا اُس نے شرارت کی نظر سے

ایک ایک قدم پر ہے جہاں خندۂ تقدیر
تدبیر گزرتی ہے اُسی راہ گزر سے

او بے نصیب! حشر کے وعدے کا حشر دیکھ
وہ رفتہ رفتہ وعدے فراموش ہو گئے

بے ربطیِ فسانہ کا اب تذکرہ ہی کیا
خاموش تم کے کر دیا خاموش ہو گئے

اُس کی افتاد پہ خورشید کی رفعت قرباں
جس کو بھایا ترا نقشِ کفِ پا ہو جانا

رونقِ بزم ہے شیون سے تو شیون ہی سہی
ہمصفیرانِ چمن، پھر نہ خفا ہو جانا

مبادا پھر اسیرِ دامِ عقل و ہوش ہو جاؤں
جنوں کا اس طرح اچھا نہیں حد سے گزر جانا

آنکھ کمبخت سے اُس بزم میں آنسو نہ رکا
ایک قطرے نے ڈبویا مجھے دریا ہو کر

کچھ تعجب نہیں کعبے میں اگر جی نہ لگے
آئے ہیں ہم طرفِ دیر و کلیسا ہو کر،

بے تعلق زندگی اچھی نہیں،
زندگی کیا موت بھی اچھی نہیں،

یہ ہوا۔ یہ ابر۔ یہ سبزہ حفیظ
آج پینے میں کمی اچھی نہیں،

پی تو لیتا ہوں مگر پینے کی وہ باتیں گئیں
وہ جوانی، وہ سیہ مستی، وہ برساتیں گئیں

اللہ اللہ کہہ کے بس اک آہ کرنا رہ گیا
وہ نمازیں، وہ دعائیں، وہ مناجاتیں گئیں

راہ و رسمِ دوستی قایم تو ہے لیکن حفیظ
ابتدائے شوق کی لمبی ملاقاتیں گئیں

مجھکو لیجا کے دریار پہ قاصد نے کہا
خامہ فرسائی نہ کر ناصیہ فرسائی کر

گزرے ہوئے زمانے کا اب تذکرہ ہی کیا
اچھا گزر گیا بہت اچھا گزر گیا،

اب ابتدائے عشق کا عالم کہاں حفیظ
کشتی میری ڈبو کے وہ دریا اُتر گیا،

عاشق سا بد نصیب کوئی دوسرا نہ ہو
معشوق خود بھی چاہے تو اُسکا بھلا نہ ہو

کعبے کو جا رہا ہوں نگہ سوئے دیر ہے
ہر پھر کے دیکھتا ہوں کوئی دیکھتا نہ ہو

اے داورِ حشر اُس سے نہ کر پرسشِ ایماں
انکار کا عادی کہیں انکار نہ کر دے

آپ بیتاب نمائش نہ کریں جلوؤں کو
ہم نے دیدار قیامت پہ اُٹھا رکھا ہے

رکھتی تھی لاگ میرے گریباں سے نو بہار
دامن گلوں کے باغ میں کیوں چاک ہو گئے

کچھ راز نہیں کھلتا دز دیدہ نگاہی کا
اب تو میرے سینے میں دل ہے نہ تمنا ہے

اُمیدیں آرزوئیں کھیلتی ہیں یوں میرے دل سے
پلٹ جاتی ہیں موجیں جس طرح ٹکرا کے ساحل سے

سرِ مقتل حفیظ اپنا کوئی ہمدم نہ تھا لیکن
نگہ کچھ دیر تک لڑتی رہی شمشیرِ قاتل سے

اُٹھا رکھا ہے میں نے آپ کا دیدار محشر پر
مرا منھ تک رہے ہیں میری ہمت دیکھنے والے

دیکھ اے رحمتِ حق میرے گلے سے نہ لپٹ
میں گنہگار ہوں آلودہ ہے دامن میرا

جانبِ کعبہ تو چلتا ہوں مگر یا اللہ ! بتکدہ میرا - صنم میرے - برہمن میرا !!!

وہ نگہ باندھ گئی دل میں طلسمِ اُمید نظر آتی ہے تمنا ہی تمنا ہم کو

پھر مُردہ آرزوؤں میں اک روح پھونک دی گزرا پھر اس طرف سے کوئی دیکھتا ہوا

لحاظِ خاطرِ احباب دیرینہ ہے اے زاہد چلوں کیا سوئے مسجد راہ میں میخانہ آتا ہے

چلی ہے جان یادِ رفتگاں میں، مسافر ہے تلاشِ کارواں میں

وہ اور ہمارے پاس - خدا ساز بات تھی ہم مدتوں خدا کی قسم بدگماں رہے

تھے حق شناس اور انا الحق نہ کہہ سکے اہلِ زباں تھے ہم بھی مگر بے زباں رہے

اس زندگی کو چاہیئے سامانِ زندگی کچھ بھی نہ ہو تو شیشہ و پیمانہ چاہیئے

رہنے دے جامِ جم مجھے انجامِ جم سنا کھل جائے جس سے آنکھ وہ افسانہ چاہیئے

تم نے دُنیا ہی بدل ڈالی میری اب تو رہنے دو یہ دُنیا داریاں

قایم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو دنیا سمجھ رہی ہے فنا ہو گیا ہوں میں،

ہمت بلند تھی مگر اُفتاد دیکھنا چپ چاپ آج محوِ دعا ہو گیا ہوں میں

نا آشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے دوست کم بخت جانتے نہیں - کیا ہو گیا ہوں میں

ہاں کیفِ بیخودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے محسوس ہو رہا تھا خدا ہو گیا ہوں میں

حشر کے دن میری چُپ کا ماجرا کچھ نہ کچھ تم سے بھی پوچھا جائے گا

دوستوں کی بیوفائی پر حفیظ، صبر کرنا بھی مجھے آ جائے گا

ہاں جانتا ہوں شومیِ دستِ دعا کو میں کچھ روز اور دیکھ رہا ہوں خدا کو میں

ثابت قدم رہوں کہ تلاطم کا ساتھ دوں ساحل کے رُخ تو لا نہ سکوں گا ہوا کو میں

اُٹھو صنم کدے والو تلاش لازم ہے اِدھر ہی لوٹ پڑیں گے اگر خدا نہ ملا

تمام زادِ سفر راستے میں لٹ جاتا خدا نے فضل کیا کوئی رہنما نہ ملا

فغاں کے واسطے ذوقِ سلیم ہے درکار یہ جس کے پاس نہ ہو - صبر اختیار کرے

محبت کی دُنیا میں سب کچھ حسیں ہے محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

یہ اعترافِ عجز بھی معیوب ہے تو خیر چُپ ہو رہیں گے کچھ نہ کہیں گے زباں سے ہم

تھا زندگی سے بڑھ کے ہمیں وضع کا خیال جب عمر نے نباہ نہ کی - ہم بھی چپ رہے

مغرور تھا کمالِ سخن پر بہت حفیظ، ہم نے بھی واہ واہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

نگاہِ آرزو آموز کا چرچا نہ ہو جائے
شرارت سادگی ہی میں کہیں رسوا نہ ہو جائے
ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں۔ توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے

نہ دردِ محبت نہ جوشِ جوانی،
یہ جنت ہے تو، ہائے دنیائے فانی!
سُناتا ہے کیا حیرت انگیز قصے
حسینوں میں کھوئی ہو جس نے جوانی
نظر اور ذوقِ نظر دینے والے!
عجب شے بنا دی ہے دُنیائے فانی!

مجھ کو ان مجبوریوں پر بھی ہے اتنا اختیار
آہ بھر لیتا ہوں میں فریاد کر لیتا ہوں میں
جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے خدا
ایک عادت ہے کہ تجھ کو یاد کر لیتا ہوں میں

اُس فتنۂ شباب کا عالم نہ پوچھئے
اک حشر اُٹھ رہا ہے تماشا لئے ہوئے

عبادت کی لذت نہ جی بھر کے پینا،
یہ کیا زندگی ہے نہ مرنا نہ جینا،
مجھے یاد ہے اپنا انجام ناصح
میں اک روز مر جاؤں گا بس یہی نا!
تنزل کی حد دیکھنا چاہتا ہوں
کہ شاید وہیں ہو ترقی کا زینا۔
مرے ڈوب جانے کا باعث تو پوچھو
کنارے سے ٹکرا گیا تھا سفینا

سہارا کیوں لیا تھا ناخدا کا
خدا بھی کیوں کرے امداد میری
بلندی پر اُٹھائی تھیں نگاہیں
یہی تھی اولیں اُفتاد میری

مری مجبوریاں کیا پوچھتے ہو
کہ جینے کے لئے مجبور ہوں میں
کسی نے بھی نہ پہچانا وطن میں،
میں سمجھا تھا بہت مشہور ہوں میں

فرش سے مطمئن نہیں، پست ہے ناپسند ہے
عرش بہت بلند ہے ذوقِ نظر کو کیا کروں
اہلِ نظر کوئی نہیں اس لئے خود پسند ہوں
آپ ہی دیکھتا ہوں میں اپنے ہنر کو۔ کیا کروں

یہ دامن ہے یہ ہے گریباں۔ آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منھ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا
ایسی جنس فراہم کرلی جس کا گاہک کوئی نہیں
لادے لادے پھرتا ہوں اب پشتارا ارمانوں کا
لے چل ہاں منجدھار میں لے چل، ساحل ساحل کیا چلنا
میری اتنی فکر نہ کر میں خوگر ہوں طوفانوں کا

گوارا ہے دوامی تلخ کامی
کسی میٹھی زباں والے نے مارا
مجھے کم ظرف کہلانا پڑے گا
متاعِ دو جہاں والے نے مارا

چاند اور ستاروں کا یہ سماں کیا دلکش اور سہانا ہے
افسوس مجھے نیند آتی ہے افسوس مجھے سو جانا ہے
معصوم اُمنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولوں میں
یہ کچّی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہے

دل شاہجہاں پوری

نام حکیم ضمیر حسن خاں دل شاہجہاں پوری - ابن احمد حسن ابن جمال الدین عرف قدرت علی خاں - فارسی کتب درسیہ کی تکمیل کے بعد عربی تعلیم کا آغاز ہوا صرف ونحو سے فارغ ہونے کے بعد مولوی سید محمد علی خانصاحب خیال اور مولوی نادرالدین صاحب سے معقول کی اکثر کتابیں پڑھیں - فقہ حدیث اور تفسیر کی تعلیم مولوی بشیر احمد صاحب مراد آبادی اور مولوی عبدالباری خانصاحب شاہجہاں پوری سے حاصل کی بعدازاں علم طب کا درس جو خاندانی مشغلہ تھا، مولوی حکیم محمد صاحب سے -

پندرہ سولہ سال کی عمر سے ذوق شاعری پیدا ہوا - چند سال تک بغیر اصلاح مشغلۂ شاعری قایم رہا مگر اُستاد کامل کی تلاش تھی بذریعہ خط وکتابت منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی سے سلسلۂ تلمذ قایم ہوا بعدازاں بمقام رامپور حاضر ہوکر شرف نیاز بھی حاصل کیا -

حسب الارشاد اُستاد علیہ الرحمۃ بذریعہ خط وکتابت حضرت اُستاد ونیز دیگر اہلِ فن سے استفادہ کیا - رنگ تغزل میں دہلی کی تقلید کی - جذباتی رنگ پسند خاطر رہا - تصنع سے ہمیشہ احتراز کیا - پہلا دیوان نغمۂ دل طبع ہوچکا ہے دوسرا مجموعۂ کلام موسوم بہ ترانۂ دل غیر مطبوعہ ہے -

دل شاہجہاں پوری

اثرِ عشق سے ہوں صورتِ شمعِ خاموش
یہ مرقع ہے مری حسرتِ گویائی کا

چمنِ دہر میں ہر پھول رہا پیشِ نظر
کھینچنا تھا ہمیں نقشہ تری رعنائی کا

نظر آتی ہے مجھے حسن کی دنیا بے حس
کس کو افسانہ سناؤں شبِ تنہائی کا

بارہا ڈوب کے ابھرا مرے دل سے نشتر
راز پھر بھی نہ کھلا عشق کی گہرائی کا

سوزِ نہاں کا اب ہے وہ عالم کہ الاماں
پردہ اُلٹ نہ دے کہیں اخفاءِ راز کا

کیا جانے کس خیال سے چھوڑا بحالِ زار
مجھ پر بڑا کرم ہے مرے چارہ ساز کا

جب دل میں دردِ عشق اُٹھا ہم اُچھل پڑے
سمجھے کہ یہ کرم ہے کسی دلنواز کا

نارسائی کا سبب کیا ہے یہی ذوقِ طلب
بڑھ گئے ہم اس قدر آگے کہ رہبر رہ گیا

یہ گویا واقعاتِ بزمِ ہستی کا خلاصہ ہے
ترا یوں دفعتاً خاموش اے شمعِ سحر ہونا

اُدھر گھبرائے غمخواروں کی مایوسانہ سرگوشی
اِدھر بیمار کا کچھ کہہ کے سب سے بے خبر ہونا

ذوقِ جانبازی میں یہ احساس تک باقی نہیں،
دل میں پیکاں رہ گیا یا دل کو پیکاں لے چلا،

اُٹھ گیا پردۂ حائل فقط اتنا ہے خیال
کیا کہیں جلوہ گہہِ ناز میں پھر کیا دیکھا

اے نگاہِ روح پرور آفریں صد آفریں
جانِ بسمل بن گیا وہ درد پیدا کر دیا

خاک ہو جانا نمودِ عشق ہے اے اہلِ دل
جل گیا پروانہ لیکن رنگِ محفل بن گیا

وقتِ رخصت تسلیاں دے کر
اور بھی تم نے بے قرار کیا

چمکی تھی برقِ طور کہ بیخود ہوئے کلیم
پردہ حجاب کا جو اُٹھا بھی تو کیا ہوا

آغازِ تمنا سے انجامِ محبت تک
گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سنا ہوگا

یاد ہے ہاں یاد ہے طرزِ نگاہِ مستِ یار
ایک نازک پنکھڑی سے پارہ پارہ دل ہوا

کیا سنائیں سرگزشتِ زندگیِ پر الم
آشیاں اب تو قفس ہے اس سے پہلے دام تھا

درحقیقت مضطرب دل کے لئے وہ موت تھی
اصطلاحِ عام میں تسکین جس کا نام تھا

یاد ہے اب تک وہ کیف انگیزیِ جوشِ بہار
شاخِ گل تھی دستِ ساقی ہر گلِ تر جام تھا

رہا اپنے سفینہ کا یہ عالم بحرِ ہستی میں،
کبھی ساحل سے مل جانا کبھی کچھ دور ہو جانا

دفعتاً پھر بھول جاتے ہیں جو کچھ آتا ہے یاد
ہم کسی کے سامنے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

نہ وہ آرامِ جاں آیا نہ موت آئی شبِ وعدہ
اسی دھن میں ہم اُٹھ اُٹھ کے ہزاروں بار بیٹھے ہیں

کھنچی ہوئی اک شکلِ مجسم نظر آئی
دیکھا کسی مایوس نے یوں جانبِ در آج،

نتیجے تک کھنچے کیا کیا امید و یاس کے نقشے
تلاطم میں تھی کشتی سامنے نظروں کے ساحل تھا

حقیقت میں وہ اک نیرنگیِ بحرِ محبت تھی،
نہ موجیں تھیں نہ طوفاں تھا نہ کشتی تھی نہ ساحل تھا

کنارے تک تو پہونچے گو کسی صورت سے بھی پہونچے
تلاطم بحرِ غم کے ڈوبنے والے کو ساحل تھا

رہنما کی کیا ضرورت عشق کامل چاہئے
دل جہاں تڑپے سمجھ لینا یہی ہے کوئے دوست

یہ شرحِ غم ہے یہ انجامِ نالۂ سحری،
کہ چھا گئی مرے ظلمت کدہ پہ بے اثری

اُٹھا جو پردۂ ظلمت تو وجد میں تھی نسیم
فضا میں گونج رہا تھا ترانۂ سحری

اسے قلق ہے مرا حالِ زار سن سن کر
یہ وقت تھا کوئی تدبیر چارہ جو کرتے

نگاہِ شوق رہی ہمزبانِ دل لیکن
کسی طرح نہ بنا شرحِ آرزو کرتے

دیا تھا عشق تو ہمت ابھی یہ خدا دیتا
کہ ایک وقت میں ہم ترک آرزو کرتے

اک بے خبرِ ہوش کا عالم ہی جدا ہے
نالے ہیں نہ آہیں نہ اثر ہے نہ دعا ہے

راہِ طلب میں ٹھوکریں کھانے کے بعد
کہتا ہے عشق ترک تمنا نہ کیجئے

ہو کچھ تو میری ناصیہ سائی پر التفات
اتنا نیاز عشق کو رسوا نہ کیجئے

ان کی نظر اُٹھے گی کبھی تو پئے کرم
حُسنِ طلب یہی ہے تقاضا نہ کیجئے

محوِ جمال بیخود و مخمور ہو گئے
یعنی قریب ہو کے بہت دور ہو گئے

منزل کا خواب دیکھ رہے تھے سفر نصیب
چونکے تو کارواں سے بہت دور ہو گئے

مصیبت ہے نگاہ شرمگیں سے واسطہ دل کا
نہ آہِ سرد بھرنے دے نہ منھ سے اُف نکلنے دے

بس انتہا ہے کہ سنگ درِ حبیب سے ہم
بیان کرتے ہیں جو دل کا حال ہوتا ہے

حسنِ چمن تھے قطرۂ شبنم بہار میں
پلٹی ہوا تو اشکِ گل تر کے ہو گئے

کسی کی یاد تھی آنکھوں سے اشک ڈھلتے تھے
اسی خیال میں ہم کروٹیں بدلتے تھے

ہماری کشتیِ عمر آہ ڈوبتی تھی اِدھر
اُدھر نجومِ فلک ڈوبتے اُچھلتے تھے

اک وہم کی نقاشی پر مرحلۂ دل ہے
دنیائے محبت میں رہبر ہے نہ منزل ہے

ہمدم غمِ فرقت کی تشریح نہیں ممکن
اک نشترِ صد ایذا ہر ہر نفسِ دل ہے

ذروں میں کچھ کشش ہمیں محسوس ہو چلی
اے دل سنبھل کہ پیشِ نظر کوئے یار ہے

دامانِ دل میں جوشِ تمنا لئے ہوئے
آیا ہوں اک تلاطمِ دریا لئے ہوئے

اے احترامِ ساقیِ محفل سنبھالنا
لغزش ہوئی ہے ساغر و مینا لئے ہوئے

تھرا رہا ہے دعوئے پندار و اتقا،
آتا ہے کوئی ساغر و مینا لئے ہوئے

بڑھے جوشِ جنوں میں دستِ وحشت جسقدر چاہے
قیامت کی ہے گنجایش مرے چاکِ گریباں میں

قیامت کی کشش ہے تارہائے جیب و داماں میں
یہ زنجیریں مجھے کھینچے لئے جاتی ہیں زنداں میں

لرز اُٹھتا ہوں اب تک جب وہ شکوے یاد آتے ہیں
اثر تھا کس قیامت کا تری چشمِ پشیماں میں

ہم کو بے چین کئے جاتے ہیں،
ہائے کیا شے وہ لئے جاتے ہیں

گوشیِ دل کے لئے کچھ طور کی تخصیص نہیں
ہر جگہ ہم تری آواز سنا کرتے ہیں

اب یہ صورت ہے دلِ زار کے بہلانے کی
ذکرِ ناکامیِ اربابِ وفا کرتے ہیں

سنگِ درِ حبیب کو حس نہ سہی قبول کی
فرق نہ آئے اے جبیں حوصلۂ نماز میں

وہی مستِ حقیقی ہے جو پیہم بزمِ ساقی میں، شکستِ شیشۂ دل کی صدا پر وجد کرتا ہو
اُٹھے تو محوِ تمنا ملے تو غرقِ نیاز نگاہِ شوق کو فکرِ مآل کار نہ ہو
خود شعلۂ فنا سے ہم آغوش ہو گئے بزمِ وفا میں آج شہیدانِ آرزو
ناکامیوں کے بعد بھی چھوٹا نہ ہاتھ سے کیا جانے کس خیال سے دامانِ آرزو
سرِ طور ایک برقِ حسن لہراتی نظر آئی، ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو
ہر ذرہ میں در پردہ اک شعلہ بھڑکتا ہے اے اہلِ نظر دیکھو خاکسترِ پروانہ
جب صاعقہ لہرائے حد جاننا منزل کی چل وادیِ ایمن تک سن طور کا افسانہ
رہیں گے بیخود و سرشار جام ہو کہ نہ ہو ملے تو ہمت ساقی، اگر نہیں نہ سہی
یہی ہیں سوزِ دلِ عندلیب کے معنی قفس تو پھونک دیا چند پر نہیں نہ سہی
نگاہِ مست سے او مڑ کے دیکھنے والے تجھے تو ہے مجھے اپنی خبر نہیں نہ سہی
کہئے تو کہہ دوں عرشِ بریں کو مقامِ دوست ہمت مگر کچھ اور ہے اپنے خیال کی
اندازِ برقِ طور نمایاں ہیں حسن بن اب وقت آ گیا ہے کہ پردا کرے کوئی
ہے ہے یہ بیکسیِ محبت کہ خاکِ دل، اپنی نظر کے سامنے برباد ہو گئی
نظر میں ہمت جلوہ اگر نہیں نہ سہی کبھی کبھی تری آواز ہی سنا کرتے
بہار جام بکف جھومتی ہوئی آئی، شکستِ عہد نہ کرتے تو اور کیا کرتے
مایوسِ ازل ہوں یہ مانا ناکامِ تمنا رہنا ہے جاتے ہو کہاں رخ پھیر کے تم مجھکو تو ابھی کچھ کہنا ہے
مآلِ عشق کی اہلِ وفا سے داستاں کہئے جہاں دل مٹ چکا ہے اُس زمیں کو آسماں کہئے
رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے دل پر وہ مصیبت ہوتی ہے میں تارے گنتا رہتا ہوں جب دنیا غافل سوتی ہے
قدرت کی چمن آرائی کا گو ایک اثر ہے دونوں پر غنچے ہیں کہ ہنستے رہتے ہیں شبنم ہے کہ پیہم روتی ہے
ہو چکا ناکامیِ دل تک بیانِ زندگی، عشق نے اب کی مکمل داستانِ زندگی
ایک آہ سرد میں مضمر ہیں لاکھوں واقعات مختصر یوں کر رہا ہوں داستانِ زندگی
ہو چکی ہر بار گو اے شمع پروانوں کی خاک، ذرہ ذرہ میں ہے پنہاں اک جہانِ زندگی
حشر بھی شامل ہے اے دل واقعاتِ عشق میں آپ کہئے گا کہاں تک داستانِ زندگی
نظروں سے نہاں کیوں رہتے ہو جب جان لیا پہچان لیا، منشاءِ حجاب آخر کیا ہے تم کو تو خدا بھی مان لیا
نہ ہوا دل کسی صورت سے بھی مانوس اے دل گو لبھاتی رہی نیرنگیِ دنیا مجھکو

پہلے رودادِ دلِ ناکام پہ ہو اک نظر
پھر جہاں سے چاہئے چاکِ گریباں دیکھئے

دل صرفِ وفا ہوا تو سمجھے
کیا چیز یہ جنسِ رائگاں ہے

اے جوشِ الم کب تک گریہ دل آج تو ڈوبا جاتا ہے
موجیں ہیں کہ بڑھتی جاتی ہیں طوفاں ہی کہ امڈا آتا ہے

اخفائے خلش دشوار بہت تشریحِ خلش ممکن ہی نہیں
چپ رہنے میں دم گھٹتا ہے کہتا ہوں تو دل بھر آتا ہے

آغازِ تمنا بے حاصل انجامِ محبت مجبوری
کہتے ہیں یہ دل دینے والے جانے کے لئے دل آتا ہے

پھر اعتبارِ عشق کے قابل نہیں رہا
جو دل تری نظر سے گرا دل نہیں رہا

نشتر چبھوئے اب نہ پشیمانیِ نگاہ
مجھکو تو شکوۂ خلشِ دل نہیں رہا

موجیں ابھار کر مجھے جس سمت لے چلیں
حدِ نگاہ تک کہیں ساحل نہیں رہا

کیا کہئے اب مآلِ محبت کی سرگزشت
یاد اُس کی رہ گئی ہے مگر دل نہیں رہا

مرا حال تھا جہاں تک وہ ادا کیا زباں سے
جو کہیں گے اشکِ رنگیں وہ الگ ہے داستاں سے

نہ سمجھ سکے ہم اب تک وہی فیصلہ تھا دل کا،
جو کہا تری نظر نے جو سنا تری زباں سے

نہیں امتیاز ناصح تری پندِ برمحل کا
یہ مقامِ بیخودی ہے مجھے چھوڑ دے یہاں سے

مرا ہر نفس بیاں ہے مرے اشک ماجرا ہیں
یہی شرحِ مدعا ہیں وہ سنیں جہاں جہاں سے

دورِ نشاط ختم ہے خاک اڑائے گی خزاں
کوئی کہے کوئی سنے میں نہ سنوں بہار میں

مری خموشیِ مجبور پر بھی ایک نظر
زباں سے جو نہ ادا ہو وہ ماجرا ہوں میں

نشان دو مجھے اے کوئے یار کے ذرّو
یہیں کہیں کوئی شے آج کھو چکا ہوں میں

اس اضطراب پہ قربان اک جہانِ سکوں
کوئی سنبھال رہا ہے تڑپ رہا ہوں میں

اسی سے کیجئے رفتار کا کچھ اندازہ،
نظامِ دہر بدلتا ہوا اٹھا ہوں میں

توبہ کے احترام سے تھرا رہے تھے ہاتھ
دل کانپتا تھا جام کو ہر بار دیکھکر

اب کیوں شکستِ عہد کی ہمت ہے دفعتہً
کیا ہو گیا مجھے نگہِ ناز دیکھکر

سر بہ سجدہ سوئے بزمِ ناز جانا ہی پڑا،
حسن کی تسخیر پر ایمان لانا ہی پڑا

کھیلتی تھی یوں چمن میں شوخیِ موجِ نسیم
بے تکلف ہر کلی کو مسکرانا ہی پڑا

ہم کو تسلیم زمانہ کا تغیر لیکن،
عشق مظلوم رہا حسن پشیماں نہ ہوا

تا بہ لب آنے سے پہلے خود ہیں شکوے منفعل،
حسن کی معصوم فطرت کو پشیماں دیکھکر

دیکھئے کب ختم ہو شوقِ نظر کا امتحاں
بڑھ گیا نازِ تجلی مجھکو حیراں دیکھکر

حضرتِ دل کچھ تو کہئے واقعاتِ زندگی
ہنس دئے ہنگامِ گریہ آپ یہ کیا راز ہے

سوز و گدازِ شمع کو بیکار دیکھکر
تڑپا ہوں صبح تک یہی آثار دیکھکر

حشر آفریں ہے کوئے محبت میں ہر قدم
ہم تو بڑھے تھے راہ کو ہموار دیکھکر

گرتی رہیں تبسمِ پنہاں کی بجلیاں
ہم کو مشاہدہ کا طلب گار دیکھکر

اے حسن جو سزائے تمنا ہو وہ قبول
لیکن مری نظر کو پھر اک بار دیکھکر

تم تو سکونِ خاطرِ ناشاد بن گئے
سمجھا تھا میں کچھ اور یہ رفتار دیکھکر

تقوے بھی آج ہو گیا قربانِ میکدہ
ہر جام میں بہار کے آثار دیکھکر

یہ مانا سننے والے کی نظر کچھ اور کہتی ہے
ہوائے کوچۂ دلکش مگر کچھ اور کہتی ہے

تمنائے کرم اس کیف پر کچھ اور کہتی ہے
چھلک جاتا ہے جب ساغر نظر کچھ اور کہتی ہے

ادھر کوثر اُدھر کوثر جدھر دیکھو اُدھر کوثر
ہوا کا رخ بدلتے ہی نظر کچھ اور کہتی ہے

تری نظروں میں ہیں نقش و نگارِ حال و مستقبل
مگر خاموشیٔ دیوار و در کچھ اور کہتی ہے

یہ صدا آئی جو پہونچا کوئی ساحل کے قریب
بحر جس موج کو چاہے اُسے طوفاں کر دے

موجِ فنا ہے زندگی دل لئے ہوئے
ابھرا ہوں غرق ہو کے تو ساحل لئے ہوئے

منظر اداس شمعِ سحر پیکرِ خموش
اُٹھا ہے کوئی گرمیِ محفل لئے ہوئے

موجِ بہار - موجِ صبا - موجِ بوئے گل
ہر دلکشی ہے طوق و سلاسل لئے ہوئے

آئی صدا کہ تو ابھی منزل سے دور ہے
پہونچا جہاں جہاں بھی مجھے دل لئے ہوئے

بھٹک رہا ہوں تماشائے بام و در کے لئے
قدم قدم پہ طلسمات ہیں نظر کے لئے

اُٹھے جو بہرِ کرم وہ نگاہِ بے پروا
سکونِ اہلِ محبت ہے عمر بھر کے لئے

تلاشِ منزلِ مقصود میں نہ ہو مایوس
بہت وسیع ہے دنیا تری نظر کے لئے

حریمِ حسن میں کیا دخل فہم و عقل و شعور
ابھی یہ چند حجابات ہیں نظر کے لئے

بجھنے کے لئے شمعِ محفل جلنے کے لئے پروانہ ہے
سمجھو تو حیاتِ عاشق کا ایک ایک نفس افسانہ ہے

غماز کہوں یہ سوئے ادب، سفاک کہوں یہ ناممکن
مشتاقِ نظر جو کچھ بھی ہو انداز تو معصومانہ ہے

اے اہلِ نظر میں کیا سمجھوں آگاہ نہیں مستقبل سے
انجام محبت کیا ہوگا آغاز ہی ایک بتخانہ ہے

وہ کون سا مقام تھا اے ضبطِ رازِ عشق
ہم جن حدوں میں چاک گریباں نہ کر سکے

روشن صدیقی

نام شاہد عزیز، تخلص روشن، ولادت ۱۰ جولائی سنہ ۱۱ء، وطن جوالا پور (سہارنپور) جو مناظر فطرت کے لحاظ سے عجیب جگہ ہے اور قدیم ہندوستانی تہذیب کا گہوارہ گروکل کانگڑی بھی یہیں ہے - والد کا نام مولوی طفیل احمد صاحب شاہد - اُردو و فارسی قرآن کی تعلیم گھر پر ہوئی - ہندی، سنسکرت، انگریزی سے بھی واقفیت حاصل کی - اور سات سال کی عمر میں آغاز شاعری ہوا - زندگی کے سب سے پہلے دو شعر سُن لیجئے :

یہ میرے ضبطِ محبت نے کی عجب تاثیر
کہ ان کو ضبط محبت کا حوصلہ نہ رہا

ہے روز میرے گریباں سے گفتگوئے رفو
بہار کے لئے کیا کوئی مشغلہ نہ رہا

تلمذ اگر کسی سے ہے تو والد ماجد سے - سنہ ۲۴ء تک برابر غزلیں کہیں اس کے بعد نظم نگاری شروع ہوئی - سب سے پہلی نظم انتظار و ہمایوں میں شایع ہوئی -

روشن صدیقی

محبت اک تپشِ ناتمام ہوتی ہے
نہ صبح ہوتی ہے اس کی نہ شام ہوتی ہے

جو راہ اہل خرد کے لئے ہے لامحدود
جنونِ عشق میں وہ چند گام ہوتی ہے

باقتضائے محبت محال سمجھوں گا
اگر یہ سچ ہے کہ ملنا ترا محال نہیں،

ازل سے حسن ہے آمادۂ کرم لیکن
ہنوز عشق کے لب پر کوئی سوال نہیں

سکونِ دل جو ملا بھی تو آہ کیا ہوگا
سکونِ دل تو مرے درد کا مآل نہیں

فغانِ روح بیتابی ہے خاموشی محبت کی
سکوتِ عشق بھی اک عالمِ فریاد ہوتا ہے

بظاہر تو کوئی وجہ مسرت بھی نہیں ہوتی
یہ کیوں اکثر بہت شاداں دلِ ناشاد ہوتا ہے

خوش آتا ہے مری آزادیوں کو سایۂ زنداں
وہیں اُڑ کر پہونچتا ہوں جہاں صیاد ہوتا ہے

دل گوارا نہیں کرتا ہے شکستِ امید،
ہر تغافل پہ نوازش کا گماں ہوتا ہے

کچھ مرا حال سُناتی ہے مری خاموشی
کچھ تری نیم نگاہی سے عیاں ہوتا ہے

وہ کوئی نالۂ غم ہو کہ نغمۂ عشرت
شکستِ دل کی صدا کے سوا کچھ اور نہیں

وہ اک تسکین جو اب تک چارہ سازِ دردِ الفت تھی
وہ تسکیں بھی شریکِ دردِ الفت ہوتی جاتی ہے

خموشی سے بھی بارِ ترجمانی اٹھ نہیں سکتا
بہت غمناک رودادِ محبت ہوتی جاتی ہے

بڑھانا چاہتا ہوں وسعتیں خوابِ محبت کی
مجھے اے زندگی تیری ضرورت ہوتی جاتی ہے

روشش اب ہم ہیں اور رازو نیازِ سوزِ محرومی
بہت محبوب شمعِ شامِ فرقت ہوتی جاتی ہے

غمِ وفا تو کہانی نہ تھا مگر اے دل
بنا دیا تری خاموشیوں نے افسانہ

ہر ایک ذرہ شریکِ غم و مسرت ہے
ملا نہ شہرِ محبت میں کوئی بیگانہ،

وہ لب کھلیں تو بکھر جائیں نغمہ ہائے ارم
وہ آنکھ اُٹھے تو برس جائے کیفِ میخانہ

ہوا نہ تکملۂ حسرتِ دلِ رنگیں!
تمام عمر چھلکتا رہا یہ پیمانہ

پہونچ سکے نہ جہاں خواہشات کی پرواز
نہ بن سکا کسی ایسی فضا میں کاشانہ

یہ کون مسندِ عشرت سے مستِ خواب اُٹھا
کہ جھانکتا ہوا مشرق سے آفتاب اُٹھا

تکلفات کو بالائے طاق رکھ مطرب
میں دل سے ہاتھ اُٹھاتا ہوں تو رباب اُٹھا

نہ دیکھنے دیا کچھ مجھکو شوقِ بے حد نے
ہزار پڑ گئے پردے جو اک حجاب اُٹھا

ذوقِ یقیں نے کفر کو ایماں بنا دیا
جس در پہ سر جھکا درِ جاناں بنا دیا

اُس راز کو جو قلبِ ازل میں نہ چھپ سکا
پنہاں کیا تو پیکرِ انساں بنا دیا

کیا کیا خیال زینتِ آغوشِ شوق تھے
تم نے تو سب کو خوابِ پریشاں بنا دیا

یہ بھی سب اُن کا حُسنِ نوازش ہے اے روشش
غم ہی کو چارۂ غمِ پنہاں بنا دیا

ہونے ہی کو ہے اے دل تکمیل محبت کی
احساسِ محبت بھی مٹتا نظر آتا ہے

وسعتیں پاتا گیا ذوقِ لطافت جس قدر
میں بعید جلوہ ہائے رنگ و بو ہوتا رہا

مسافرِ رہِ اُلفت یہ شرطِ منزل ہے
کہ ہر قدم ہو ترا اور جہانِ بے خبری

اب اشک دیدۂ بیتاب میں نہیں رکتے
ادھر نہ دیکھ ذرا اے ستارۂ سحری

زندگی کیوں ہمہ تن گوشں ہوئی جاتی ہے
کبھی آیا ہے جو اب آئے گا پیغام اُن کا

تذکرہ رہتا ہے دل سے سحر و شام اُن کا
لب پہ آجائے نہ بھولے سے کہیں نام اُنکا

دلِ افسردہ محبت کو نہیں ہے درکار
اس گلستاں کے لئے اک گلِ تر پیدا کر

منتظر ہیں ابھی تیرے لئے لاکھوں جلوے
تو ذرا وسعتِ دامانِ نظر پیدا کر

جاوداں جن سے بنے انجمنِ نیم شبی
وہ ستارے کبھی اے دیدۂ تر پیدا کر

بتا سکا نہ کوئی رازِ تشنہ کامیٔ شوق
خموشیٔ میکدۂ دو جہاں ملا مجھ کو

مجھے جنونِ وفا سے بڑی امیدیں تھیں
یہ مرحلہ بھی مگر رائیگاں ملا مجھ کو

شرف عطا جو کیا تو نے ہم کلامی کا
زمانہ منتظرِ داستاں ملا مجھ کو

نہ اب سکوں ہی مرا ہے نہ اضطرار مرا
عجیب حال ہوا اے نگاہِ یار مرا

خزاں کے ساتھ بہت دور مجھکو جانا ہے
نہ انتظار کرا اے محفلِ بہار مرا

وہ ضبط جس نے سکھائی ہو مجھکو خاموشی
کرے گا ذکر وہی اُن سے بار بار مرا

ہر اک ذرہ جہاں منزل ہے خورشیدِ محبّت کی
وہیں اے کاش! صبحِ زندگی کی شام ہو جائے

جو آغازِ محبّت کا کوئی انجام ہوتا ہے
تو آغازِ محبت ہی مرا انجام ہو جائے

وہیں رہے ابتدا ہوتی ہے اقلیمِ محبّت کی
جہاں مجبور دورِ گردشِ ایام ہو جائے

سرحدِ عشق سے آگے نہ بڑھی وحشتِ عشق
حُسنِ ہشیار کو دیوانہ بنایا نہ گیا

عشق کو داغِ دلِ زیست سمجھنے والے
دونوں عالم سے بھی یہ داغ مٹایا نہ گیا

کبھی اے جنبشِ دامانِ تصور تجھ سے
شمعِ احساسِ جدائی کو بجھایا نہ گیا

کس کس عنواں سے بھلانا انھیں چاہا تھا روشؔ
کسی عنواں سے مگر اُن کو بھُلایا نہ گیا

نگاہِ ناز میں ہلکا سا رنگِ ناتوانی ہے
محبّت کی کہانی ہے محبّت کی زبانی ہے

بسائی ہے وہ دُنیا ایک ناکامِ محبّت نے
جہاں ہر نامرادی میں جمالِ کامرانی ہے

کسی کا لطفِ پنہاں آنسوؤں میں مسکراتا ہے
مری ناشادمانی انتہائے شادمانی ہے

یہ بھی اُس جانِ تغافل سے گوارا نہ ہوا
کہ تغافل ہی نصیبِ کششِ دل ہو جائے

حُسن وہ خواب نہیں ہے جو مکمل ہو کبھی
عشق وہ کیف نہیں ہے کہ جو کامل ہو جائے

ہائے کیا شے ہے وہ اک حسرتِ روپوش، روشؔ
جو کبھی درد بنے اور کبھی دل ہو جائے

گزر چکی تری کشتی ہزار طوفاں سے
ہنوز حسرتِ طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس نے کچھ سوچ کے سب پردے اُٹھا ہی ڈالے
کر گئی آج بڑا کام مری بے خبری

ترے مذاق نے کیا کیا دکھائے ہیں عالم
ترا مذاق ہی اے کاش جاوداں ہوتا

جو میں کرم نہ سمجھتا، ترے تغافل کو
تو بار بار یہ دل مجھ سے بدگماں ہوتا

ہزار طور نگاہوں نے کر لئے پیدا
حجاب اُن سے بالآخر کہاں کہاں ہوتا

جس میں ہو یاد بھی تری شامل
ہائے اس بیخودی کو کیا کہئے

ہے وہی رنگ حُسن بے پروا
عشق کی سادگی کو کیا کہئے

کھینچ لے جائے جو ترے در تک
ایسی دیوانگی کو کیا کہئے

اُن پہ قربان ہستیِ کونین
اک مری زندگی کو کیا کہئے

سکونِ دل تو کہاں ہے، مگر یہ خوابِ سکوں
نثارِ زلفِ پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہت بلند ہے دل کا مقام خودداری
مگر شکست کا امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سکوت عشق ہو یا اضطراب شوق روشؔ
اگر نوازشِ جاناں نہیں تو کچھ بھی نہیں

غمِ پنہاں کی نہ ہو جائے کہیں پردہ دری
آہ رہنے دو یہ اندازِ پشیماں نظری

مجھ تک آتی تھی کہاں نکہت گیسوئے نگار
وحشتِ عشق مبارک غمِ شوریدہ سری

یہ حجابات محبت کے لئے لازم ہیں
کچھ تری کم نگہی ہے نہ مری کم نظری

مدتوں سے ہے کسی عالمِ خاموش میں عشق
گریۂ نیم شبی ہے نہ دعائے سحری

اب عالمِ تغافلِ پنہاں کچھ اور ہے
ہر لمحہ رنگِ شوقِ فراواں کچھ اور ہے

الطافِ برملا کی تو کیا بات ہے مگر
رعنائیٔ نوازشِ پنہاں کچھ اور ہے

حد سے گزر چلا ہے اب عالمِ انتظارِ دوست
صبح بھی درمیاں نہیں شام بھی درمیاں نہیں

روزِ ازل سے عشق ہے رفتۂ سوزِ ناتمام
وصل بھی جاوداں نہیں، ہجر بھی جاوداں نہیں

حالِ روشؔ سنو گے کیا، حالِ روشؔ کہے گا کون
درد کوئی فغاں نہیں، غم کوئی داستاں نہیں

محبت ایک بڑا مدعا ہے فطرت کا
خبر بھی ہے کہ محبت کا مدعا ہے تو

کہیں برہم ہی نہ ہو جائے نظامِ ہستی
ضبط کرتا ہے محبت میں تو اتنا بھی نہ کر

زینتِ دہر کوئی جلوۂ موہوم سہی
نگہِ شوق کو محروم تماشا بھی نہ کر

محرمِ رازِ محبت ہے اگر دل تیرا
تو، خدا کے لئے اس راز کو رسوا بھی نہ کر

بہت بلند ہے دل کا مقام خودداری
مگر شکست کا امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

گزر چکی تری کشتی ہزار طوفاں سے
ہنوز حسرتِ طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

شب بھر نشاطِ گریۂ اُلفت نہ پوچھئے
آنکھوں پہ اُن کا دامنِ تر دیکھتے رہے

میری حالت سے دلِ دوست حزیں ہوتا ہے
جان بیتاب بس اب صبر نہیں ہوتا ہے

حُسن کچھ چشمِ زلیخا میں نہیں ہے محدود
کہ محبت میں ہر اک خواب حسیں ہوتا ہے

پنڈت امرناتھ ساحر

نام پنڈت امرناتھ، تخلص ساحر، آپ رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ مدن رئیس دہلی کے خلف اکبر ہیں آپ کی ولادت ۹ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء کو بانس بریلی میں ہوئی۔ رنجیت سنگھ شیر پنجاب اور اُن کے جانشینوں کے مشہور دیوان راجہ دینا ناتھ آپ ہی کے خاندان کے ایک معزز رکن تھے۔ ساحر صاحب بارہ برس کی عمر میں پنڈت پرشاد رام رازداں کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے اور اُردو فارسی کی تعلیم حاصل کی اور سب سے پہلے فارسی زبان میں شعر کہا، مولانا عبدالحلیم عاصم کاشانی سے جو فارسی کے ادیب اور زبردست شاعر تھے فارسی میں تلمذ اختیار کیا ۲۲ سال کی عمر میں آپ اجمیر تشریف لے گئے اور وہاں احباب کی ترغیب سے ریختہ اُردو پر توجہ فرمائی پھر دہلی آکر پنڈت جواہر ناتھ ساقی اور منشی رام رچپال سنگھ شیدا سے صحبت گرم رہی اور شعر و سخن کا مشغلہ جاری رکھا۔ آپ عرصۂ دراز تک عہدۂ تحصیلداری پر ممتاز رہے مگر شاعری کا مشغلہ جاری رہا اب اپنے وطن دہلی میں رونق افروز ہیں اور ہر مہینہ کے اخیر ہفتہ کو مشاعرہ آپ کے دولت خانہ پر ہوتا ہے۔ آپ متعدد کتابوں کے مترجم مؤلف و مصنف ہیں۔ آپ کا ایک اُردو دیوان مسمےٰ "کفر عشق" چھپ چکا ہے۔

چشم و دل نزع میں ہیں محوِ تماشائے جمال ۔۔۔ حشر کیا اور ہے اس سے کوئی بہتر اپنا

نظر کب تاب لاسکتی ہے دیدارِ تجلّی کی ۔۔۔ جو بیہوشی میں دیکھا بھی تو بیہوش نظر دیکھا

گرم تھا روشنیِ شمع میں شب ہنگامہ، ۔۔۔ شمع تھی محوِ فنا اُس کو سروکار نہ تھا

چمن میں آتشِ رخسارِ گل سے آگ لگی ۔۔۔ نہ آشیانۂ بلبل بچا نہ دام رہا

گویا زبانِ حال تھی ساحر خموش تھا ۔۔۔ یہ سعیِ ضبط تھی وہ تقاضائے ہوش تھا

ہونے کو تو ہے اب بھی وہی حُسن وہی عشق ۔۔۔ جو حرفِ غلط ہو کے مِٹا نقشِ وفا تھا،

پنہاں نظر سے پردۂ دل میں رہا وہ شوخ، ۔۔۔ کیا امتیاز ہو مجھے ہجر و وصال کا،

دل مٹا پر نہ مٹا حرفِ محبت دِل سے ۔۔۔ کفر اسلام ہوا مرکزِ ایماں نہ ہوا

دِل ہے بُت خانۂ اصنامِ خیالی ساحر ۔۔۔ تو وہ کافر ہے کہ بھولے سے مسلماں نہ ہوا

اُلفت آئینہ رویاں آخر اب بس کر کہ میں، ۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے محوِ تماشا ہو گیا

اے پری رو ترے دیوانے کا ایماں کیا ہے
اک نگاہِ غلط انداز پہ قرباں ہونا،

وقفِ تسلیم و رضا چاہیئے دل عاشق کا
ساحرؔ آسان نہیں بندۂ جاناں ہونا،

جنونِ عشق میں کب تن بدن کا ہوش رہتا ہے
بڑھا جب جوششِ سودا ہم نے سر کو دردِ سر جانا

قدم ہے عینِ حدوث اور حدوث عینِ قدم
جو تو نہ جلوے میں آتا تو میں کہاں ہوتا

ایک جذبہ تھا ازل سے گوشۂ دل میں نہاں
عشق کو اس حُسن کے بازار نے رسوا کیا

بار اور بارِ امانت عشق اور عشقِ ازل
شانِ رحمت ہے کہ ساحرؔ اس کا حامل ہوگیا

تمنائیں برآئیں اپنی ترکِ مدعا ہو کر
ہوا دل بے تمنا اب رہا مطلب سے کیا مطلب

دیکھ کر آئینہ کہتے ہیں کہ لاثانی ہوں میں
آئینہ دیتا ہے اُس کی لن ترانی کا جواب

پالیا آپ کو اب کوئی تمنا نہ رہی
بے طلب مجھ کو جو ملنا تھا ملا آپ سے آپ

گم کر دیا ہے عالمِ ہستی میں ہوش کو
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ ساحرؔ کہاں ہے آج

جنونِ عشق ساماں اب فنا کا رنگ لایا ہے،
گماں تارِ رگِ جاں کا ہے ہر اک تارِ دامن پر

خود رفتگی سے منزلِ حیرت میں ہے قیام،
آئینہ خانہ ہے در و دیوار آج کل،

ہنگامۂ ہستی کا انجام ہے معدومی
اس خوابِ پریشاں کی تعبیر سے کیا حاصل

دامانِ یار مر کے بھی چھوٹا نہ ہاتھ سے
اُٹھے ہیں خاک ہو کے سرِ رہگذر سے ہم

صدائے وصل بامِ عرش سے آتی ہے کانوں میں
محبت کے مزے اس دار پر چڑھ کر نکلتے ہیں

قطرہ دریا ہے اگر اپنی حقیقت جانے
کھوئے جاتے ہیں جو ہم آپ کو پا جاتے ہیں

کیف مستانِ ازل کفر سے آزاد نہیں
بیخودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں،

کہاں دیر و حرم میں جلوۂ ساقی وہ باقی
چلیں میخانے میں اور بیعتِ پیرِ مغاں کرلیں،

مٹایا بے خودی نے نقشِ پندارِ خودی دل سے
رہا باقی نہ کچھ نام و نشاں قطرہ کا دریا میں

جلوۂ حُسن ہر اک شے میں نظر آتا ہے
ماسوا کی کوئی ہستی میرے ایماں میں نہیں

پر پروازِ عنقا لائیں گے گر لامکاں بھی ہو
تمھیں ہم ڈھونڈ لائیں گے کہیں بھی ہو جہاں بھی ہو

اُٹھا اُدھر نقاب اُدھر ہوش اُڑ گئے
چشمک تھی ہم سے برقِ تجلائے یار کو۔

رِش ہو دل جو مئے عشق سے سرشار نہ ہو
سر قلم ہو جو سزاوارِ سرِ دار نہ ہو

حُسن کیا حُسن ہے جلوہ جسے درکار نہ ہو۔
یوسفی کیا ہے جو ہنگامۂ بازار نہ ہو

ہے مقتضائے حُسن کہ دیکھے نہ دیکھ کر
ہے اقتضائے عشق کہ بارِ دگر تو دیکھ

بے تمنائی نے برہم رنگِ محفل کر دیا
دل کی بزم آرائیاں تھیں آرزوئے دل کے ساتھ

ازل سے دل ہے محوِ نازِ وقفِ خود فراموشی،
جو بیخود ہو وہ کیا جانے جفا کیا ہے وفا کیا ہے

پردہ پڑا ہوا تھا غفلت کا چشمِ دل پر
آنکھیں کُھلیں تو دیکھا عالم میں تو ہی تو ہے،

چشمِ ساقی میں وہ کیفیتِ مستی دیکھی
بے مئے و جام و سبو بادہ پرستی دیکھی

دل سی ارزاں نہیں عالم میں کوئی شئے ساحر
بے دلی ہم نے مگر اس سے بھی سستی دیکھی

روشن کئے چراغ دلِ داغ دار نے
اِس گل زمیں میں آگ لگا دی بہار نے

جلوۂ حق نظر آتا ہے صنم میں ساحر
ہے مرے کعبہ کی تعمیر صنم خانوں سے

میں اپنی ہستی موہوم کو مٹاتا ہوں،
کہ دہر میں تری ہستی کا اعتبار رہے

کوئی مستِ جامِ خود بینی ہے کوئی مستِ جام
یہ نشے وہ ہیں کہ چڑھتے اور اُترتے جائیں گے

حُسن میں اور عشق میں جب رابطہ قایم ہوا
غم بنا دل کے لئے اور دل بنا میرے لئے

وہ بھی عالم تھا کہ تو ہی تو تھا اور کوئی نہ تھا
اب یہ کیفیت ہے میں ہی میں کا ہے سودا مجھے

حُسن کو عشق سے بے پردہ بنا دیتے ہیں وہ،
وہ جو پندارِ خودی دل سے مٹا دیتے ہیں

خالی ہاتھ آئیں گے اور جائیں گے بھی خالی ہاتھ
مُفت کی سیر ہے کیا لیتے ہیں کیا دیتے ہیں

بزم میں شمع بھی ہے آپ بھی ہیں شب افروز
دیکھنا یہ ہے کہ پروانے کدھر جاتے ہیں

زندگی میں ہے موت کا نقشہ
جس کو ہم انتظار کہتے ہیں

دیدار شش جہت ہے کوئی دیدہ ور تو ہو
جلوہ کہاں نہیں کوئی اہلِ نظر تو ہو

ہم ہیں اور بے خودی و بے خبری،
اب نہ رندی نہ پارسائی ہے

دیر و حرم ہیں جلوہ گہِ حُسنِ روئے یار
وقفِ نگاہ حُسن خود آرا نظر میں ہے

درِ صنم کدہ کو ہم نے جا کے کھڑکایا
حرم میں جب نہ ہوئے باریاب کیا کرتے

چلے جو ہوش سے ہم بے خودی کی منزل میں
ملا وہ ذوقِ نظر پر اُدھر نہ دیکھ سکے

نظر میں ہیں میرے ساحر وہ حُسن کے جلوے
کہ خیرگی ہو نظر دیکھکر نہ دیکھ سکے،

حرم ہے مومنوں کا بُت پرستوں کا صنم خانہ
خدا ساز اک عمارت ہے مرے پہلو میں جو دِل ہے

ذرہ ذرہ مہرِ عالمتاب کی تصویر ہے
قطرہ قطرہ موجِ بحرِ حُسن عالمگیر ہے

بے لوث ہے دامانِ نظر رنگِ اثر سے
ہے خار بھی گل مجھکو مساواتِ نظر سے

جس کی باطن پہ نظر ہے اُسے آتا ہے نظر
قلب کے آئینے میں حُسن کا تاباں ہونا

سیماب اکبرآبادی

یں جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۰ء بروز دوشنبہ وقت صبح اکبرآباد (آگرہ) کے محلہ نائی منڈی۔ لکو گلی، املی والے مکان میں پیدا ہوا۔ والد ماجد مولانا محمد حسین مرحوم (نور اللہ مرقدہٗ) فاضل عصر اور عالم تبحر تھے۔ اجمیر شریف میں ٹائمس آف انڈیا پرس کی شاخ کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ اپریل ۱۸۹۶ء میں بمقام آگرہ انتقال فرمایا۔

شاعری میرا فطری ذوق اور پدری میراث ہے۔ کتب متداولہ عربی و فارسی کی تکمیل کے بعد حضرت والد مرحوم نے مجھے انگریزی مدرسے میں داخل کر دیا۔ جو گورنمنٹ کالج اجمیر کے تعلق و الحاق کی وجہ سے "برانچ اسکول" کہلاتا تھا۔ برانچ اسکول کے مدارج درس بعجلت طے کر کے جب کالج پہونچا تو وہاں مولوی سدید الدین قریشی اکبرآبادی مرحوم، مولوی تحسین علی اجمیری مرحوم اور مولوی عابد حسین کی عالمانہ اور فاضلانہ توجہات نے میرے اُس ذوقِ شاعری کو بے حجاب کر دیا جو میری فطرت میں ازل سے ودیعت تھا۔ میرا دستور یہ تھا کہ فارسی نصاب میں، جتنے اشعار شریک درس ہوتے تھیں اُن کا ترجمہ اُردو نظم میں کر کے اپنے اساتذہ کے سامنے رکھ دیتا تھا اور یہ مقدس حضرات میری اس جسارت کی حوصلہ افزائی سے پذیرائی فرماتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ مولوی عابد حسین کے سامنے جب میں نے ایک روز بوستاں کی ایک حکایت کا ترجمۂ منظوم پیش کیا تو مولوی صاحب نے میری کاپی کے اُسی صفحے پر پنسل سے یہ شعر لکھ دیا:

جب نہیں ہے شعر کہنے کا شعور
پھر بھلا ہے شعر کہنا کیا ضرور

لیکن ساتھ ہی ساتھ متبسم ہو کر یہ بھی فرما دیا کہ کل پھر کسی فارسی نظم کا ترجمہ نظم ہی میں کر کے لانا۔ غرض یہ میری عادت جاری تھی کہ میں ہاتفی، جامی، سعدی، عرفی، قاآنی وغیرہ کے اشعار و قطعات کا ترجمہ (جن کا انتخاب کلام جزو نصاب تھا) ہمیشہ بصورت نظم پیش کیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ جسارت اتنی بڑھ گئی کہ امتحان کے پرچوں میں بھی میں ہمیشہ فارسی نظم کا ترجمہ اُردو نظم ہی میں کرتا رہا اور صاحب ذوق ممتحن میری اس بدعت سے کبھی چیں بجبیں نہ ہوئے۔

۱۷ سال کی عمر میں مجبوراً کالج چھوڑ دینا پڑا۔ اس وقت میں ایف اے کا آخری امتحان دینے والا تھا۔ والد مرحوم کے انتقال نے سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے سے معذور رکھا۔ بیس سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں بے تکلف شعر کہہ لیتا تھا۔ مگر چونکہ شاہراہِ سخن میں ہنوز کسی کو اپنا رہنما نہیں بنایا تھا۔ اس لئے مشاعرے میں غزل پڑھنے سے کسی قدر جھجک

ہوتی تھی۔

والدِ مرحوم کے انتقال کے بعد اُن کا فرزندِ اکبر ہونے کی حیثیت سے گھر کا تمام بار میرے سر پر آپڑا۔ اور مجھے بہ سلسلۂ معاش کان پور جانا پڑا۔ حکیم ازل لکھنوی، جناب محب لکھنوی اور کانپور کے اکثر شعرا سے مجالست رہی۔ اس زمانے میں وہاں حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا اور قرب و جوار کی وجہ سے کانپور لکھنؤ کے زیرِ اثر تھا۔ لیکن میری طبیعت فطرتاً "دبستانِ دہلی" کی طرف مائل تھی۔ اس لئے میں ۱۸۹۸ء میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا شاگرد ہوگیا۔ لیکن دوسری یا تیسری غزل پر فصیح الملک مرحوم نے لکھدیا کہ "ابھی آپ کو مشق کی ضرورت ہے" اس تنبیہ کے بعد میں نے غزلوں کی ترسیل کچھ عرصہ کے لئے بند کردی اور مشقِ سخن کی طرف متوجہ ہوگیا۔ کئی ماہ تک یہ سلسلۂ مشق اسی طرح جاری رہا۔ اس کے بعد مول گنج (کان پور) میں ایک مشاعرہ کا اعلان ہوا۔ "دم نکلتا ہے کم نکلتا ہے" میں نے ایک غزل کہی اور اُستاد کی خدمت میں حیدرآباد بھیجدی۔ یہ غزل جب بعد اصلاح واپس آئی تو پیشانی پر سُرخ سیاہی سے لکھا ہوا تھا۔ "آفریں ہے، کیا خوب غزل کہی ہے"، بس پھر تو حوصلے بڑھ گئے۔ طبیعت کی جھجک نکل گئی اور میں کانپور اور لکھنؤ کے مشاعروں میں بے تکلف غزل سرائی کرنے لگا۔

اصلاح کا سلسلہ فصیح الملک مرحوم کی وفات سے کچھ پہلے تک جاری رہا۔ اُن کی وفات کے بعد پھر میں نے کسی کو غزل نہ دکھائی۔ نظام مرحوم وارثی تھے۔ کان پور میں وہ اور میں ایک ہی مکان میں (بمقام گوال ٹولی) رہا کرتے تھے۔ اُن کی تشویق سے اُنھیں کی ہمراہی میں ایک دن دیوہ شریف جانے کا اتفاق ہوا اور مرشدی و مولائی حضرت حاجی حافظ سید شاہ وارث علی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مُبارک پر بیعت کی۔ دیکھا جو کچھ دیکھا اور پایا جو کچھ پایا۔

کانپور سے بیمار ہو کر آگرہ آیا۔ آگرہ سے بسلسلۂ ملازمت اجمیر شریف جانا پڑا۔ جہاں کبھی طالب علمانہ زندگی بسر کی تھی۔ پانچ سال تک اجمیر شریف رہکر ۱۹۰۸ء پھر آگرہ آیا۔ اور "رسالہ مرقع" کا مدیر رہا۔ یہاں کچھ روز ٹھہر کر ٹونڈلہ (ضلع آگرہ) بصیغۂ ملازمت جانا پڑا۔ "آگرہ اخبار" کی ادارت بھی ٹونڈلے کی ملازمت کے ساتھ شریکِ مشاغل تھی۔

جب معلوم ہوا کہ فطرت نے مجھے اس لئے پیدا نہیں کیا کہ میں اپنی تمام عمر ذہنی غلامی میں بسر کردوں۔ بلکہ میری تخلیق خدمتِ ادب کے لئے ہوئی ہے۔ اس انکشافِ ضمیری کے بعد میں نے ملازمت کو ابدی استعفا دیدیا اور اکبرآباد (آگرہ) میں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء سے اپنے وطنی مستقر پر قایم و باقی ہوں۔

مری رسائی سے دور ہے تو، مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا ۔۔۔ کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں اُلٹ دیا تھا نقاب تیرا

خود بین و خود شناس ملا خود نما ملا، ۔۔۔ انساں کے بھیس میں مجھے اکثر خدا ملا

اللہ رے شامِ غم مرے دل کی شکستگی، ۔۔۔ تاروں کا ٹوٹنا بھی مجھے ناگوار تھا

اک انقلاب زمانے میں تھا شباب کے بعد
نظر اُٹھی تو کسی چیز پر شباب نہ تھا،

خود قصۂ غم اپنا کوتاہ کیا میں نے
دُنیا نے بہت چاہا افسانہ بنا دینا

نہ پوچھ مجھ سے، ترے جبر و اختیار کی خیر
گناہ ہو نہ سکے، یا گناہ کر نہ سکے

قفس سے چھٹ کے بڑی دیر میں ٹھکانہ لا
خیال سے بھی کہیں دور آشیانہ ملا

جو کچھ کھویا ہے، پروانے ہوں یا ہوں شمع کے آنسو
یہ سب کچھ ایک دن خاکسترِ محفل سے نکلے گا

اے غمِ عشق ترے ظرف میں کچھ آگ بھی ہے؟
آنسوؤں سے تو علاجِ تپشِ دل نہ ہوا

ہے شمع آج صورتِ پروانہ رقص میں،
شاید مزاجِ حسن شریکِ وفا ہوا

اے خادمانِ حُسن یہ کیا انتظام ہے؟
اب تک چراغِ طور پڑا ہے بجھا ہوا

کیوں ہمنشیں یہی تو نہیں ساقیِ بہار؟
جاتا ہے میکدہ سا ہوا پر اُڑا ہوا

ہوش آیا تو ہنسی آ گئی وحشت پہ مجھے
اپنے ہاتھوں میں جب اپنا ہی گریباں دیکھا

ایوانِ تصور سے اپنے، نکلا نہ طلب کی دنیا میں
جب تک ہر ذرے کو میں نے پھیلا کر دنیا کر نہ دیا!

جبیں سائی سے تسکیں، نہ سجدوں سے تسلّی
اُٹھا کر سر میں رکھ لوں، تمہارا نقشِ پا کیا؟

بقدرِ شوق اقرارِ وفا کیا
ہمارے شوق کی ہے انتہا کیا

میں اپنے حال سے خود بے خبر ہوں
تمہاری کم نگاہی کا گلا کیا،

دُعا دل سے جو نکلے کارگر ہو
یہاں دل ہی نہیں، دل سے دعا کیا،

یہ زمیں خود ایک دن کیا جانے کیا بن جائے گی
گر یوں ہی انسان بیوندِ زمیں ہوتا رہا

زندانِ کائنات میں محصور کر دیا
محفل سے اپنی تم نے بہت دور کر دیا

فطرت یہی ازل سے ہے برقِ جمال کی
اس نے جسے تباہ کیا، طور کر دیا،

بدل گئیں وہ نگاہیں، یہ حادثہ تھا اخیر
پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا

کم سے کم فرشتوں کو چین تو ملا دل کا
آپ کی محبت میں آدمی نے کیا پایا؟

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

نہ رہ جائے یہیں نقشِ غلامی بعدِ آزادی
مری تصور کس نے کھینچ دی دیوارِ زنداں پر

مجھے فکرِ وسرِ وفا ہے ہنوز
بادۂ عشق نارسا ہے ہنوز

بندگی نے ہزار رخ بدلے
جو خدا تھا وہی خدا ہے ہنوز

شورِ ہستی ابھی ذرا ٹھہرے
سُن رہا ہوں ضمیر کی آواز

میری بے اختیاریاں کی نہ پوچھ،
نہ حقیقت ہی بس میں ہے نہ مجاز
کر رہی ہے خود آشیاں سے قریب
میرے لیل و نہار کی پرواز

دے اب تو مجھے نہ طعنۂ ہوش،
لے تجھ کو بھی کر دیا فراموش
اب رات نہ آئے یہ دعا ہے
کیا عرض کروں فسانۂ دوش،

کبھی پھول بن کر کبھی اشک بن کر
ہو رنگینیٔ دامن و آستیں تم

دفعتاً سازِ دو عالم بے صدا ہو جائے گا
کہتے کہتے رک گئے جس دن ترا افسانہ ہم
دل جلا، پھر خود جلے، پھر ساری دنیا جل اُٹھی
سوز لائے تھے بمقدارِ پرِ پروانہ ہم

نوید میرے تصور کے دست و بازو کو
حریم حُسن کے پردے اُٹھا رہا ہوں میں
تو انتظار میں اپنے یہ میرا حال تو دیکھ
کہ اپنی حدِ نظر تک تڑپ رہا ہوں میں
جلالِ مشربِ منصور، اے معاذ اللہ!
کسی نے پھر نہ کہا آج تک خدا ہوں میں

صحنِ گلشن میں بنے پھرتے ہیں دامانِ بہار
چند ٹکڑے جو مرے چاک گریباں میں نہیں
ذرا کھل کر پکار اے صورِ مجذوبانِ اُلفت کو
یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں میں

بزمِ افسانہ کرو ختم جوانی گزری،
قابلِ ذکر اب آگے کوئی روداد نہیں
آہ غم خانۂ غربت کی جنوں سامانی،
ہے جہاں تک مری دُنیا کوئی آباد نہیں

معمورۂ فنا کی کوتاہیاں تو دیکھو
اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی میں

میں چاہتا ہوں کہ منزل ہی مُنھ سے بول اُٹھے
فضا شناس کوئی میرے کارواں میں نہیں

ترے جلووں نے مجھے گھیر لیا ہے اے دوست
اب تو تنہائی کے لمحے بھی حسیں ہوتے ہیں

تم نے تو اپنے حُسن کو محفوظ کر لیا
ہم کس کے ساتھ عمرِ محبت بسر کریں؟
جب تو نہیں تو خلوتِ دیر و حرم فضول
اب کیا یہاں پرستشِ دیوار و در کریں؟
اُس مرکزِ جمال پر اب ہے مری نگاہ،
جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں؟
شوقِ دیدار کا کیوں اُن سے اعادہ نہ کریں
لاؤ وہ کام کریں ہم جسے موسیٰ نہ کریں
اُن سے کہتا ہوں جو ہیں شاکیِ بے لطفیٔ عشق
غمِ اُلفت کو شریکِ غمِ دنیا نہ کریں

حجاب اپنی نظر سے تو ہم اُٹھا نہ سکے
انھیں کے حُسن سے پردے اُٹھائے جاتے ہیں
کوئی تو سرخیِ افسانہ یادگار رہے
ہم اپنا خون قفس میں لگائے جاتے ہیں

جنوں کی نذرِ سالانہ کا ساماں دیکھ لیتا ہوں
بہار آتے ہی پہلے میں گریباں دیکھ لیتا ہوں

اسیری میں مذاقِ سیر مٹ جانے کا ماتم کیا
یہ کیا کم ہے در و دیوارِ زنداں دیکھ لیتا ہوں

ہے کوئی اور شے انسانیت میرے تخیل میں
خیالوں میں کبھی تصویرِ انساں دیکھ لیتا ہوں

خمارِ زندگی سے جب خودی کی موج اٹھتی ہو
تو ہنس کر جانبِ گورِ غریباں دیکھ لیتا ہوں

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

صبر آ ہی جائے گر ہو بسر ایک حال میں
امکاں اک اور ظلم ہے قیدِ محال میں

آزردہ اس قدر ہوں سرابِ خیال سے
جی چاہتا ہے تم بھی نہ آؤ خیال میں

تنگ آ کے توڑتا ہوں طلسمِ خیال کو
یا مطمئن کرو کہ تمھیں ہو خیال میں،

دُنیا ہے خواب حاصلِ دُنیا خیال ہے
انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں

بجلی گری اور آنچ نہ آئی کلیم پر
شاید ہنسی بھی آ گئی ان کو جلال میں

عمرِ دو روزہ واقعی خواب و خیال تھی
کچھ خواب میں گزر گئی باقی خیال میں

یوسف کی طرح عشق میں خودداریاں کہاں
ورنہ مذاقِ حُسن زلیخا سے کم نہیں

ہر وقت اُن کے ساتھ ہوں اک انتظام میں
میرا خیال خوابِ زلیخا سے کم نہیں

یہ دنیا اگر میرے قابل نہیں ہے
ترے پاس بس یارب جہاں اور بھی ہیں

بڑھاؤ نہ منزل کی شمعیں ابھی سے
ابھی راہ میں کارواں اور بھی ہیں

حقیر ہوں، مگر اتنا حقیر بھی نہ سمجھ
میں ذرہ بھی تو نہیں ہوں جو آفتاب نہیں

لگائے بیٹھے ہیں اک شمع لاشریک سے لو
ہماری بزم میں پروانہ باریاب نہیں

اگر ہے ذوقِ تماشا تو بند کر آنکھیں
جہاں نگاہ نہیں ہے وہاں حجاب نہیں

برباد حسنِ ظن سے مآلِ وفا نہ ہو
ایسا نہ ہو کہ حقِ محبت ادا نہ ہو

اُلجھا رہا ہوں زلفِ تصور میں دستِ شوق
اور اس طرح کہ موجِ ہوا آشنا نہ ہو

وہ سرخوشی کا وقت ہے جب کائنات میں
دل بولتا ہو اور کوئی بولتا نہ ہو

آ، اور آخری نگہِ یاس دیکھ جا!
شاید پھر اس کے بعد عیادت روا نہ ہو

ہماری خانہ ویرانی زمانے پر عیاں کیوں ہو؟
جلے جتنا نشیمن، سرخ اُتنا آسماں کیوں ہو؟

جوانی اور مرگِ عشق! یہ ہے رقص کا موقع!
غزلخواں ہو مرے ماتم میں کوئی نوحہ خواں کیوں ہو؟

مجھے ہے اعتبار اے ہم نفس اپنی رہائی کا،
بنے جب سے قفس وہ میری شاخِ آشیاں کیوں ہو؟

پروانے سے بھی ہیچ ہے کیا شمعِ زندگی؟
یارب اسے فروغ بقدرِ شرر نہ ہو

بتائیں تو مری ہستی بگاڑنے والے! بگاڑ کر کوئی مجھ کو بنا بھی سکتا ہے
تصورات کی خلوت میں کر تلاش اُس کو تحیرات کی دنیا میں کیوں بھٹکتا ہے!
تجھے نہ دیکھ سکوں میں تو کچھ ملال نہیں، یہی بہت ہے کہ تو مجھ کو تو دیکھ سکتا ہے

اب اے بیدرد کیا اس کے لئے ارشاد ہوتا ہے؟ پھر اپنی خاک سے پیدا دلِ برباد ہوتا ہے!
مٹادو، خاک کردو، پھونک دو، کردو فنا، لیکن ہمارا جذبۂ فطری کہیں برباد ہوتا ہے!

لے لیا کیوں آپ نے الزام میری موت کا اس تباہی میں ابھی گنجائش تقدیر بھی

اشاروں سے نگاہوں سے بہت کچھ منع کرتا ہوں قفس ہی پر جھکی پڑتی ہے شاخِ آشیاں پھر بھی!

میں غافل ہو کے دانستہ خرابِ بزمِ ہستی ہوں سمجھتا ہوں کہ یہ محفل نہیں ہے خوابِ محفل ہے

وہ دل لے کر ہمیں بے دل نہ سمجھیں اُن سے کہدینا جو ہیں مارے ہوئے نظروں کے اُن کی ہر نظر دل ہے

ہر انجمن میں موقعِ وجدان و رقص ہے آزادیٔ طبیعتِ پروانہ چاہیئے،
اے جانے والے نجد کے۔ لازم ہے ترکِ ہوش کچھ احترام تربتِ دیوانہ چاہیئے
نیرنگِ انقلاب ہیں راتیں بہار کی صبحِ چمن کو روز اک افسانہ چاہیئے

مجھے اُس نگاہ پہ ناز ہے، جسے بزمِ ناز میں بار ہے مجھے اُس حجاب پہ رشک ہے جو شریکِ جلوۂ یار ہے
نہ کلی ہے وجہ نظر کشی، نہ کنول کے پھول سے تازگی فقط ایک دل کی شگفتگی سببِ نشاطِ بہار ہے

نہ غرض حرم کے وقار سے نہ صنم کدے کی بہار سے ہمیں کام ہے درِ یار سے، درِ یار پھر درِ یار ہے؟

دینا مجھے فریبِ نویدِ حیات تم جب لوگ جا رہے ہوں جنازا لئے ہوئے
تو اپنی بزمِ ناز کو دیکھ اور ازل کو دیکھ آیا کہاں سے تیری تمنّا لئے ہوئے
اس خاکدانِ عشق کی پہنائیاں نہ پوچھ ذرّے پڑے ہیں وسعتِ صحرا لئے ہوئے
تھی کثرتِ جمال سے تاریک بزمِ دہر آنا پڑا چراغِ تمنّا لئے ہوئے

بیگانگی بقدرِ اصرار و التجا ہے شاید ترے ستم کو اندازۂ وفا ہے!
صانع کی صنعتوں پر سو حُسن کیوں نہ برسیں اپنی کسی ادا کو انسان بنا دیا ہے!

اندازۂ نظر میں تھی حدِ سرِ دو عالم تم پھر بھی دور نکلے اندازۂ نظر سے!
جب ملتفت ہوئی ہے اُن کی سکوں نگاہی چُن چُن کے لے گئی ہے کانٹے دل و جگر سے
خوکردۂ خلش ہوں مجھ سے چرانہ آنکھیں اک دردِ مانگتا ہوں وہ بھی تری نظر سے

اک جہاں میرا شریکِ آرزو محفل میں ہے کاش وہ تیری تمنّا ہو جو میرے دل میں ہے

اپنے دل میں دے جگہ خانہ خرابِ عشق کو
آخر اسے ہیدرو تو بھی تو کسی کے دل میں ہے

سرِ محفل نہ کیوں کھُل کر بیوں میں
اُن آنکھوں سے عنایت ہو رہی ہے

خدا سے مل گیا ہے حُسن کا فخر
خدائی پر حکومت ہو رہی ہے

نہیں تنہائیِ زنداں تحمّل
مجھے سائے سے وحشت ہو رہی ہے

ابھی تک محشرِ انسانیت میں
تلاشِ آدمیت ہو رہی ہے

پہلے خیال، خواب سے تھا طالبِ سکوں
اب خواب ڈھونڈتا ہے پناہیں خیال کی

ہم آپ سیر ہی کر آئیں بزمِ محشر کی!
ابھی تو دیکھنے والے حساب دیکھیں گے؟

یہ فضا، یہ ابر، یہ ٹھنڈی ہوا یہ سبزہ زار
آج تو جنگل کا جنگل قابلِ تصویر ہے

مختلف ہیولوں میں اک مری تمنا تھی
چھپ گئی تو عقبیٰ تھی، مل گئی تو دُنیا تھی

تو ہوس میں دنیا کی زندگی مٹا بیٹھا،
بھول ہو گئی غافل، زندگی ہی دنیا تھی

میں جیا بھی دُنیا میں اور جان بھی دیدی
یہ نہ کھُل سکا لیکن آپ کی خوشی کیا تھی

کنعاں کی برقِ حُسن تڑپتی ہے مصر میں
کتنا وسیع سلسلۂ اضطراب ہے

تو نے سب رشتے وفا کے کر دئے تقسیم بزم،
کیوں نگاہِ ناز، اور میرے گریباں کے لئے!

زندگی دریائے بے ساحل ہے اور کشتی خراب
میں تو گھبرا کر دعا کرتا ہوں طوفاں کے لئے!

کون جانے آسماں سے اُن کو کیا امید تھی
مرتے مرتے بھی جو سوئے آسماں دیکھا کئے

بادل تھے، گل خانے تھے، جھولے تھے، پیمانے تھے
پوچھ رہا ہوں ساقی سے ساون پھر کب آئیں گے؟

دید سے اُن کی مطلب ہے، گھر نہ سہی محشر ہی سہی
ہم دانستہ دیکھیں گے وہ مجبوراً آئیں گے،

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

چمن کے ساتھ کو مدتیں گزریں مگر اب بھی،
چمکتی ہے جو بجلی، آشیاں معلوم ہوتی ہے

ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی تھی وہاں معلوم ہوتی ہے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے؟
کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

یوسف غیور، فطرتِ یوسف غیور تر!
کیا اعتبارِ خوابِ زلیخا کرے کوئی

وصالِ دوست ہے تکمیلِ نقصِ بے خودی کرلے
سنبھل اے بے خبر اب اس سے آگے خود بھی ہے!

شامِ فرقت انتہائے گردشِ ایام ہے
جتنی صبحیں ہو چکی ہیں، آج سب کی شام ہے،

بے خودی کچھ دے گئی ہے اُن کے جلووں کا پتہ
آج خلوت میں اُٹھتا ہے نقابِ دل سے مجھے

پھر تری محفل میں دورِ جام مجھ تک آئے گا
ہے ابھی تو اعتبارِ گردشِ محفل مجھے

خاکسترِ پروانہ میں جو سوز نہاں ہے
جب چاہے پھر اس خاک سے پروانہ بنا دے

اے شمع یہ پروانے کو ہنس ہنس کے جلانا!
کیا ہو جو تجھے بھی کوئی پروانہ بنا دے؟

طور، اے خاکسترِ سوزِ دلِ موسیٰ بتا!
جو دئے تھے برقِ ایمن نے وہ جلوے کیا کئے؟

نہ فرمائیے، نہیں ہے آدمی میں تابِ نظارہ
سنبھل جاؤ، اب اُٹھتی ہے نگاہِ ناتواں میری

مری حیرت پہ وہ تنقید کی تکلیف کرتے ہیں
جنھیں یہ بھی نہیں معلوم نظریں ہیں کہاں میری

پھر اس کے بعد، میرے منھ سے جانے کیا نکل جائے؟
جب اُن کا نام لوں میں، قطع کر لینا زباں میری

پھر میں آیا ہوں ترے پاس اے امیرِ کارواں
چھوڑ آیا تھا جہاں تو، وہ مری منزل نہ تھی

لگی دل کی بھڑک اُٹھی ہے داغِ کہنۂ دل سے
کوئی پروانوں کو آواز دے اُن کی محفل سے

بتا اے وسعتِ کون و مکاں اس کو کہاں رکھیں
ذرا سا دردِ دل لیکر آئے ہیں ہم اُن کی محفل سے

ہے بتدریج آفتِ عالم مذاقِ کافری
ہائے پھر وہ بت، جو پوشیدہ ابھی پتھر میں ہے

کچھ وقت کٹ گیا تھا تری یاد کے بغیر
ہم پر تمام عمر وہ لمحے گراں رہے

یارب مری طرف رہے کچھ دن ہوا کا رُخ
جب آشیاں جلے تو قفس تک دھواں رہے

یوں طوافِ بارگاہِ ناز ہونا چاہئے
آنکھ میں بھی پاؤں کا انداز ہونا چاہئے

اس طرح مجھے ستا رہے ہو
جیسے میرا خدا نہیں ہے

اُس دل پہ نثار دونوں عالم
جس میں کوئی مدعا نہیں ہے

یہ سمجھئے ہے کوئی دیوانہ دنیا میں اُداس
بے سبب جب بزمِ عالم کو پریشاں دیکھئے

دنیا ہے اک افسانہ، کہنے کو تھے پھر سوچا
دنیا ہے خود افسانہ، افسانے سے کیا کہئے

کیا آگئی نیند اہلِ محفل؟
کہنی تھی ہمیں بھی اک کہانی؟

نگاہ و ذہن ہے احساسِ کائنات سے خالی
عجیب چیز ترا انتظار میرے لئے ہے

یہ وہم ہو کہ حقیقت، سکوں اسی سے ہے دل کو
سمجھ رہا ہوں کہ تو بیقرار میرے لئے ہے

ہیں کچھ سُنی ہوئی سی صدائیں فضا میں آج
کیا میرے ہمصفیر بھی زنداں میں آگئے؟

بھاری قدم، نظر متحیر، نفس دراز
کیا ہم حدودِ کوچۂ جاناں میں آگئے؟

ہیں اب صرف انجامِ گلشن نگاہیں
وہ موسم گیا جب نظر چار سو تھی

صدائے صور سے میں قبر میں نہ جاگونگا
کسی سنی ہوئی آواز سے پکار مجھے

آتے بھی ہو تو ابھی نہ آنا،

مرا کفرِ محبت ہے فروغِ جادۂ ایماں
تری محفل میں اپنی نارسائی کی شکایت کیا

بھڑک اُٹھی ہے کیوں دنیا مری اُنکی محبت پہ
اک نشیمن (وہ خاشاک و خس کا مکاں) اور اسپہ یہ غرہ یہ طوبیٰ

تو، اور ارمانِ حرص و ہوا و ہوس، اسکی تکمیل فطرت کرے کیوں
اختیاراتِ فطرت تراشکریہ! چھٹ گئے ہم بڑی کشمکش سے

وہ اُنکا جانا دامن جھٹک کر، وہ بیٹھ جانا دل کا دھڑک کر
وہ شامِ فرقت آفت کی گھڑیاں، اشکوں کی لڑیاں، ساون کی جھڑیاں،
ساون کی بھیگی بھیگی فضا میں، دل کا فسانہ جاگ کے سننا

وہ جس سے سمجھ جائے روداد مرے غم کی
صبر کر اے دلِ بیکس جو ہوا تو برباد،

جتنے ستم کئے تھے کسی نے عتاب میں
ہر چیز پر بہار، ہر اک شے پہ حسن تھا

وصالِ دوست اور میں، اتفاقاتِ محبت ہیں
عبودیت بقدرِ ذوق، شایانِ نوازش ہے

تو کیا سمجھے گا اے بُت ساز یہ پردے کی باتیں ہیں
ہاں فریبِ پردہ سے ہشیار اے اہلِ نظر

لطف تو جب ہے کہ ہو تجھ کو تمنا دید کی
تجھ کو درپردہ سمجھ کر ہو رہا ہوں بے قرار

کب تک دلِ مایوس کو برباد کریں گے
تعجب کیا لگی گر آگ اے سیماب سینے میں

حیرتِ جلوہ گری مُہرِ لبِ خاموش ہے
جوش پر ہے جلوۂ مستانۂ عہدِ شباب
تیری زلفیں بھی نہ نکلی تھیں سوادِ حُسن سے

ہوں محوِ تصور آزمائی

وہ شمعِ دیر ہوں میں روشنی جس کی حرم تک ہے
غنیمت ہے کہ درپردہ رسائی تیری ہم تک ہے

یہ شورش کیوں خلافِ شمع و پروانہ نہیں اُٹھتی
کس قدر تنگ ہیں ہو مرا باغباں، جیسے دنیا میں صحرا نہیں ہے

یہ تو اک آب و گندم کی انگڑائی ہے، یہ تمنا، تمنا نہیں ہے
پہلے کچھ عزم تھے دل میں اچھے بُرے، لیکن اب کچھ ارادہ نہیں ہے

وہ اُنکا آنا وہ شادمانی، ہائے محبت، ہائے جوانی
آنکھوں سے دل تک پانی ہی پانی، ہائے محبت، ہائے جوانی
اپنی کہانی، دل کو سنانی: ہائے محبت، ہائے جوانی

ایسا بھی کوئی ٹکڑا افسانے میں رکھ دینا
ابھی قسمت میں ہے کیا جانئے کیا ہو جانا!

وہ بھی ملائے کر رہے بے حساب میں
دُنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

یہ ہے وہ چیز جو شاید نہ تھی میرے مقدر میں
خلوصِ دل سے اک سجدہ بہت ہے زندگی بھر میں
تراشا جس کو، تھی پہلے سے وہ تصویر پتھر میں

پردہ پردہ ہی تو ہے، کیا جانے کیا پردے میں ہو
اور تیری طرح کوئی دوسرا پردے میں ہو
کیا تماشا ہو جو کوئی دوسرا پردے میں ہو

اب ہم تری امید سے فریاد کریں گے
ہزاروں دل میں انگارے بھرے تھے، لگ گئی ہوگی

آنکھ محوِ دید تھی اتنا مجھے بھی ہوش ہے
او نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے
حسرتِ آوارہ جب سے خانماں بردوش ہے

کیوں ہنسی تو اے اجل، فانی اگر سمجھا مجھے
ایک دن سب کو فنا ہے کیا تجھے اور کیا مجھے!

ہے حصولِ آرزو کا راز ترکِ آرزو
میں نے دنیا چھوڑ دی تو مل گئی دنیا مجھے

کہہ کے سویا ہوں یہ اپنے اضطرابِ شوق سے
جب وہ آئیں قبر پر فوراً جگا دینا مجھے

صبح تک کیا کیا تری امید نے طعنے دئے
آ گیا تھا شامِ غم اک نیند کا جھونکا مجھے

دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا سے میں اُٹھ جاؤں گا
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

کتنے دیوانے محبت میں مٹے ہیں سیماب
جمع کی جائے جو خاک ان کی تو ویرانہ بنے

اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے
دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا

مشربِ قیس کی ترویج نہ کی دنیا نے
کبھی میلہ نہ لگا نجد میں دیوانوں کا

یونہی ہم تم گھڑی بھر کو ملا کرتے تو بہتر تھا
یہ دونوں وقت جیسے روز ملتے ہیں جُدا ہو کر

خوش رہیں کوچۂ جاناں میں ہوا کے جھونکے
دل کے ٹکڑے تو مجھے ڈھونڈ کے لا دیتے ہیں

اے پردہ دار اب تو نکل آ کہ حشر ہے،
دُنیا کھڑی ہوئی ہے ترے انتظار میں!

عمرِ دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

نظر آتا نہیں وحشت میں کہیں دستِ جنوں
اور کھینچے لئے جاتا ہے گریباں کوئی

کسی مردِ وفا کا کوچ ہے پھر اپنے مسکن سے
اُداسی مانگنے آئی ہے دنیا میرے مدفن سے

ہمیں تو یوں بھی نہ جلوے ترے نظر آئے
نہ تھا حجاب، تو آنکھوں میں اشک بھر آئے

چین ملنے سے ہے اُن کے، نہ جدا رہنے سے
آخر اے عشق کسی طرح بسر بھی ہو گی!

ایک وہ شمع نہ ہو گی جو بجھی جل جل کر
شام بھی ہو گی زمانے میں سحر بھی ہو گی

ہم اپنی موت پر دیکھیں کسی کا آنکھ تر کرنا
ہمیں بھی انعقادِ بزمِ ماتم کی خبر کرنا

وہ عالمِ شکستگیِ نازِ الاماں،
جب حُسن خود کسی کے اثر سے تباہ ہو!

ہائے سیماب اُس کی مجبوری!
جس نے کی ہو شباب میں توبہ

ضعف کہتا ہے کہ ہاتھوں سے گرا دے تصویر
درد کہتا ہے کلیجے سے لگا لینے دے

قاتل کا نام لکھ دیا کیوں میری قبر پر
لیتے ہیں راہگیر بھی بوسے مزار کے

ہم کو تو جاگنا ہے ترے انتظار میں
آئی ہو جس کو نیند وہ سوئے مزار میں

ستم زدوں پہ گراں تھی ہوا زمانے کی
جھکی تو پھر نہ اُٹھی شاخ آشیانے کی

فانی بدایونی

میں ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو دنیا میں لایا گیا۔ اب تک کہ دسمبر سنہ ۴۰ء ہے زندہ سمجھا جاتا ہوں۔ نسلاً پٹھان ہوں اصلی وطن کابل ہے۔ اس طرح کہ شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانے میں میرے مورثِ اعلیٰ اصالت خاں نامی ہندوستان آئے دربار دہلی نے انھیں اور اُن کے جانشینوں کو بہت کچھ نوازا۔ ممتاز عہدوں پر فایز کئے جانے کے علاوہ جاگیرات خطابات منصب وغیرہ سے سرفراز کئے گئے۔ نواب بشارت خاں مرحوم جو میرے پردادا تھے صوبہ بدایوں کے گورنر تھے۔ تقریباً دو سو مواضعات پر ان کی جاگیر مشتمل تھی مگر زمانے کے انقلاب نے رفتہ رفتہ یہ نوبت پہونچا دی کہ میرے والد محمد شجاعت علی خاں صاحب جو مورثِ اعلےٰ سے چھٹی پشت میں تھے پولیس کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے تھے چنانچہ قلیل آمدنی کے سہارے پر مرحوم نے اپنی ساری زندگی شرافت دیانت غیرت اور جرأت کے ساتھ گزار دی۔ میری جوان لڑکی نے سنہ ۳۳ء میں انتقال کیا۔ میرے دو لڑکے سعادت علی خاں اور وجاہت علی خاں کے نام سے موسوم ہیں۔ مذہباً میں حنفی ہوں۔

میں نے سنہ ۱۹۰۱ء میں بی۔ اے اور سنہ ۱۹۰۸ء میں ال۔ ال۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔ سنہ ۲۳ء تک لکھنؤ میں اور اس کے بعد سنہ ۳۲ء تک آگرہ میں پیشہ وکالت ذریعہ معاش رہا۔ کچھ سال بدایوں اور بریلی میں بھی وکالت کرتا رہا۔ ۳۲ء سے سنہ ۳۹ء تک حیدرآباد دکن میں صدر مدرس رہا۔ سنہ ۳۹ء کے بعد سے اب تک بیکار ہوں۔ آیندہ کیا ہوگا معلوم نہیں۔ مختصراً ننگ خاندان بھی ہوں اور بار زمین بھی۔ میری ہستی کسی اور کے لئے تو کیا مفید ہوتی۔ خود میرے لئے نہیں۔

میری موجودہ تصنیفات دیوان فانی مطبوعہ نقیب پریس بدایوں سنہ ۲۰ء۔ باقیات فانی مطبوعہ آگرہ اخبار پریس آگرہ سنہ ۲۶ء اور عرفانیات فانی مطبوعہ لطیفی پریس دہلی سنہ ۳۹ء ہیں۔ باقی تصانیف تلف ہوگئیں۔

فانی

اب تک تری گلی میں یہ رسوائیاں نہ تھیں ، اب تک تو اس زمیں پہ کوئی آسماں نہ تھا
ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھی بجلیوں کو لاگ ہر شاخ ہر شجر پہ مرا آشیاں نہ تھا
اللہ رے بے نیازیِ آداب التفات دیکھا مجھے تو پائے نظر درمیاں نہ تھا
تو نے کرم کیا تو بعنوان رنج زیست غم بھی مجھے دیا تو غم جاوداں نہ تھا

مفت دو عالم ہے وہ تیرِ نگاہ
جو مری شامت سے خطا ہو گیا،

آگئی ہے ترے بیمار کے مُنھ پر رونق
جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا،

رسم خودداری سے گو واقف نہ تھی دنیائے عشق
پھر بھی اپنا زخم دل شرمندۂ مرہم نہ تھا،

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانیکا،

حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

مذاق تلخ پسندی نہ پوچھ اُس دل کا
بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا،

مری حیات ہے محروم مدعائے حیات
وہ رہگزر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا،

یوں سب کو بھلا دے کہ تجھے کوئی نہ بھولے
دُنیا ہی میں رہنا ہے تو دُنیا سے گزر جا

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا،

کیا کیا گلے نہ تھے کہ ادھر دیکھتے نہیں،
دیکھا تو کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں،
اک بے قرار تڑپا اک دل فگار رویا

ایک عالم کو دیکھتا ہوں میں،
یہ ترا دھیان ہے مجسّم کیا

فرصتِ رنجِ اسیری دی نہ ان دھڑکوں نے ہائے
اب خبری صیاد نے لی اب قفس کا در کھُلا

منزلِ عشق پہ تنہا پہونچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

دل پہ جو نگاہیں تھیں رفتہ رفتہ آہیں تھیں،
عشق بن گیا آخر حُسن جلوہ ساز اُن کا

رفتۂ نظر ہو جا سب سے بے خبر ہو جا
کھُل گیا ہے راز اپنا کھل نہ جائے راز اُن کا

میرے سوا تھے اور جو پردے سارے کے سارے چاک ہوئے
یہ بھی اگر اللہ نے چاہا اب کوئی دن میں چاک ہوا

فریب جلوہ اور کتنا مکمل اے معاذ اللہ
بڑی مشکل سے دل کو بزمِ عالم سے اُٹھا پایا

وحشت بقید چاک گریباں روا نہیں
دیوانہ تھا جو معتقد اہلِ ہوش تھا

ہائے کیا دن ہیں کہ نقش سجدہ ہے اور سر نہیں
یاد ہیں وہ دن کہ سر تھا اور وبالِ دوش تھا

عشق کی دنیا زمیں سے آسماں تک شوق تھی
تھا جو کچھ تیرے سوا آغوش ہی آغوش تھا

بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ
کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

غیرت ہو تو غم کی جستجو کر
ہمت ہو تو بے قرار ہو جا

ملا ازل میں مجھے اپنی زندگی کے عوض،
وہ ایک لمحۂ ہستی کو صرف خواب ہوا

بوئے خزاں سے مست ہیں یاد ہمیں بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا،

اپنے کمالِ شوق پر حشر کا دن ہے منحصر
وعدۂ دید چاہئے زحمتِ انتظار کیا

سُن کے ترا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج ترا نام لیکر کوئی غافل ہوگیا

کیا سوال تو آواز بازگشت آئی،
جواب مجھ سے طلب ہے مرے سوالوں کا

نگہِ قہر خاص ہے مجھ پر
یہ تو احساں ہوا ستم نہ ہوا

اب کرم ہے تو یہ گلہ ہے مجھے
کہ مجھی پر ترا کرم نہ ہوا

گل ہیں وہ اب نہیں ہے جو عالم تھا خار کا
اللہ کیا ہوا وہ زمانہ بہار کا

تنکوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم
آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

گھر خیر سے تقدیر نے ویرانہ بنایا
سامانِ جنوں مجھ سے فراہم نہ ہوا تھا

بالیں پہ تم جب آئے تو آئی وہ موت بھی
جس موت کے لئے مجھے جینا ضرور تھا

تھی اُن کے روبرو بھی وہی شانِ اضطراب
دل کو بھی اپنی وضع پہ کتنا غرور تھا

آئینہ اب نہیں دیکھا جاتا،
میں بعنوانِ دگر یاد آیا

اُس کو بھولے تو ہوئے ہو فانی
کیا کروگے وہ اگر یاد آیا

باخبر ہیں وہ سب کی حالت سے
لاؤ ہم پوچھ لیں نہ حال اپنا

لنگر کا آسرا ہے نہ تائیدِ ناخدا
میرے سپرد ہے مری کشتی خدا کے بعد

اللہ رے اعتمادِ محبت کہ آج تک
ہر درد کی دوا ہیں وہ اچھا کئے بغیر

ممکن نہیں ہے راحتِ دُنیا کی آرزو
غم پر گمانِ راحتِ دُنیا کئے بغیر

تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

نگاہیں ڈھونڈتی ہیں دوستوں کو اور نہیں پاتیں
نظر اُٹھتی ہے اب جس دوست پر پڑتی ہے دشمن پر

کھُل گیا میری زندگی کا راز
اے شبِ ہجر تری عمر دراز

مست کو چاہئے بلا کا ہوش،
خُم دئے اور دیا نہ اذنِ خروش

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہونچی تری جوانی تک

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانی
وجودِ درد مسلّم علاج نا معلوم

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

جیئے جانے کی تہمت کس سے اُٹھتی کس طرح اُٹھتی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں،

بہلا نہ دل نہ تیرگیِ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

کس زعم میں ہوائے رہِ رہروِ غم دھوکے میں نہ آنا منزل کے
یہ راہ بہت کچھ چھانی ہے اس راہ میں منزل کوئی نہیں

ہاں اے یقین وعدہ دامن ترا نہ چھوٹے
یہ آسرا نہ ٹوٹے وہ آئیں یا نہ آئیں،

میری نظروں میں تو بے واسطۂ دید ہے تو
میں بہ عنوانِ تجلّی بھی تجھے یاد نہیں

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

دل میں آتے ہوئے شرماتے ہیں،
اپنے جلووں میں چھپے جاتے ہیں،

نامہربانیوں کا گلہ تم سے کیا کریں
ہم بھی کچھ اپنے حال پہ اب مہرباں نہیں

تسکین عجیب چاہتا ہوں
دشمن کا نصیب چاہتا ہوں

تم دل میں بھی رہ کے دور سے ہو،
کچھ اور قریب چاہتا ہوں

غم بھی گزشتنی ہے خوشی بھی گزشتنی
کر غم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو

بہار لائی ہے پیغامِ انقلابِ بہار
سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو

زمانہ برسرِ آزار تھا مگر فانی
تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

کافر صورت دیکھ کے منھ سے آہ نکل ہی جاتی ہے
کہتے کیا ہو اب کوئی اللہ کا یوں بھی نام نہ لے

اک برق سرِ طور ہے لہرائی ہوئی سی
دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

درپیش ہے پھر مسئلۂ طاقتِ دیدار،
پھر کچھ نگہِ شوق ہے گھبرائی ہوئی سی

اک عالمِ دل ہے یہی دنیا یہی فردوس
ہر شے نظر آتی ہے نظر آئی ہوئی سی

گو نہیں جز ترکِ حسرت دردِ ہستی کا علاج
آہ وہ بیمار جو آزردۂ پرہیز ہے

عہدِ خرد میں عشق کی رسوائیاں نہ پوچھ
آنے لگی ہے ذکرِ وفا سے حیا مجھے

اس کے سوا نہیں خبرِ آشیاں مجھے
میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں
آواز آ رہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی

خالی ہے بزمِ ذوقِ طلب اہلِ ہوش سے
اتنا نہیں کہ تیری تمنا کرے کوئی

خفا نہ ہو تو یہ پوچھوں کہ تیری جان سے دور
جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے

ترکِ تدبیر کو بھی دیکھ لیا
یہ بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی

یوں ملی ہر نگاہ سے وہ نگاہ
ایک کی ایک کو خبر نہ ہوئی

آج تسکینِ دردِ دل فانی
وہ بھی چاہا کئے مگر نہ ہوئی

اُن سے تو دل سے نقش کدورت بھی مٹ گیا
ہم شاد ہیں کہ دل میں کدورت نہیں رہی

فانیؔ امیدِ مرگ نے بھی دیدیا جواب
جینے کی ہجر میں کوئی صورت نہیں رہی

آمادۂ فریاد رسی ہے وہ ستمگر
فریاد کہ اب طاقتِ فریاد نہیں ہے

تعمیر آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق
جب ہم نے کوئی شاخ چُنی شاخ جل گئی

طبیعت رفتہ رفتہ غم کی خوگر ہوتی جاتی ہے
جفا کم کر جفا اب روح پرور ہوتی جاتی ہے

سرکار پاسِ وضعِ جفا چاہتا ہوں میں
یہ بھی اگر وفا ہے تو اچھا نہ کیجئے

نہیں معلوم راہِ شوق میں ہے بھی کوئی منزل
جہاں تھک کر نظر ٹھیرے وہیں معلوم ہوتی ہے

زندگی خود کیا ہے فانیؔ یہ تو کیا کہئے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

اک بوند لہو کی ہے تو یہ حال ہے دل کا
وہ موجِ تبسّم کہیں دریا نہ بنا دے

نہ دل کے ظرف کو دیکھو نہ طور کو دیکھو
بلا کی دُھن ہے تمھیں بجلیاں گرانے کی

کل تک جو تم سے کہہ نہ سکا حالِ اضطراب
ملتی ہے آج اُس کی خبر اضطراب سے

مدعا ہے کہ مدعا نہ کہوں
پوچھتے ہیں کہ مدعا کیا ہے

دُشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے
تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

وہم و قیاس کے سوا حاصلِ ہوش کچھ نہیں
فہم کی انتہا ہے وہم عقل کی حد قیاس ہے

زندگی یادِ دوست ہے یعنی
زندگی ہے تو غم میں گزرے گی

آپ نے عہد کیا ہے مری غمخواری کا
اب اجازت ہو تو یہ عہد، مجھے یاد رہے

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات
مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

ہم کہاں اور نگاہِ شوق کہاں
وہ بھی تیری نگاہ ہوتی ہے

کچھ نظر کہہ گئی زباں نہ کھلی
بات اُن سے ہوئی مگر نہ ہوئی

شیوۂ عاشقی نہیں ہجر میں آرزوئے مرگ
ہاں نہیں زندگی عزیز موت ہی زندگی سہی

بساطِ عجز میں اک آہ تھی متاعِ حیات
سو وہ بھی صرفِ ستم ہائے روزگار ہوئی

جینے بھی نہیں دیتے مرنے بھی نہیں دیتے
کیا تم نے محبت کی ہر رسم اُٹھا ڈالی

بچھ گئے راہِ یار میں کانٹے
کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے

ترکِ امید بس کی بات نہیں ورنہ امید کب بر آئی ہے
اک فسانہ سُن گئے اک کہہ گئے میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے
کچھ کھیل نہ تھا یوں بھی پروانے کا جل بجھنا، جل کر نہ بجھے ایسے پروانے کو کیا کہئے
موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانیؔ گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے
محشر میں جبرِ دوست سے طالب ہوں داد کا آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے
پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا جب ذکرِ بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی
میں نے فانیؔ ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے
ہاں ناخنِ غم کمی نہ کرنا، ڈرتا ہوں کہ زخمِ دل نہ بھر جائے
کر خوئے جفا نہ یک بیک ترک کیا جانئے مجھ پہ کیا گزر جائے
زباں کٹتی ہے ذکرِ آشیاں پر تمنّا بھی بہت تھی آشیاں کی
وہ ہم سے کہاں چھپتے ہم خود ہیں جواب اُنکا محمل میں جو چھپتے ہیں چھپتے نہیں محمل سے
ہر راہ سے گزر کر دل کی طرف چلا ہوں کیا ہو جو اُن کے گھر کی یہ راہ بھی نہ نکلے
شکوہ نہ کر فغاں کا وہ دن خدا نہ لائے تیری جفا پہ دل سے جب آہ بھی نہ نکلے
لو تبسّم بھی شریکِ نگہِ ناز ہوا آج کچھ اور بڑھا دی گئی قیمت میری
دو گھڑی کے لئے میزانِ عدالت ٹھیرے کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے
کچھ ادائیں ہیں جنھیں قتلِ عبث ہے منظور کچھ سزائیں ہیں جو ملتی ہیں خطا سے پہلے
وہ میری لاش پہ تہمت سی کچھ اُٹھا کے چلے، مجھے قرار سے دیکھا تو مسکرا کے چلے،
کرم کیا تو باندازۂ تبسّمِ برق، وہ کچھ خیال میں آئے ہی تھے کہ آ کے چلے
گل دئے تھے تو کاش فصلِ بہار تو نے کانٹے بھی چُن لئے ہوتے
سوالِ دید پہ تیوری چڑھائی جاتی ہے مجالِ دید پہ بجلی گرائی جاتی ہے
مرے قیاس کو اپنی تلاش میں کھو کر، مرے حواس کو دُنیا دکھائی جاتی ہے
چونک پڑتے ہیں ذکرِ فانیؔ سے نیند اُچٹتی ہے اس کہانی سے
بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی منھ پھیر لیا ہم نے تو دُنیا نہ رہے گی
پچھتائیں گے آپ دل کو لیکر کم بخت غمِ آشنا بہت ہے
تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

زندگی کی دوسری کروٹ تھی موت
زندگی کروٹ بدل کر رہ گئی،

کیا بلا تھی ادائے پرسشِ یار
مجھ سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

ترے فراق میں حالت تباہ سہی ہے تباہ
نہ دل پہ ہاتھ نہ اب سوئے آسماں ہے نگاہ

رسمِ بیداد دوست عام ہوئی
تلخیٔ زیست بھی حرام ہوئی

گو ہستی تھی خواب پریشاں نیند کچھ ایسی گہری تھی،
چونک اُٹھتے تھے ہم گھبرا کر پھر بھی آنکھ نہ کھلتی تھی

رودادِ مرگ و زیست ہے یہ قصہ مختصر
مجبورِ زندگی کو بھی جینا محال ہے

مطلب ہے ضبط عشق سے تاثیرِ دردِ عشق
اخفائے حال سے غرض افشائے حال ہے

کس کو یہاں امید اثر ہم دل کو سمجھا لیتے ہیں
حالِ دل اس سے یوں کہتے ہیں گویا اک افسانہ ہے

کرم بے حساب چاہا تھا
ستم بے حساب میں گزری

کچھ کٹی ہمت سوال میں عمر
کچھ امید جواب میں گزری

وعدے کے یہ تیور ہیں کہدوں کہ یقیں آیا
اب اُن سے کوئی کیونکر کہدے کہ نہیں آیا

جھوٹ ہی سہی وعدہ کیوں یقیں نہ کر لیتے
بات دلفریب اُن کی دل امیدوار اپنا

طول رودادِ غم معاذ اللہ
عمر گزری ہے مختصر کرتے

اب نہ کانٹوں ہی سے کچھ لاگ نہ پھولوں سے لگاؤ
ہم نے دیکھا ہے تماشا تری رعنائی کا

مزاج دہر میں اُن کا اشارہ پائے جا
جو ہو سکے تو بہر حال مسکرائے جا

یہ تو برے آثار ہیں فانیؔ غم ہو خوشی ہو کچھ تو ہو
دل کا یہ کیا حال ہوا مغموم نہیں مسرور نہیں

یاد ہے وہ نومیدی میں ہلکی سی جھلک امیدوں کی
ہائے وہ دل کے ویرانے پر دھوکا سا آبادی کا

یاس و امید سے کام نہ نکلا دل کی تمنا دل میں رہی
ترک تمنا کر نہ سکے اظہار تمنا ہو نہ سکا،

ہائے وہ پہلی نظروں میں ہر موج کا ساحل بن جانا
بحرِ بے پایانِ محبت کی پایابی کیا کہئے،

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حشر انھیں معلوم نہیں
کلیوں کا یہ طرزِ تبسم یہ شادابی کیا کہئے،

دل کی جو حقیقت ہو کیا کہئے حُسن بھی دل ہے عشق بھی دل
ہر شمع جلائے جاتی ہے پردے میں کسی پروانے کے

حرفِ تمنا بے معنی سا نقش وفا سو دُھندلا سا،
دل کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے دل کی حقیقت کیا کہئے

حشر بھی گزرا حشر میں بھی یہ سوچ کے ہم نے کچھ نہ کہا
غم کی حکایت کون سنے گا غم کی حکایت کیا کہئے

کیا عمر میں اک آہ بھی بخشی نہیں جاتی
اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے

زندگی بے دلوں پہ تہمت تھی
مر نہ جاتے اگر جئے ہوتے

فراق گورکھپوری

۱۸۹۶ء میں شہر گورکھپور میں پیدا ہوا، یہ سری واستو کایستھوں کا خاندان پورے چار سو برس سے ضلع گورکھپور میں آباد ہے میرے بزرگوں کو پانچ گاؤں شیر شاہ کے دئے ہوئے اسی ضلع میں آباد ہیں اور ہم لوگ پنچگاواں کے کایستھ کہلاتے ہیں۔ میرے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت چوٹی کے وکیلوں میں تھے اور ان کا نام حالی اور آزاد کے ساتھ ساتھ جدید اُردو شاعری کی تاریخ میں لیا جاتا تھا۔ میری تعلیم گھر پر شروع ہوئی۔ والد مرحوم کی تعلیم تو عربی اور فارسی کے باقاعدہ اکتساب سے شروع ہوئی تھی اور جب ان زبانوں میں دسترس ہو گئی تب وہ انگریزی اور وکالت کی طرف مائل ہوئے لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا، اُردو کی دو تین کتابیں ختم کرنے کے بعد ہی انگریزی کی باقاعدہ تعلیم شروع ہو گئی۔ ایف۔ اے کا امتحان فارسی کے ساتھ دیا لیکن بی۔ اے میں فارسی چھوڑ دی۔ غرضکہ جہاں تک اسکول اور کالج کے باقاعدہ یا بے قاعدہ تعلیم کا تعلق ہے انگریزی زبان اور مغربی علوم ہی کو اہمیت رہی۔ مگر دل و دماغ کی تہیں اور گہرائیاں انگریزی زبان اور مغربی علوم سے کب آسودہ ہو سکتی تھیں۔ جب تک کوئی حقیقت، شعر و نغمہ یا حسن کی شکل میں شعور میں نہ اتر جائے مجھے تشفی نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے انگریزی تعلیم تو زندگی کے اسٹیج کا ایک پردہ تھا با وجود اپنے تمام آب و تاب کے۔ پس پردہ جو محرکات کارگر تھے انھیں کوئی اور الفاظ ہاتھ نہ آنے کی وجہ سے حسن و عشق ہی کہہ لیجئے۔ بچپن ہی سے خوش قسمتی یا بد قسمتی سے طبیعت بہت حساس تھی اپنے ہم عمروں اور ہم جماعتوں میں سات ہی آٹھ سال کی عمر سے جس سے یگانگت یا دوستی ہو گئی اسے اُٹھا کر کلیجے میں رکھ لینے کا جی چاہتا تھا۔ گانے اور نغمے اسی عمر سے اس طرح متاثر کرتے تھے کہ ان گُونگ کیفیتوں کی یاد سے اب بھی گھبرا جاتا ہوں ایک بچے کے نرم قویٰ، شدید تاثرات کے آسانی سے حامل نہیں ہو سکتے۔ سور داس کے نغمے اور دیگر ہندی نغمے تلسی داس کی رامائن کا ترنم خاص طور سے متاثر کرتے رہے جو اُردو اشعار یا نظمیں درسی کتابوں یا دوسری کتابوں میں یا لوگوں کی زبانی سننے کے موقعے ملتے تھے وہ بہت کچھ تو خشک اور کرخت اور بے رس چیزیں معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن ان میں جو اشعار مترنم ہوتے تھے وہ ملیں ڈوب جاتے تھے اور چونکہ ہماری روزمرہ کی بولی میں ہوتے تھے اس لئے ایسے اشعار کا اثر بہت ہوتا تھا۔ کچھ نظمیں اور غزلیں والد مرحوم کی بچپن ہی سے ورد زبان رہتی تھیں اور کچھ دوسروں کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ کہانیاں وہ واقعے وہ مناظر بہت متاثر کرتے تھے جن میں میری بچپن کی ذہنیت کوئی بات پاتی تھی۔ انسانی حسن کا اثر تو یہ ہوتا تھا کہ بیک وقت

محبت اور زندگی کا گویا سامنا ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ غصہ اور نفرت بھی کچھ لوگوں سے اور کچھ باتوں سے میرے لئے ناقابلِ برداشت اور بے مفر چیزیں تھیں جتنی شدید محبت تھی اتنی ہی شدید نفرت بھی یا جتنا تیز حُسن کا احساس تھا اتنا ہی تیز قبح کا احساس تھا۔ مگر بہ حیثیت مجموعی حیات اور کائنات کے لئے ہم آہنگی محبت و احترام کے جذبے اور تحیر کی کیفیت میری زندگی اور میرے وجدان کے خاص عناصر تھے۔ ان کے تصور سے گویا میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے اور اسی مرکزی مستقل جذبے کی تشفی مغربی علوم سے نثر کی کتابوں سے اور تمام دیگر ذرایع سے ہوتی رہی۔ گھبراہٹ اور بے صبری اور تنہائی کا احساس بھی شروع ہی سے اتنا تیز تھا کہ اب تک فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کو کیا کہوں۔ قریب قریب بتیس برس کے مجموعی تاثرات شاید میرے ان دو چار اشعار میں کچھ ظاہر ہو گئے ہوں:

اسی دل کی قسمت میں تنہائیاں تھیں ۔۔۔ کبھی جس نے اپنا پرایا نہ جانا،

ہزار غم ہو نہیں چاہتا کوئی لیکن ۔۔۔ کہ اس کے بدلے کوئی اور زندگی ہوتی

اے ساکنانِ دہر یہ کیا اضطراب ہے ۔۔۔ اتنا کہاں خراب جہانِ خراب ہے

ترک محبت کرنے والو کون بڑا جگ جیت لیا ۔۔۔ عشق سے پہلے کے دن سوچو کون ایسا سکھ ہوتا تھا

بہر حال یہ سب باتیں پسِ پردہ ہوتی رہیں اور رسمی تعلیم جاری رہی اور دبے پاؤں زندگی نما موت یعنی جوانی بھی آ گئی۔ شادی بھی ہو گئی اور ازدواجی زندگی اتنی ناخوشگوار ثابت ہوئی کہ میں یہ کہہ نہیں سکتا کہ اس نے مجھے بگاڑ دیا یا بنا دیا شاید دونوں حالتوں میں زیادہ فرق نہیں۔ اس کے بعد بی۔ اے ہوئے، نوکر ہوئے (لیکن ابھی) پنشن (نہیں) ملی اور (نہ ابھی) مر گئے۔ بی۔ اے کے امتحان کے بعد ہی والد مرحوم کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور غم روزگار کا بار سر پر پڑ گیا۔ ڈپٹی کلکٹری کی ملازمت اور یونیورسٹی کی پروفیسری بی۔ اے کے بعد ہی مل گئی تھی اور آئی سی ایس کے لئے گورنر نے نام زد کر دیا تھا لیکن ازدواجی زندگی کی تلخی نے اتنا بیدل کر دیا تھا کہ حبِ وطن یا جھوٹی سچی خدمتِ وطن میں پناہ لینا چاہی۔ تمام ملازمتوں سے انکار کر کے کانگریس میں شامل ہو گیا اور قیدِ فرنگ کی سیر بھی کی۔ یہ سنہ ۱۹۲۲ء تک کا ذکر ہے اس کے بعد لکھنؤ کرسچین کالج میں، پھر کانپور سناتن دھرم کالج اور اب الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کا لکچرار ہوں۔ بدنصیبوں میں تقدیر کی یہ بھی ستم ظریفی ذرا قابلِ ذکر ہے کہ ہر امتحان میں چوٹی کی کامیابی حاصل ہوتی رہی۔ لیکن خوش ہونے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ مجھ سے زیادہ خوش وہ ہوتے تھے جو صرف تھرڈ ڈویژن میں کامیاب ہوتے رہے۔ میرے لئے آج تک کامیابی اور خوشی ایک چیز نہ ہو سکیں۔

اچھا اب لگے ہاتھوں اپنی شاعری کے بارے میں کچھ گزارش کر دوں۔ جی تو بچپن ہی سے شعر کہنے کو چاہتا تھا لیکن بچپن کی صلاحیتیں یہ بار برداشت نہ کر سکتی تھیں میرے والد امیر مینائی کی شاعری سے متاثر نہ تھے لیکن میرے پھوپھی زاد بھائی منشی راج کشور لال تحرؔ مجھ سے محبت کرتے تھے امیر مینائی کی شاعری کے بہت دلدادہ تھے۔ اب میں جو غور کرتا ہوں تو بچپن سے امیر مینائی کی شاعری سے لگاؤ کا یہ سبب پاتا ہوں کہ امیر کے کلام میں۔ ان کی لے میں ٹھہراؤ اور بہاؤ کا ایک ایسا

امتزاج ہے جو غیر شعوری طور پر مجھے اس سے ہم آہنگ کر دیتا تھا۔ شاید یہ اثر ان کے کلام میں غیر شعوری طور پر مصحفیؔ کے کلام کے مطالعہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ بہرحال خود تو شعر کہنے کے لئے جھک مارا کرتا تھا اور ایک مصرع بھی مجھ سے نہ ہوتا تھا۔ لیکن بی۔ اے کلاس تک امیرؔ مینائی ہی کی شاعری اور لب و لہجہ یا یوں کہئے کہ ان کے اشعار میں جو آواز تحت الشعر تھی، اسی سے متاثر ہوتا رہا۔ پھر عزیزؔ لکھنوی۔ شادؔ عظیم آبادی اور ناصریؔ مرحوم کی صحبت کے اثر سے میرؔ۔ دردؔ۔ غالبؔ کی آوازیں میرے دل میں اُترتی گئیں۔ حسرتؔ۔ اصغرؔ۔ یگانہؔ۔ اقبالؔ کے کلام سے بھی فیضیاب ہوتا رہا ہوں۔ اور فارسی شعراء سے بھی۔ ساتھ ہی ساتھ انگریزی ادب کو بھی اپنے اندر یوں تحلیل کرتا رہا کہ اس کی آواز اپنی آواز میں ڈھلتی جائے۔ جب ہمیں جا کر بی۔ اے میں پہلی غزل کہی۔ یہ ۱۹۱۶ء کی بات ہے۔ دو چار غزلیں ناصریؔ مرحوم نے دیکھیں بعد کو دو چار غزلیں حضرت وسیمؔ خیر آبادی کو دکھائیں۔ پھر کسی سے اصلاح کی نوبت نہ آئی۔ بلکہ شاعروں کے بدلے مجنوںؔ گورکھپوری، پریم چند آنجہانی اور حضرت نیازؔ فتحپوری نثر نگار حضرات کی صحبتوں کا زیادہ اثر میری ادبی زندگی پر رہا۔ ہاں جوانی اور تنہائی اور گناہِ عشق کا بھی ساتھ رہا اور اس کے جو نتائج ہو سکتے تھے وہ بھی ہوتے رہے۔ سچ پوچھئے تو شعر کہنے کا شروع میں تو ممکن ہے شوق ہی رہا ہو۔ لیکن جب سے جواں ہو کر زندگی کی تلخیوں کو یعنی ہوکے گھونٹ کو شیر و شکر کرکے اُتارنا پڑا تب سے شاعری گویا زندگی کی تلاش کا ایک ذریعہ بن گئی۔ شاید زندگی کو شعر میں تحلیل کرنا اور شعر کو زندگی کا آئینہ بنانا مقصدِ زندگی ہو۔ کون جانے۔

میرے چند احباب شروع ہی سے میری شاعری کی ایک خصوصیت اتحاد اور اجتماع ضدین اور (Paradox) بتاتے ہیں۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ نفرت و محبت حسن و قبح کا شدید ترین احساس کرتے ہوئے حیات اور کائنات پر میرا ایمان قایم رہا۔ کفر اور ایمان دونوں لحاظ سے وحدتِ وجود کا قایل رہا۔ پھر تلخی ناکامی حسرتوں کا خون ہونا اور جدلیت پذیر وحدت کا احساس اتحاد ضدین (Reconciliation of opposites) کی صفت میرے وجدان اور میری شاعری میں کیوں نہ پیدا کر دیتی۔ مجھے تو زخم ہی کا مرہم بنانا تھا۔ پھر کیا کرتا۔ اگر درد بھری آواز میں سکون نہیں تو وہ نغمہ کہاں، چیخ ہو گئی۔ میں شاعری میں لہجہ کو سب سے ضروری چیز سمجھتا ہوں۔ اسی لہجہ میں شاعر کی شخصیت چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ شاعری تمام عالم کے دُکھ درد کے احساس کو بغیر کم کئے ہوئے اگر اس میں نرمی اور جزو برکت سمو سکے تو اس میں قوتِ شفا (Healing Power) آجاتی ہے اور شاید یہی چیز شاعری کو عظمت دے سکتی ہے

رگھوپتی سہائے فراقؔ

اک فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی
اس بھری دُنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

تیرے چھونے سے بھی دُکھے جو
کون اُس دل کی پھانس نکالے

حیات ہو کہ اجل، سب سے کام لے غافل
کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے

تو نے بھرم غمِ عشق کے کھوئے
اے غمِ دوراں اے غمِ دوراں

یوں ہی فراق نے عمر بسر کی،
کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اُٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے،

کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر
بات پہونچتی ہے کہاں سے کہاں

بسا اوقات دل کے ساتھ بارِ غم اُٹھانے میں
سُنا ہے حُسن بھی اپنی نزاکت بھول جاتا ہے

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اُٹھتا ہے
بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

کچھ گراں ہو چلا ہے بارِ نشاط
آج دیکھتے ہیں حُسن کے شانے

پھر دل پہ ہے نگاہ کسی کی رُکی رُکی،
کچھ جیسے کوئی یاد دلاتا ہو آج پھر

سنگ و آہن بے نیازِ غم نہیں،
دیکھ ہر دیوار و در سے سر نہ مار

تری یاد کرتا ہوں اور سوچتا ہوں
محبت ہے شاید تجھے بھول جانا

اسی دل کی قسمت میں تنہائیاں تھیں
کبھی جس نے اپنا پرایا نہ جانا

عشق میں صبر و قرار بھی آئے
تم بھی جو آجاتے اچھا تھا

نگاہِ یار کب تک یہ فریبِ ہمت افزائی
یہیں تک عشق مشکل تھا یہیں سے عشق آساں ہے

جہاں میں تھی فقط افواہ تیرے جلووں کی،
چراغِ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا

یہ سمجھ کر رہگذارِ جستجو میں رکھ قدم،
اس کا پانا سہل اس کا ڈھونڈھنا دشوار ہے

فرق نازک ہے اسے کیونکر بیاں کیجئے فراق
صبح کرنا سہل شب کا کاٹنا دشوار ہے!!

شام بھی تھی دُھواں دُھواں حُسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں،

پچھلے پہر شبِ فراق کون یہ مجھ سے کہہ گیا
تیرا جواب پھر کہاں تو جو یہ درد سہہ گیا

اس سے زیادہ اور کیا اب کوئی نامراد ہو
آج نظر سے گر چلیں عشق کی کامرانیاں

ابھی فطرت سے ہونا ہے نمایاں شانِ انسانی
ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

آہ ان مست نگاہوں کے اشارے بھی فراق
ہم سمجھنے کو بہت سمجھے مگر کیا سمجھے

قفس سے چھٹکے وطن کا سُراغ بھی نہ ملا
وہ رنگِ لالہ و گُل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

جب دیکھو اس کو، ہے یہ عالم
اک انگڑائی آئی ہوئی سی

ہجر میں پچھلے پہر کا عالم
تاروں کو نیند آئی ہوئی سی

تعجب کیا ترے آگے جو ہم کچھ چپ سے رہتے ہیں — ہمارے اے دوست لاکھوں خواب حائل ہیں
قول و قرارِ حسن بھی خواب و خیال ہو گئے — جو نہ کہا تھا وہ، مگر عشق کو بھولتا نہیں
دیکھ لیا وہاں تجھے دیدۂ اعتبار نے — ہاتھ کو ہاتھ بھی جہاں کہتے ہیں سوجھتا نہیں

دِل دُکھ کے رہ گیا یہ الگ بات ہے مگر — ہم بھی ترے خیال سے مسرور ہو گئے

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں — تو نے تو خیر بیوفائی کی،

نثارِ پیمانِ دوستی کے مگر ہے گردش میں آسماں بھی — جو یادِ ماضی پہ منحصر ہو وہ عہد کیا استوار ہو گا

ہزار بارِ محبت ہو، دل تو ہلکا ہے — نہ سر کو اور نہ ہم درِ دِسر کو دیکھتے ہیں
نگاہِ ناز میں صبحِ ازل کی کیفیت! — ارے یہ کب کے فسانے سُنائے جاتے ہیں
غبارِ راہ طلب اُٹھ کے بیٹھ بھی نہ سکا — فراق ابھی سے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

آ نہ گئی آ نہ گئی تیری یاد — چھا نہ گئیں چھا نہ گئیں بدلیاں
چل گئی کیا جانئے کیسی ہوا — آج بجھے دل سے بھی اُٹھا دھواں
پار کیا پار کیا بحرِ عشق — ڈوب چلیں ڈوب چلیں کشتیاں

ہوش کی توفیق بھی کب اہلِ غم کو ہو سکی — عشق میں اپنے کو دیوانہ سمجھ بیٹھے تھے ہم
رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہونے لگا — خود کو ترے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم
حُسن کو اک حُسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراق — مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اس کی جفا پیامِ غمِ جاوداں نہیں — اے عشق ناامید کبھی شادماں بھی ہو
نگاہ ناز تیرے چھیڑنے کی اور بات ہے — ملول بھی کہاں ہوں میں اگرچہ شادماں نہیں

تمکنت و سکونِ حُسن سر بسر اضطراب ہیں — آئینۂ جمال میں عشق کی صورتیں نہ دیکھ
گرد و غبارِ دہر کو حُسن کا جلوہ زار کر — سینۂ کائنات کی مجھ سے کدورتیں نہ دیکھ
پاؤں کی تھرتھری کو دیکھ دیکھ یہ نالۂ جرس — راہگذارِ عشق میں چھوٹتی ہمتیں نہ دیکھ

اب فضا میں وہ اِک کسک سی نہیں — مٹ چلی ہیں نشانیاں تیری

وہ سوز و درد مٹ گئے وہ زندگی بدل گئی — سوالِ عشق ہے ابھی "یہ کیا کیا یہ کیا ہوا؟"
بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم، — جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی

ایک وہ ملنا ایک یہ ملنا، — کیا تو مجھکو چھوڑ رہا ہے

اس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے — کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی؟

رموزِ عذرِ جفا تک خیال جا نہ سکا
میں چُپ رہا تو بُرا ماننے کی بات نہیں

کب دیکھئے دلوں کو ملے اذنِ یاس بھی
بیگانہ وار کہتی ہے وہ آنکھ "ابھی نہیں"

ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حُسنِ یار کو
اتنی طویل فرصتِ نظارگی نہیں،

درسِ عبرت ہے محبت کا یہ رنگ بھی
آہ وہ چوٹیں جو صرفِ فکرِ داماں ہوگئیں

فراق زیرِ چرخ کچھ، چمک بھی ہے دھواں بھی ہو
کہ جیسے اُٹھ رہی ہو وہ نگاہِ سرگیں کہیں

نثارِ دیدۂ بےخواب ۔ جاگنے کی طرح
جو جاگ بھی نہ سکے اس کو نیند کیا آئے

پہلے بھی رو لیتے تھے کچھ دن کو کچھ راتوں کو
دل ہی ڈوبا جاتا ہے آگ لگے برساتوں کو

جب شبِ مہ میں اسکی نگاہ ایک کہانی ہوتی تھی
یاد نہ کر ان راتوں کو بھول بھی جا اُن باتوں کو

سچ ہے ٹھنڈا کون کرے تیرے سوا گرمائے کون
جلتے جلتے اشکوں کو بھیگی بھیگی راتوں کو

آج تو کفرِ عشق چونک اُٹھا
آج تو بول اُٹھے ہیں بُت خانے

اُٹھنے والی ہے وہ نگاہِ کرم
عشق بھی کچھ لگا ہے شرمانے

بعد مدت کے تیرے ہجر میں پھر
آج بیٹھا ہوں دل کو سمجھانے

نگاہِ یار کچھ ایسی پھری ہجراں نصیبوں سے
کہ اب تو جس کا جی چاہے وہی غمخوار ہوجائے

خستگی مہر و ماہ کی مت پوچھ
کون پیمانہ ہے جو چور نہیں

تیری رنگینئ طبیعت سے
عشق کی سادگی بھی دور نہیں

فیصلہ عشق کی تقدیر کا ہونا معلوم،
آپ نے کچھ مگر اس بات میں سوچا بھی کہاں

مفت بدنام ہوا نام بھی بدنامی کا،
ہوسکا کوئی ترے عشق میں رسوا بھی کہاں

نشاطِ حُسنِ ازل کو بھی وجد آجاتا
دُکھی ہوئی ابھی اتنی رگِ حیات نہیں

یہی ہوا کہ ترے غمزدوں پہ کچھ نہ ہوا
جو آئے لفظ و بیاں میں وہ واردات نہیں

تجھے دُنیا کو سمجھنے کی ہوس ہو ۔ اے کاش
تجھے دُنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا

رفتہ رفتہ عشق کو تصویرِ غم کر ہی دیا
حُسن بھی کتنا خراب گردشِ ایام تھا!!

عشق کے اضطراب میں پہلے یہ نرمیاں نہ تھیں،
سوزِ نہاں کی شکل میں کون یہ مُسکرا دیا

آنکھ چُرا رہا ہوں میں اپنے ہی شوقِ دید سے
جلوۂ حسنِ بے پناہ تو نے یہ کیا دکھا دیا

گداز انجم میں اک درماندگی کا کیف عالم میں
فراق ایسی کہاں ہے شامِ غم سب کے مقدر میں

میں گریباں پکڑ کے یوں رو دُوں
اے جنوں تیرا اعتبار نہیں

• • • • •

یاد آغازِ محبت کی دلوں سے نہ گئی
قافلے گھر سے بہت دور نہ ہونے پائے

خیال کو بے اثر نہ جانو عمل کی چنگاریاں ہیں اس میں
کہ آج ظلمت سرائے دل میں جو نور ہے کل وہ نار ہوگا

چمن میں جن کی موجِ رنگ و بو طرحِ نشیمن ہو
خدا معلوم کھلتے ہیں وہ گُل کن سرزمینوں میں

دیارِ عشق آیا کفر و ایماں کی حدیں چھوٹیں
یہیں سے اور پیدا کر خدا و اہرمن کوئی

نہ سر ہو سکے آتش کدے محبت کے
بجھے دلوں سے بھی اُڑتے شرر کو دیکھتے ہیں

اب حُسن بھی رہینِ غمِ روزگار ہے
کیا انقلاب اے دلِ رنجور ہو گئے،

آخر تپاکِ عشق کی کچھ انتہا بھی ہے
تجھ سے وہ اے فراق بہت دور ہو گئے

تھی ان کی شوخیوں میں بھی شانِ سپردگی
نیرنگِ اختیار سے مجبور ہو گئے

سن لے کہ خود شناس بھی ہے حُسن بے نیاز
اے دل یونہی سہی کہ وہ مغرور ہو گئے

کر عہدِ گزشتہ کو شریکِ غمِ امروز
خاکسترِ ماضی سے کچھ اُٹھتا ہے دھواں بھی

ے حسن و محبت کے وہ ایام بھی آئے
کچھ کم ہے ترا لطف بھی کچھ دردِ نہاں بھی

اُٹھ پڑے دردِ محبت ہی سہی
خیر آئے تو قیامت ہی سہی

احساس بس احساس ہے یہ غم یہ خوشی کیا،
اے عشق تجھے کار اہم اور ہی کچھ ہے

ہ وہ شدتِ حیات جو نہ عمل میں جگمگائے
رنگِ نشاط و کیفِ غمِ عشق کے ترجماں نہیں،

اسی سے نظمِ دو عالم بدل گئی اکثر
وہ سعیِ عشق جسے بختِ نارسا کہئے

کچھ تو رنگِ جہاں بدل ہی دیا
تیرے دیدار کی تمنا نے،

نہ جانیں کیوں بھری دنیا میں خاک اُڑتی ہے
بہ فیضِ عشق یہ دریا ابھی سراب نہ تھا

ہم نے تو جسے دیکھا ہم نے تو جہاں دیکھا
اک پیکرِ مجبوری اک عالمِ تنہائی

اظہارِ تمنا کی توفیق نہیں سب کو،
دیکھی ہے کبھی اے دل ان آنکھوں کی گویائی

غم کا بھی فراق اب تو احساس نہیں ہوتا
شامِ شبِ فرقت ہے تنہائی سی تنہائی

تیری سپردگی کو اگر دل کے شوق پر
کچھ اعتماد ہے تو کبھی بدگماں بھی ہو

وہ دردِ عشق کیا جو حریفِ عدم نہیں
اے حاصلِ حیات کبھی رائگاں بھی ہو

نہ رہا حیات کی منزلوں میں وہ فرقِ ناز و نیاز بھی،
کہ جہاں ہے عشق برہنہ پا وہیں حسن خاک بسر بھی ہے

وہ غمِ فراق بھی کٹ گیا وہ ملالِ عشق بھی مٹ گیا
مگر آج بھی ترے ہاتھ میں وہی آستیں ہے جو تر بھی ہے

نہ ازل ہے کچھ نہ ابد ہے کچھ وہی موت ہے وہی زندگی
جسے وقت کہتے ہیں اہلِ دل وہ فنا بھی ہے وہ بقا بھی ہے

اہلِ غم کو تیرا پیمانِ وفا   یاد تو کیا ہے مگر بھولا نہیں
زندگی اے دوست غم کا نام ہے   یہ تو شاید شکوۂ بے جا نہیں
قافلے یا مٹ گئے یا بڑھ گئے   اب غبارِ راہ بھی اُٹھتا نہیں

حُسن کے اعتدال سے ملتی ہیں سب کی سرحدیں   اپنے حدود ہی میں ہیں بحر کی بیکرانیاں،

اب تو زعمِ وفا مجھے بھی نہیں   کیوں تری سرگرانیاں نہ گئیں

جب تری یاد نہ تھی جب ترا احسان نہ تھا   ہم تو اس کو بھی محبت کا زمانہ سمجھے

عشق افسردہ نہیں آج بھی افسردہ بہت   وہی کم کم اثرِ سوزِ نہاں ہے کہ جو تھا

کہاں اتنی خبر عمرِ محبت کس طرح گزری،   ترا ہی درد تھا دل میں جہاں تک یاد آتا ہے

اپنے جلووں سے بھی برقِ حُسن کو ہے احتراز   اب نگاہِ شوق کو بھی دور جانا چاہیئے
پرستشِ پنہاں نہ اس درجہ بڑھانا چاہیئے   رشتۂ امید اکثر ٹوٹ جانا چاہیئے
حُسن کی جاتی رہی خود اعتمادی بھی فراق   اس طرح جذبِ نہاں کو آزمانا چاہیئے؟

اب یادِ رفتگان کی بھی ہمت نہیں رہی   یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں،

تجھ کو پاکر بھی نہ کم ہو سکی بیتابیِ دل،   اتنا آسان ترے عشق کا غم تھا بھی کہاں!

دنیا سے اے دل اتنی طبیعت بھری نہ تھی   تیرے لئے اُٹھائی ندامت کہاں کہاں

ابھی فکرِ علاجِ عشق نہ کر   ابھی کچھ دن یہ درد سہنے دے

پردہ دارِ غم ہے شاکی،   تو نے حال تو پوچھا ہوتا
آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے   آج تو کوئی آیا ہوتا،
منزل منزل دل بھٹکے گا   آج تمہیں نے روکا ہوتا
میں ہوں دل ہے تنہائی ہے   تم بھی جو ہوتے اچھا ہوتا

خبر کچھ اُن کی بھی رکھتے ہو رنگ و بو والو   جو کاٹتے چلے جاتے تھے راہِ صحرا کو

جو نہ لکھا کاتبِ تقدیر نے   ہاں وہ پیغام زبانی بھی سُنا

معنیِ تقدیر تو وہ تھا جسے   کاتبِ تقدیر بھی سمجھا نہیں،

وہ بیخودی وہ دل اُمڈا ہوا وہ روئے نگار   نظر بھی صورتِ شبنم بکھر گئی ہوتی
غم و الم وہی ہوتے وہی ترے مہجور   گزرنے والی جو شب تھی گزر گئی ہوتی

یاد ہے چشمِ کرم کا وہ بدلنا یاد ہے   حُسن افسردہ سا تھا اور عشق کو حیرت نہ تھی

اک شام فراق صبح کرلیں، ہستی کو تو کیا عدم کریں گے

پردے سکوت کے بھی نواہائے راز تھے تھیں حسن و عشق میں یہ ہم آہنگیاں کبھی

میں پوچھتا تو ہوں مگر جواب کے لئے نہیں، یہ کیوں تری نظر پھری یہ کیوں بدل گئی ہوا،

حیرتیں ہیں خلوصِ عشق کو بھی نہ گئیں بدگمانیاں تیری

شامِ ہجراں سُناگئی اکثر خامشی بھی کہانیاں تیری

احتیاطِ عشق کی اس وقت کوئی داد دے جب نگاہِ یار بھی رسوا نظر آنے لگے

گوش برآواز ہونا ہی شکستِ ساز ہے اک سکوت غم کو ہنگامہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

مسافرِ رہ عدم اگرچہ بے نیاز تھے یہاں بھی پڑگئیں مگر ضرورتیں نئی نئی

فسردہ کیوں ہے چار بوند آنسوؤں میں کیا نہیں حرارتیں نئی نئی طراوتیں نئی نئی

بجی بجی سی وہ نظر، ملی ملی سی وہ نظر یہ فاصلے نئے نئے یہ قربتیں نئی نئی

نگاہِ کامیاب کا بھی اعتبار اُٹھ گیا ملیں ترے جمال کو نزاکتیں نئی نئی

کہیں وہی تو گریباں نہیں ہے آج اپنا وہ تیرا گوشۂ دامن جو دستیاب نہ تھا

رو کر عشق خموش ہوا ہے وقت سہانا اب آیا ہے

زندگی کو بھی منہ دکھانا ہے رو چکے تیرے اشکبار بہت

کچھ نہ وحدت میں ہے نہ کثرت میں اسکی خلوت ہے اور جلوت اور

دل میں کچھ غم ہے کچھ سرور بھی ہے کوئی نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

چونک پڑے جو سناٹے میں ایسے دل کو کون پکارے،

نکہتِ زلفِ پریشاں داستانِ شامِ غم صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو،

سکوتِ ہوش کو مرکز بنا محبت کا جنوں کا غلغلہ نزدیک و دور ہونے دے

اُف یہ صدا کہ جلد آ، اُف یہ ندا کہ دور باش! کاوشِ قرب و بعد کا کوئی بھی رازداں نہیں

گرد و غبار سے ہے صاف غم کی فضائے بیکراں اب تو فنا و عشق میں موت بھی درمیاں نہیں

حسن کے ہر تپاک میں جذب تھیں لاکھوں مستیاں کون کسی کو یاد تھا؟ کس نے کسے بھلا دیا؟

کسی کی آنکھ میں ملتے ہیں دونوں وقت فراق ہم اک نگاہ میں شام و سحر کو دیکھتے ہیں

بوقت لطف و کرم حسن کے یہ تیور ہیں نہ ہم دعا نہ دعا نے اثر کو دیکھتے ہیں

وہ رنگ زاہدِ شب زندہ دار کیا جانے جو اہلِ میکدہ پچھلے پہر کو دیکھتے ہیں،

ہم اہلِ غم کی تمنا ہی کیا۔ نگاہ تری   نہ ہو تو خیر اگر ہو سکے تو اچھا ہے،

ہاں تجھے بھی نہ کہہ سکیں تجھ سا   تجھ کو یکتائے روزگار کریں

کوئی آیا نہ آئے گا لیکن   کیا کریں گر نہ انتظار کریں

جوشِ تجدیدِ شوق سچ کہنا   دل کو پھر ہم امیدوار کریں

کیا کیجئے فراق اگر کسی پر کوئی   نامہرباں کی طرح ہوا مہرباں کوئی

اے رازِ جہاں بتانے والے   اک اور جہانِ راز بھی ہے،

لاکھ قیامتیں نثار ایک اس انقلاب پر   عالمِ حسن بدگماں رنگِ نگاہِ یار دیکھ

ہم وہی ہیں اے نگاہِ آشنا،   خوش نہیں ہوتے طبیعت ہی تو ہے

چل نہیں سکتے یہاں خوش بختیوں کے بھی فریب   عشق کا رونا ہے یہ تقدیر کا رونا نہیں

جورِ پیہم سے ترے چھُٹ تو رہے ہیں لیکن   آج ہم اہلِ وفا پائیں گے ایسا بھی کہاں،

رنگ جہاں بدل گیا شانِ عدم بدل گئی   دُکھتے دلوں سے پچھلی رات آئی ہے وہ صدا کہ بس

اس نے پیمانِ وفا بھی آج پورا کر دیا   حق اگر یہ ہے تو باطل کو کہاں تک روئیے

انقلاب آیا تو یوں آیا نگاہِ یار میں،   کچھ مروت میں اضافہ کچھ محبت میں کمی

نگاہِ یار بڑھ چلی حدودِ لطف و جور سے   بدلتی جا رہی ہیں بزمِ ناز کی روایتیں،

آنچ قفس والوں تک آئی،   اب کے بہت ہے شورِ بہاراں

ہے شامِ ہجر گوش بر آواز ہوں فراق   لرزاں ہیں کچھ سکوتِ فضا میں پیام سے

حال انجامِ عشق کیا کہئے   اب تو ہم بھی لگے ہیں پچھتانے

اک فسوں ساماں نگاہ آشنا کی دیر تھی   اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

وہ سوز و درد مٹ گئے وہ زندگی بدل گئی   سوالِ عشق ہے ابھی یہ کیا کیا، یہ کیا ہوا

آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے   آج تو کوئی آیا ہوتا

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں   تو نے تو خیر بے وفائی کی

نہ رہزنوں سے رکے راستے محبت کے   وہ قافلے نظر آئے لٹے لٹائے ہوئے

بس ایک عشق کے خراب ہونے ہی کی دیر تھی   شباب تھا سنور گیا زمانہ تھا گزر گیا،

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہوتا چلا   خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

بہارِ جلوۂ صبحِ ازل کو دل نہیں بھولا   پڑی جب جب نظر تیری نگاہ ڈھونڈیں نکلی،

نیرنگِ حسنِ یار ترے بس میں کیا نہیں
لطف و کرم تو مانعِ جور و جفا نہیں،

جن کی صدائے درد سے نیندیں حرام تھیں
نالے اب ان کے بند ہیں، تونے سُنا نہیں؟

اہلِ جنوں کو وسعتیں کچھ اور مل گئیں
دل بڑھ گئے ہیں پاؤں میں زنجیر دیکھکر

جفائیں حُسن کی رہ رہ کے چونک اُٹھتی ہیں
اگرچہ عشق بہت خوش قیاس ہوتا ہے،

رقیب پر بھی ستم ہیں مگر ستم کیا ہیں
کہ جورِ حُسن بھی مردم شناس ہوتا ہے،

نہ اس کو ربط پسند اور نہ احتراز پسند،
ابھی سمجھتے نہیں تم مزاجِ دُنیا کو

ہر اک کے ہاتھ فقط غفلتیں تھیں ہوش نما
ہر اک کو اپنے سے بیگانہ وار جینا تھا

کھلا ہے ہوش میں آکر فریبِ بادہ کشی
سیاہ کاروں کے دامن کو داغ بھی نہ ملا،

پوچھئے ان سے کہ ثابت قدمی کام آئی،
ہوئے گمراہ جو منزل ہی پہ رہتے رہتے،

دیکھئے کب اس نظامِ زندگی کی صبح ہو
آسمانوں کو بھی جیسے آرہی ہو نیند سی،

نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی
زندگی اُچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

کیسی خوشی، کہاں کا الم یہ کوئی بتاؤ
دُنیا میں زندگی بھی کہیں دستیاب ہے

شورشِ کائنات ہے خاموش
موت ہے زندگی کے دوش بدوش

ہر دل کو بنائیں گے جہاں تاب،
ہر جام کو جامِ جم کریں گے

جہاں کو دے گی محبت کی تیغ آبِ حیات
ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا

اس اضطراب میں رازِ فروغ پنہاں ہے
طلوعِ صبح کے مانند تھرتھرائے جا

نگاہِ یار ترا یوں تو ہے پیام کچھ اور
مگر کرم بھی کئے جا، ستم بھی ڈھائے جا

وہ کیمیا ہی سہی پہلے خاک ہونا ہے
ابھی تو سوزِ محبت کی آنچ کھائے جا

نہ اور کھول ابھی نیم باز آنکھوں کو،
ترے نثار یہ جادو ابھی جگائے جا

شباب پر ہے زمانہ ترے ستم کے نثار
اُبھر رہا ہوں کئی رنگ سے مٹائے جا،

خلوصِ عشق کو کرماورائے غفلت و ہوش
کسی کو یاد کے پردے میں کچھ بھلائے جا

پہلے خُدا کا چھوڑ سہارا
درسِ عمل آسان نہیں ہے

بچھڑ کے تجھ سے کہیں دیکھنا نہ پڑ جائے
وصال ایسوں کا جنکی جدائی شاق نہیں

محبت میں مری تنہائیوں کے ہیں کئی عنواں
ترا آنا، ترا ملنا، ترا اُٹھنا، ترا جانا

وصال کو بھی بنا دے جو عین دردِ فراق
اسی سے چھوٹنے کا دُکھ سہا نہیں جاتا

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

آپ کے بزرگ کشمیر سے بادشاہ فرخ سیر کے عہد میں دہلی آئے اور سلطنت کے مرکزی دفاتر میں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز ہوگئے، اُنیسویں صدی کے اوایل میں بوجہ انتزاع سلطنت ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی اور اسوقت کے اعلےٰ عہدوں پر فایز ہوئے۔ حضرت کیفی کے والد پنڈت کنہیالال راجہ بھرپور سنگھ کے عہد میں نابھہ میں کوتوال تھے۔

کیفی صاحب کی ولادت ۱۳ر دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء میں بہ مقام دہلی ہوئی، ابھی بہت صغیر سن تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ بازار سیتارام میں رہتے تھے۔ قریب ہی حکیم بوریے والے کا مطب تھا اور ان کے ہاں مکتب تھا اس میں آپ کی بسم اللہ ہوئی اور پُرانے طریق کے مطابق میاں جی سے فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ آپ کی فارسی کی تکمیل گھر پر اپنے نانا صاحب سے ہوئی جو اس زبان کے جید فاضل تھے اور انگریزی کی تعلیم سینٹ سٹیفنس کالج دہلی میں۔ شاعری کا مذاق آپ نے اپنے ایک بزرگ پنڈت نراین داس ضمیر دہلوی سے ورثہ میں پایا۔ شاعری کی ابتدا اس زمانے کے مذاق اور رواج کے مطابق غزل سے شروع ہوئی مگر خود آپ کے قول کے مطابق یہ رنگ پختہ نہ ہونے پایا تھا کہ اسے ترک کر دیا۔ اس کے باعث اول زمانے کی رفتار اور پسند عام اور دوسرے حضرتِ آزاد مرحوم و خواجہ حالی مغفور کی صحبتوں اور ادب مغربی کا اثر کہنا چاہئے نیچرل شاعری شروع کی۔ کیفی صاحب نے سنہ ۱۶-۱۹۱۵ء میں یورپ کا سفر کیا اور وہاں اکثر علما اور ادیبوں سے ملاقات کی۔

ان کی بعض تصنیفات گورنمنٹ سے انعام اور پبلک سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ علامہ موصوف ریاست کشمیر میں اسسٹنٹ فارن سکریٹری کے عہدۂ جلیلہ سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک پہاڑی ریاست چینتی میں مجسٹریٹ اور کلکٹر کے فرایض ادا کرتے رہے۔ لیکن اب انجمن ترقی اُردو کے کاموں میں مولوی عبدالحق صاحب کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

ہیں مرے دل میں وہ آہیں کہ جو بجلی نہ بنیں،
مری آنکھوں میں وہ قطرہ ہے جو طوفاں نہ ہوا

غم رہاں کا جو دوزخ میں پڑے جلتے ہیں
میرے خوش ہونے کا جنت میں بھی ساماں نہ ہوا

تو دیکھ رہا ہے جو مرا حال ہے قاصد
مجھ کو یہی کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

رازان کے کھلے جاتے ہیں ایک ایک سبھوں پر
اور اس پہ تماشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

وسعت آرائیِ دلتنگی حسرت مت پوچھ
حال یہ بیخودیِ عشق میں کیفیؔ کا ہوا

عمل و عزم ہیں محرومِ جسارت۔ ورنہ
یوں اگر دیکھیئے کیا کچھ نہیں یہ مشت غبار
رحمت و عفو الٰہی کا ہوا جب سے یقیں

حُسن عشق میں ہے یا عشق حُسن میں مضمر
عشق محشر آرا کی طور پر گری بجلی
فرطِ سوز الفت میں دیکھ کر سکوں دل کا
چارہ گر کو حیرت ہے ارتقائے وحشت سے
ہوں وہ رند یا صوفی مست اس کی دھن میں ہیں

صحبتیں اگلی جو یاد آتی ہیں جی کٹتا ہے،

فراہم ہو کے خونِ آرزو پھر دل نہ بن جائے
مریضِ غم کے جینے کی دعا احباب کرتے ہیں

ہاں، ہاں، مگر اے دوست تو تدبیر کیے جا

وہ اب جرم وفاؤ عشق کا الزام دیتے ہیں
گلِ پژمردہ کی بکھری ہوئی کچھ پتیاں دیکھیں

نظارہ ذات کا اپنی ہے اس سے دور ہو جانا
ہمارا دل بڑھاتی ہے درازی راہِ اُلفت کی

جناب محتسب ہم اور توبہ آپ کے ڈر سے

لطف ہو حشر میں کچھ بات بنائے نہ بنے
تم سے اب کیا کہیں وہ چیز ہے داغِ غمِ عشق
بات وہ کہہ گئے آئے بھی تو کس طرح یقیں،

جس کو خبر نہیں اسے جوش و خروش ہے
وارفتۂ ہوائے طرب یا دُکھ اسے
ساقی کی اک نظر ہی ہمیں مست کر گئی

دم جو نکلا تو میں اپنا اسے ارماں سمجھا
شیخ کافر اسے اور گبر مسلماں سمجھا

غیرِ ممکن کا محل عالمِ امکاں میں نہیں
اور اگر سوچیئے تو خاک بھی انساں میں نہیں
دلفریبی کا اثر لذتِ عصیاں میں نہیں

جوہر آئینہ میں یا آئینہ ہے جوہر میں
حسن لنترانی کی رہ سکا نہ چادر میں
بجلیاں مچلتی ہیں بادلوں کے محشر میں
پاؤں میں جو چکر تھا آ رہا ہے وہ سر میں
جانے کتنے میخانے بھر دیئے ہیں کوثر میں

کوئی پوچھے بھی تو کہہ دیتے ہیں ہم یاد نہیں

یہ اُجڑی پر سکوں بستی بھری محفل نہ بن جائے
جسے آسان سمجھا ہوں وہی مشکل نہ بن جائے

یہ بھی تری تقدیر کے دفتر میں لکھا ہے

رہوں چپ تو بھی مشکل ہو۔ کہوں کچھ تو بھی مشکل ہے

تو اک بیدل یہ چیخ اُٹھا۔ مرا دل ہے۔ مرا دل ہے!

جدا ہی جیسے آئینہ سے تو اور اس میں شامل ہے
سمندِ شوق کو اک تازیانہ بُعدِ منزل ہے

یہاں تو پینے والے ہیں کفِ ساقیِ کوثر سے

آنکھ بھی شوخ ستمگر سے چُرائے نہ بنے
کہ چھپائے نہ چھپے اور دکھائے نہ بنے
اور سحر اس میں کچھ ایسا ہے بھلائے نہ بنے

جو پا گیا ہے راز۔ وہ گم ہے خموش ہے
جو درد کی کھٹک ہے نویدِ سروش ہے
کس کو صراحی و خم و ساغر کا ہوش ہے

اک خواب کا خیال ہے دنیا کہیں جسے
ہے اس میں اک طلسم تمنا کہیں جسے

خمیازہ ہے کرشمہ پرستی دہر کا
اہل زمانہ عالمِ عقبےٰ کہیں جسے

برہمزنِ حجاب ہے خود رفتگیِ حسن،
اک شانِ بیخودی ہے زلیخا کہیں جسے

پیکرِ خاک ہے تو چرخ پہ چھا مثل غبار
تجھ کو مٹی میں ملایا ہے جبیں سائی نے

جام کیا ایک نظر میں تجھے کرتا سرشار
تجھ کو اے شیخ ملا ہی نہیں ایسا کوئی

درد ہی کیا ہے وہ جس درد کا درماں ہو جائے
مشکل ایسی کوئی مشکل ہے جو آساں ہو جائے

جلوے سکھلاتے ہیں نظارے کا انداز مجھے
پردے آتے ہیں نظر سب نظر انداز مجھے

نہیں معلوم اذاں تھی کہ وہ بانگ ناقوس
کہیں کھینچے لئے جاتی ہے اک آواز مجھے

انقلاب آنے کو ایسا ہے نہ آیا ہو کبھی،
در و دیوار سے آتی ہے یہ آواز مجھے

ہے دم آنکھوں میں اور آنکھیں ہیں کسی کو ڈھونڈتی
موت بھی ایذا دہی میں زندگی ہونے لگی

تو ہی بتلا دے مجھے یارب کہاں سجدہ کروں
ذرّے ذرّے کو تو جلوے طور ساماں کر چکے

جو زندہ دل ہیں ہمیشہ جوان رہتے ہیں
بہار زیست یقیناً اسی شباب میں ہے

ہم تو یونہی بُرے بنے نالہ سے آہ سے
دل میں جو تھا وہ پھوٹ ہی نکلا نگاہ سے

قسمت کا کیا گلہ جو کیا تم نے خود کیا
عذر گناہ کیوں نہ ہو بدتر گناہ سے

آباد ہے یہ خانۂ دل اک خیال سے
دُنیا کے حادثے اسے ویراں نہ کر سکے

ان میں جو تھا نہاں وہی مرکوز دل رہا
جلوے مری نظر کو پریشاں نہ کر سکے

عشق ہی عشق ہو عاشق ہو نہ معشوق جہاں
ایسی اک درگہ توحید مآب اور بھی ہے

ہوش سے کاٹ یہ دن - زندہ دلی سے رکھ کام
شیب کے بعد مری جان شباب اور بھی ہے

یار پیمانے اگر کر گئے خالی - غم کیا؟
اب بھی ابر آتا ہے اور خم میں شراب اور بھی ہے

گھر کیا غالب و مومن نے جہاں آنکھوں میں
اسی بستی میں کوئی خانہ خراب اور بھی ہے

اس اشاعت میں

جنوری اور فروری سنہ ۴۱ء کے دونوں پرچے شامل ہیں اس لئے فروری کے پرچہ کا انتظار نہ کیا جائے
مارچ کا پرچہ اپنے وقت سے شایع ہوگا۔

منیجر نگار

تلوک چند محروم

آباواجداد ضلع میانوالی (پنجاب) میں دریائے سندھ کے کنارے ایک گاؤں میں سکونت پذیر تھے۔ آراضی کے دریا برد ہو جانے پر دوکانداری اور بیوپار کا پیشہ اختیار کیا۔ میری ولادت تحصیل عیسٰے خیل ضلع میانوالی کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ سال ولادت ۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۷ء ہے۔ پہلے ورنیکولر مڈل پاس کیا۔ پھر انٹرنس اس کے بعد بی۔ اے۔ اور ایس۔ اے۔ وی پرائیوٹ طور پر پاس کئے۔ ۱۹۰۸ء میں مشن ہائی اسکول ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں انگلش ٹیچر ہو گیا۔ اب ۱۹۳۳ء سے کنٹونمنٹ بورڈ مڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں۔ سبکدوش ہونے میں دو سال باقی ہیں۔ اس طویل عرصہ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جو ادبی طور پر قابل ذکر ہو۔ حادثات چند ایک ایسے پیش آئے جنھوں نے کچھ شکستہ خاطر کر دیا یہاں ان کا ذکر غیر ضروری ہے۔ جذبۂ شاعری طبیعت میں فطری تھا۔ جس کا اظہار بچپن میں ہونے لگا۔ تیسری جماعت میں تھا کہ مصرعے خود بخود زبان پر آنے لگے۔ چونکہ زبان اس حصۂ ملک کی ملتانی ہے اس لئے زبان کے لحاظ سے ابتدائی کلام ناقص تھا۔ جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا زبان صاف ہوتی گئی لیکن پوری قدرت ابھی تک حاصل نہیں ہو سکی۔ زمانۂ طالب علمی میں نظمیں پنجاب کے اخبارات اور رسایل میں شایع ہونی شروع ہو گئیں۔ کسی سے اصلاح نہیں لی۔ عروض کا باقاعدہ مطالعہ بھی نہیں ہو سکا، ہاں اساتذہ کا کلام غور سے دیکھا ہے اور اردو ادب میں جو تنقیدی مضامین میسر آسکے ان کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ پنجاب کے اکثر مشاعروں میں بھی شمولیت کی ہے اور شعرائے دور حاضر سے ذاتی مراسم بھی رہے ہیں۔ اب چند سال سے طبیعت بجھ چکی ہے۔ اس کا سبب بچوں کی موت ہے۔ پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۱۶ء میں شایع ہوا۔ اس کا دوسرا اور تیسرا حصہ بعد کے چند سالوں میں طبع ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں ایک ضخیم مجموعہ بنام "گنج معانی" مسٹر عطر چند کپور نے لاہور سے شایع کیا۔ دیباچہ سر شیخ عبدالقادر نے تحریر فرمایا۔ غزل میرا موضوع نہیں اگرچہ کچھ غزلیں لکھی ضرور ہیں انھیں میں سے انتخاب بھیجا جا رہا ہے۔

تلوک چند محروم

اے ہمرہانِ دشتِ محبت! بڑھے چلو — اپنا تو پائے شوق، سلاسل میں رہ گیا

اے دل یہ کیا فسردگی آغازِ عشق میں — گل کیوں ترا چراغ سرِ شام ہو گیا

ہو دورِ غم کہ عہدِ خوشی، دونوں ایک ہیں — دونوں گزشتنی ہیں، خزاں کیا۔ بہار کیا

سمجھ میں آیا نہ رازِ صنعت ذرا بھی صورتگرِ ازل کا — بنا رہا ہے مٹا مٹا کر، مٹا رہا ہے بنا بنا کر

اگر ہے منظور سربلندی تو دور نظروں سے کر بلندی،
کہ اوج شمس و قمر نے پایا ہے سر کو اپنے جھکا جھکا کر

ہے ہے! کسی کی بزم مجھے یاد آگئی
واعظ خدا کے واسطے ذکرِ جناں نہ چھیڑ

دُنیا میں اے زباں! روشِ صلح کل نہ چھوڑ
جس سے کسی کو رنج ہو، ایسا بیاں نہ چھیڑ

ہمدم! کہیں نہ حسرتِ خوابیدہ جاگ اُٹھے
ایامِ حسن و عشق کی پھر داستاں نہ چھیڑ

محفل میں ان کی غیر ہیں، جلنے کو بیٹھیے،
محروم! دیکھ شمع کو، یعنی کہ جل کے چل،

کس سے سنوں جو تم نہ کرو بات پیار کی
کس سے کہوں نہ تم نہ سنو ماجرائے دل

ہو گیا آخر تلف وہ کاروانِ آرزو
مدتوں جس نے اُڑائی دل کے ویرانے کی خاک!

مئے گلرنگ نہ دے ساقیِ بزمِ عشرت
اشکِ خوں دیکھ مرے، باعثِ انکار نہ پوچھ

ہے صبح اور آج پریشاں ابھی سے ہیں
یعنی شبِ فراق کے ساماں ابھی سے ہیں

کوہ و صحرا و ساحلِ دریا
بے ٹھکانوں کے سو ٹھکانے ہیں!

خلوت نشیں حرم کے ہیں یا دیر کے مکیں،
سب سجدہ کرنے والے ترے آستاں کے ہیں

نہ چھیڑ اے آرزوئے نغمہ! میرے سازِ ہستی کو
کہ پنہاں جز نوائے غم نہیں کچھ اُس کے تاروں میں

شبستانِ فلک میں محوِ خوابِ ناز ہے کوئی
کہ ایمائے خموشی ہے کواکب کے اشاروں میں۔

بچوں تیری آتشِ عشق سے یہ مجال و تاب کہاں مجھے
مرے دل کا اور ترے حسن کا ہے خس و شرر کا معاملہ

شاملِ تعمیرِ دُنیا تھی یہی بے رونقی،
عشق کے دم سے مگر کچھ گرم بازاری رہی

نظر کر خندۂ گل پر ریاضِ دہر میں غافل!
نہایت مختصر ہے جو گھڑی ہے یاں مسرت کی

بعدِ ترکِ آرزو بیٹھا ہوں کیسا مطمئن
ہو گئی آساں ہر اک مشکل بہ آسانی مری

نسیمِ صبح کا جھونکا نفس نفس تیرا
رہے گی سوختہ حالوں کو آرزو تیری

شبِ فرقت کی داستاں ہو طویل
نیند المختصر نہیں آتی

فردوس میں دل اُنکا لگا ہے نہ لگے گا،
جو ہیں ترے کوچے کی فضا دیکھنے والے

پھر لذتِ ایذا کی ہوئی دل کو تمنا
اللہ کرے وہ بُتِ بیداد گر آئے

مری فغاں ہی سے رونق ہے میری ہستی کی،
صدا جرس کی ضروری ہے کارواں کے لئے

خلش نے دل کو مرے کچھ مزا دیا ایسا
کہ جمع کرتا ہوں میں خارِ آشیاں کے لئے

نہیں اب فغاں میں بھی کچھ مزا کہ نشیمن اپنا قفس ہوا
وہ زمانہ خوب تھا جبکہ ہم تھے اسیرِ دام نئے نئے!

غمِ تازہ ہے دلِ مردہ کا۔ الم آرزوئے فسردہ کا
تری بزمِ ناز میں دیکھتا ہوں نہ پھر اہتمام نئے نئے

دل میں کہتے ہیں کہ اے کاش نہ آئے ہوتے   اُن کے آنے سے جو بیمار کا حال اچھا ہے
بھیجتے ہیں آج مرگِ ناگہانی کو پیام   ترے وعدوں پر کوئی اے حیلہ جو کب تک رہے
دامنِ عمر بھی پھٹ جائے گا جب تک کہ رفو   چاکِ دل، چاکِ جگر، چاکِ گریباں ہوں گے
تمھیں سے لی ہے صبا نے بھی شوخیٔ رفتار   چراغِ گورِ غریباں نہ کیوں بجھا کے چلے
رہے گی حاجتِ شرحِ جفا نہ محشر میں   اسی ادا سے جو تم سامنے خدا کے چلے!
دکھائی دیتے ہیں خوبوں کے عیب بھی اچھے   کہ چاکِ دامنِ گل کو نہیں رفو کرتے
ریاضِ دہر میں دیتے ہیں جبکو داغ دروں   برنگِ لالہ اُسی کو ہیں سرخرو کرتے
نہ گل بہار ہے چیدنی نہ فضائے باغ ہے دیدنی   کہ بہار باغ گزشتنی ہے تو رنگِ گل ہے پریدنی
دمِ مستعار ہے زندگی، تجھے اسکے سود و زیاں سے کیا   غمِ روزگار سے ہاتھ اُٹھا کہ نہیں یہ جنسِ خریدنی
ہے تلا ہوا تبرِ فنا سو برگ و شاخ و ثمر سدا   وہ تعلقات فریب ہیں جو سرشت میں ہیں بریدنی
کوئی سوتا ہو جیسے ڈوبتی کشتی کے تختے پر   اگر کچھ ہے تو بس اتنی ہے اس دُنیا کی راحت بھی!
کس مُنھ سے جا کے شکوۂ جور و جفا کریں،   مرتے ہیں اور ان کی پشیمانیوں سے ہم
کانٹوں میں رہ کے پھول یہ تو نے کھلائے ہیں،   محروم خوش ہیں تری گل افشانیوں سے ہم
تقدیر اگر ہے ناموافق   موہوم ہے جذبِ عشقِ صادق
ہو جاتے ہیں دورِ عاشقی میں   حالات تمام ناموافق
حسرت نے کہا ہے خوب یہ شعر   بالکل مرے حال کے مطابق،
محروم نہیں تو اور کیا ہے   اس دشمنِ عاشقاں کا عاشق
حلقۂ دامِ علائق، بندِ مذہب، قیدِ ننگ،   کس قدر پابندیاں ہیں فطرتِ آزاد پر
اب جہاں میں ان کی قبروں کے نشاں ملتے نہیں   عمر بھر جو فکرِ تسخیرِ جہاں کرتے رہے
نقشِ ہستی اپنا پھیکا ہی رہا۔ ہر چند ہم   دیدۂ خونبار سے گلکاریاں کرتے رہے
ہوں وہ برباد کہ قسمت میں نشیمن نہ قفس   چل دیا چھوڑ کے صیاد تہِ دام مجھے
میں نے دیکھے ہیں بہت خونِ تمنا کے رنگ   ساقیا دے نہ فریبِ مئے گلفام مجھے
پھر بہار آئی، ہوا پھر گرم بازارِ جنوں،   شوق کے پھولوں میں پھر تلنے لگے خارِ جنوں
اہلِ دنیا کی تگ و دو دیکھکر دیوانہ وار   ساری دنیا مجھکو آتی ہے نظر دارِ جنوں
تجھ پہ وحشت کا اثر محروم پھر ہونے لگا   پھر ترے اشعار میں پاتے ہیں آثارِ جنوں

پہلو میں دل ہے، درد کی دُنیا کہیں جسے — پر اس قدر اُجاڑ کہ صحرا کہیں جسے
وہ رعبِ حُسن تھا کہ بن آئی نہ ہم سے بات — یوں حالِ دل کہا کہ نہ کہنا کہیں جسے

اے جانِ بہار تیرے دم سے — گلزار ہوا تمام رنگیں
ساقی! ترا عکسِ رخ ہے ورنہ — صہبا رنگیں نہ جام رنگیں
پھر جوشِ بہارِ گل ہے، بُلبل — ہر سمت بچھے ہیں دام رنگیں
بے رنگ ہے زیست تیری محرؔوم — لیکن ہے ترا کلام رنگیں

پایا ہزار شکر نہ دنیا کو حسبِ کام — محرؔوم ورنہ ہم بھی لگاتے اسی سے دل

جن کی تقدیس کی کھاتے ہیں فرشتے بھی قسم — ہم گنہ گاروں میں ہوتے ہیں وہ انساں پیدا
مایۂ نازشِ دوراں یہ پریشانی ہے — روز ہوتے ہیں کہاں ہم سے پریشاں پیدا

ہم جو آہ و فغاں نہیں کرتے — آپ کا امتحاں نہیں کرتے
روز نامہربانیاں ہم پر — یوں تو اے مہرباں نہیں کرتے
عقل کو کیوں بتائیں عشق کا راز — غیر کو رازداں نہیں کرتے
یادِ ایامِ شوق سے محرؔوم — دل کو اب ہم تپاں نہیں کرتے

زیست کی دُشواریوں نے یہ تو احساں کر دیا — موت سی مشکل کو میرے حق میں آساں کر دیا
ہے یہ دُنیا ایک ہی افسانۂ ناکامِ شوق — جس نے جو چاہا الگ تجویز عنواں کر دیا

ان بے نیازیوں پہ تو دل ہے رہینِ شوق — کیا جانے اس کو کیا ہو جو پروا کرے کوئی
کل کی نہ ہو امید تو پھر کس امید پر — آباد آرزوؤں کی دُنیا کرے کوئی

اُلجھا کئے بہت دلِ ناشادماں سے ہم — عہدہ برا نہ ہو سکے جب دلستاں سے ہم
کس مُنہ سے شکوہ اُن کے نہ آنے کا کیجیے — جب جا سکے نہ اُن کے نہ آئے پہ جاں سے ہم
دل مجھ سے پوچھتا ہے کہ جائیں گے اب کہاں — میں دل سے پوچھتا ہوں کہ آئے کہاں سے ہم

کب ملا چین وطن میں دلِ ناشاد مجھے — درد کیوں مجھ کو وطن کا ہے۔ وطن کس کا ہے
ہدفِ ناوکِ صیاد ہوا پھر کوئی؟ — ماتم اے نوحہ سرایانِ چمن کس کا ہے

زمانہ خاکساری کا نہیں، خود دار بن کر اُٹھ — مٹا وہ راہِ منزل میں جو بیٹھا نقشِ پا ہو کر

باعثِ تسکیں ہے نیرنگِ تمنا میرے لئے — یعنے ہے اک روز غم کی انتہا میرے لئے
یاد جب بھی آ گئی تیری نگاہِ اولیں — کھل گیا اک دفترِ مہر و وفا میرے لئے

زندگی ناکامیوں کی اک مسلسل داستاں
موت کیا ہے زندگی کی داستاں کا خاتمہ!

سفر کرتے ہوئے منزل بہ منزل جا رہے ہیں ہم
مجھے یہ ساری دُنیا کارواں معلوم ہوتی ہے
مسرت ہائے بے پایاں اُبھرتی ہیں، سنورتی ہیں
جوانی اک بہارِ بے خزاں معلوم ہوتی ہے

دردِ دل، سوزِ جگر، اشک رواں، داغِ فراق
سچ تو یہ ہے آپ کے احساں ہیں مجھ پر بے شمار

حُسن یہ سارا اسی کا ہے کہ جس کے عشق میں
چاک روزِ ابتدا سے ہے گریبانِ سحر،
سوئے در کیا دیکھتا ہے اے دلِ غمدیدہ دیکھ
یہ شبِ فرقت ہے، اس میں کم ہے امکانِ سحر

صاف آتا ہے نظر انجام ہر آغاز کا
زندگانی موت کی تمہید ہے میرے لئے
جاگ اُٹھتی ہے تہِ دامانِ شب سے صبحِ نو
موت کیا ہے زیست کی تجدید ہے میرے لئے

جو تو غمخوار ہو جائے تو غم کیا،
زمانہ کیا، زمانے کے ستم کیا
مرا ہونا نہ ہونا ہے برابر
نشاطِ ہستی و خوفِ عدم کیا
شہیدِ یک نظر ہوں گے دل و جاں
ہماری آرزو کیا اور ہم کیا

ذوقِ مستی مرا محتاجِ مے و جام نہیں
گر نہیں بادۂ گلگوں، شفقِ شام تو ہے

ہوسِ گُل میں بڑھایا نہ کبھی میں نے ہاتھ
نہ کسی خار سے اُلجھا کبھی دامن میرا

کہاں افسانۂ ہستی کا آغاز
سناتے آئے ہیں سب درمیاں سے
تمہارے آستاں پر خاک میری
زمیں ٹکرا رہی ہے آسماں سے

تجھ سے راحت چھین لی جائے گی کل اُس کے لئے
اے دلِ راحت طلب! جو مبتلائے ایذا ہے آج
دامنِ فردا میں ہو گا کیا نہ غم تیرے لئے
اے دلِ ناداں عبث مجھکو غمِ فردا ہے آج

بادِ بہار! تجھ سے امیدِ نشاط کیا
بس اس قدر کہ زخمِ کہن کو ہرا کرے
حالت وہ دل کی اب ہے کہ گزرا زباں سے کام
میری نگاہِ یاس ہی اس کو ادا کرے

غلط کہ ہجر میں حاصل مجھے قرار نہیں،
اسیرِ یاس ہوں، پابندِ انتظار نہیں،
یہاں تو ضبطِ جنوں پر نہ کر مجھے مجبور
فضائے دشت ہے اے عقل! بزمِ یار نہیں

بیدار کے لئے نہیں ممکن اگرچہ خواب
جو کچھ ہے خواب ہے دلِ بیدار کے لئے

ظلمتِ یاس ہے وہی، داغِ جگر کو کیا کروں
غم کی گھٹا نہ کھل سکی، آہ سحر کو کیا کروں
اشکِ رواں نہ ایک دن، دل کی لگی بجھا سکے
گریۂ غم سے کیا ملا۔ دیدۂ تر کو کیا کروں
جلوۂ برقِ حُسن ہے دشمنِ خرمنِ قرار
دل کو بچاؤں کس طرح؟ ذوقِ نظر کو کیا کروں

انند نرائن ملاؔ

پیدائش: اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ء — مقام پیدائش: آبائی مکان محلہ رانی کٹرہ لکھنؤ — خاندان: میرا خاندان کشمیری ہے میرے جدامجد پنڈت سیتارام ملا کشمیر سے کلکتہ چلے آئے تھے ان کے صاحبزادے (میرے دادا) پنڈت کالی سہائے ملا کی تربیت لکھنؤ میں ہوئی اور اسی وقت سے میرا خاندان مستقل طور پر یہاں رہنے لگا میرے دادا کے دو اولادیں ہوئیں پنڈت بشن نرائن ملا اور پنڈت جگت نرائن ملا جو میرے والد تھے — تعلیم: سنہ ۱۹۱۱ء سے لیکر سنہ ۱۹۱۷ء تک گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ میں ہوئی جواب گورنمنٹ جوبلی انٹرمیڈیٹ کالج ہے سنہ ۱۹۱۷ء میں انٹرنس پاس کیا پھر سنہ ۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک کیننگ کالج لکھنؤ میں سنہ ۱۹۱۹ء میں ایف۔ اے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں بی۔ اے سنہ ۱۹۲۳ء میں ایم۔ اے اور سنہ ۱۹۲۵ء میں ال۔ ال۔ بی کا امتحان پاس کیا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں بیٹھا لیکن اُردو کے پرچہ میں بہت کم نمبر ملنے کی وجہ سے فیل ہو گیا۔ نمبر کم ملنے کی غالباً دو وجہیں تھیں ایک تو پرچہ کے جوابات بجائے اُردو کے انگریزی میں دئے دوسرے رائج الوقت نقطۂ نظر سے بالکل اختلاف تھا۔ مثلاً میر کو خدائے سخن ماننے کو ہرگز تیار نہیں۔ کیونکہ میر کی شاعری محض ایک شغل دل کی شاعری ہے۔ نہ اس میں کوئی فلسفیانہ گہرائی ہے نہ ذہنی رفعت۔ میر کا شاعری میں درجہ کیا ہے اس کے متعلق ایک سوال پرچہ میں تھا اور ممکن ہے کہ ایسے جواب کو دیکھ کر ممتحن نے یہ اندازہ کیا ہو کہ یہ اُردو ادب سے بالکل بے بہرہ ہے — ۹ فروری سنہ ۱۹۲۳ء کو شادی ہوئی — سنہ ۱۹۲۶ء سے لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ وکالت خاندانی پیشہ کی حیثیت رکھتی ہے گو "کہتے ہیں وکالت جیسے گھٹی میں پڑی ہے"۔

اسکول اور کالج کی طالبعلمی کے زمانہ میں گھر پر اُردو اور فارسی مولانا محمد برکت اللہ صاحب رضاؔ مرحوم فرنگی محلی سے پڑھتا تھا اور وہ اکثر سبق دیکر غزل کہنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ہر طرح پر کم سے کم وہ پچاس ساٹھ شعر کہتے تھے۔ جب میں کالج کا طالبعلم تھا تب انھوں نے دو تین بار اپنے کہے ہوئے اشعار پڑھنے کے لئے دئے لیکن میں نے پڑھنا گوارا نہ کیا۔ مولانا بھی ناراض ہوئے اور یہ بھی بتایا کہ شروع شروع میں سب یہی کرتے ہیں لیکن مجھے پھر بھی قبول نہ ہوا۔ غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے وہ شعر پسند نہ آتے تھے مولانا نے میری طرف سے ایک قطعۂ تاریخ کہکر اپنے کسی شاگرد کے دیوان کے ساتھ جو کہ ایک راجہ تھے چھپوا بھی دیا۔ ان کا نام شاید اشفاق حسین تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میرا تخلص بھی اثر رکھدیا گیا ہے۔ جب میں نے مولانا سے شکایت کی تب انھوں نے ناراض ہو کر فرمایا کہ نہ آئندہ مجھے کوئی عطیہ دیں گے اور اگر میں کہوں گا بھی تو میرے اشعار کی

اصلاح نہ فرمائیں گے۔

جب سے کہ میں ۱۵ یا ۱۶ سال کی عمر میں کالج آیا تھا مجھے انگریزی میں تھوڑی بہت نظم کرنے کی عادت ہو گئی تھی اور میرا انگریزی کلام کالج میگزین میں شایع ہوا کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں میں نے انیس کی چند رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا جس کو لوگوں نے کافی پسند کیا تھا۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں میری صحت کچھ خراب ہو گئی اور ڈاکٹروں نے ایک مہینہ تک بستر پر ڈال رکھا۔ کوئی ایسی بیماری نہ تھی کہ میں اور کام نہ کر سکوں صرف شام کو حرارت ہو جاتی تھی۔ پڑے پڑے جی گھبراتا تھا تو زیادہ تر وقت کتابیں پڑھنے میں میں صرف ہوتا تھا اُسی زمانہ میں میں نے اقبال کے فارسی کلام کا مجموعہ جو "پیام مشرق" کے نام سے شایع ہوا تھا پڑھا۔ اُس کی پہلی نظم "لالۂ طور" پڑھی........ یہ نظم اس قدر زیادہ پسند آئی کہ میں نے پڑے پڑے قریب .. قطعات کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا جب میرے احباب نے یہ ترجمہ دیکھا تو انھوں نے اسے بے انتہا پسند کیا۔ پنڈت منوہر لال زتشی جو جوبلی اسکول میں میرے ہیڈ ماسٹر بھی رہ چکے تھے اور ہمیشہ میرا دل بڑھایا کرتے تھے انھوں نے جب یہ ترجمہ دیکھا تو انھوں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں اپنی شاعرانہ قابلیت کو انگریزی شعر کہکر ضایع نہ کروں بلکہ اُردو میں شعر کہا کروں۔ میں نے اس وقت تک مذاقاً شاید کبھی کوئی شعر کہا ہو لیکن ایک مکمل غزل کبھی نہ کہی تھی۔ میں نے عذر کیا کہ اُردو میں کہنا میرے بس کی بات نہیں۔ ان کا اصرار مگر جاری رہا اور جب ملتے تھے تو ٹوکتے تھے کہ تم نے کچھ کہا یا نہیں۔ چنانچہ ان کے اصرار پر میں نے غالباً سنہ ۲۸ء میں پہلی نظم کہی جس کا عنوان "پرستارِ حسن" تھا۔ انھوں نے اس نظم کو اتنا پسند کیا کہ اس کی نقلیں اپنے احباب کو بھیجیں جن کے مبارکباد کے خطوط میرے پاس آئے۔ اس نظم کو زمانہ میں انھوں ہی نے بھیجا اور "زمانہ" میں یہ ایک ایڈیٹوریل نوٹ کے ساتھ شایع کی گئی اس کے بعد تو ان کا اور نیز دیگر احبا کا اصرار اور بڑھ گیا اور میں مستقلاً نظم کہنے لگا۔ زمانہ میں دو چار نظمیں چھپنے کے بعد شہر کے مشاعروں کے دعوت نامے آنے لگے۔ اور بہار مرحوم نے گھیر کر انجمن معین الادب کا ممبر بھی بنا لیا۔

کبھی شعر کہنے کی نیت سے بیٹھکر آجتک شعر نہیں کہا جو کچھ کہا ہے وہ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی لکھکر کچھ نہیں کہا۔ بڑی سے بڑی نظمیں اولین مصرعہ سے لیکر آخر تک دماغ ہی میں نظم ہوئیں۔ پہلے خاکہ سے لیکر آخری خاکہ تک یہیں انکی اصلاح اور ترقی ہوتی رہی اور مکمل ہو جانے کے بعد بھی دماغ ہی میں محفوظ رہیں۔ اکثر نظمیں محفلوں میں پڑھے جانے کے کئی مہینہ بعد کاپی پر لکھی گئیں۔ آج بھی قریب قریب اپنی ساری نظمیں یاد ہیں، جس میں کچھ کم سے کم بارہ سال پُرانی ہوں گی غزلیں بھی یونہی کہی گئیں اور وہ بھی اسی طرح یاد ہیں۔ چونکہ خیال پر کبھی قافیہ اور ردیف کی پابندی لگا کر فکر نہیں کی لہذا ایسا کئی بار ہوا کہ طرح پر تو شعر کوئی نہ کہہ سکے لیکن دو دو چار چار شعر طبعزاد زمینوں میں نکل آئے۔ ایسا تو ہمیشہ ہوا کہ ایک غزل کہتے کہتے دو چار طبعزاد غزلیں تیار ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزلوں کے مجموعہ میں طرحی غزلیں بہت کم ہیں اور غیر طرحی بہت۔

شروع شروع میں میرے احباب نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں کسی کا شاگرد بن جاؤں لیکن میرے ذوق نے اسے گوارا نہ کیا

اول تو یہ کہ شاگردی سے انفرادیت اس قدر سخت مجروح ہوتی ہے کہ وہ پھر جاں بر نہیں ہو سکتی اُستاد کا رنگ شاگرد کے کلام پر ایک نہ ایک حد تک ضرور حاوی ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر شخص کا تجربہ مختلف ہوتا ہے۔ اس کے جذبات میں مختلف طریقوں سے کیفیت پیدا ہوتا ہے اور اس کے دل و دماغ پر ایک مخصوص عالم طاری ہوتا ہے جس میں کوئی اُس کا شریک نہیں ہو سکتا۔ ایک آدمی کے دل کی ترجمانی دوسرا کس طرح کر سکتا ہے۔ کہنے کو تو غم اور خوشی دُنیا میں سب کو ہوتی ہے لیکن ایک ہی غم اور خوشی کا اثر دنیا میں دو انسانوں پر بھی یکساں نہیں ہوتا۔ وہی شاعر کامیاب ہے جو اس مخصوص اثر کو ادا کر سکتا ہے لہذا ظاہر ہے کہ شاعر کے لئے سب سے پہلے صداقت کی ضرورت ہے اور صداقت دوسرے کے رنگ میں ڈوب کر قایم نہیں رہ سکتی۔ اُستاد زبان کی غلطیاں ضرور دور کر سکتا ہے لیکن اس طرح شاگرد کی ذہنی ترقی نہیں ہوتی اور اگر شاگرد میں جوہر قابل ہے تو وہ خود کچھ زمانہ بعد اپنے پُرانے کلام پر نظر ثانی کر کے ان غلطیوں کو بغیر اپنے مفہوم کا خون کئے ہوئے استاد سے کہیں بہتر طریقہ سے نکال سکتا ہے۔

ابھی تک کوئی پچاس ساٹھ نظمیں کہی ہیں اور قریب سو غزلیں پیشہ کی مصروفیت کی وجہ سے کوئی وقت فکرِ سخن کے لئے نہیں ملتا۔ اور جو کچھ ملتا بھی ہے وہ مشاعرہ میں شریک ہونے کے خیال سے کسی غزل کہنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نظمیں سال میں تین چار سے زیادہ کہنے کا وقت نہیں ملتا۔ اتنی بھی فرصت نہیں ملتی کہ جو کچھ کہا ہے اسی پر نظر ثانی ڈالی جائے اور اسے شایع کرا دیا جائے۔

آنند نرائن ملا

تڑپ شیشے کے ٹکڑے بھی اُڑا لیتے ہیں ہیرے کی
محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی

کسی کے لطفِ بے پایاں نے کچھ یوں سوئے دل دیکھا
کہ اب ناکردہ جرموں کی پشیمانی نہیں جاتی

یہ بزمِ دیر و کعبہ ہے نہیں کچھ صحنِ میخانہ
ذرا آواز گونجی اور پہچانی نہیں جاتی

نظر جھوٹی۔ شباب اندھا۔ وہ حُسن اک نقشِ فانی ہے
حقیقت ہے تو ہو لیکن ابھی مانی نہیں جاتی

نظر جس کی طرف کر کے نگاہیں پھیر لیتے ہو،
قیامت تک پھر اُس دل کی پریشانی نہیں جاتی

مجھے دھوکا نہ دیتی ہوں کہیں ترسی ہوئی نظریں
تمہیں ہو سامنے یا پھر وہی تصویرِ خواب آئی؟

جسے میں چاہتا ہوں وہ اگر قسمت سے بالا ہے،
مرے حصہ میں کیوں میری نگاہِ انتخاب آئی

کرن مہتاب کی پھولوں میں جب تھی جانِ تسکیں تھی
یہی ذرّوں میں کیا آئی کہ موجِ اضطراب آئی

شیخ میں اور ترکِ عصیاں وہ بھی جنّت کے لئے
جب خطا کی تھی مرے قبضہ میں کیا جنّت نہ تھی

مائل بہ ستم چرخ زمیں بر سرِ کیں ہے
آخر مری دنیائے تمنا بھی کہیں ہے

دل مرکزِ احساس ہے ایذائے جہاں کا
لگ جائے کہیں چوٹ مگر درد نہیں ہے

صبر آنے کو آ جائے مجھے حسرتِ دل پر
لیکن یہ تقاضائے جوانی تو نہیں ہے

یا یہی کہدے کہ راحت تری قسمت میں نہیں ــــــ یا جو دینا ہے تو دے آج قیامت میں نہیں،
ہاں دوسرے کا درد ہے پھر دوسرے کا درد ــــــ لینے کو اپنے دل پہ اثر ہم ہزار لیں،

جفا صیاد کی اہلِ وفا نے رائگاں کر دی ــــــ قفس کی زندگی وقفِ خیالِ آشیاں کر دی
یہ دل کیا ہے کسی کو امتحانِ ظرف لینا تھا ــــــ تنِ خاکی میں اک چھوٹی سی چنگاری نہاں کر دی
بھرم حسنِ حقیقت کا کوئی کھلنے نہیں دیتا ــــــ نظر جب سامنے آئی تجلی درمیاں کر دی
تری بے مہریاں آخر وہ نازک وقت لے آئیں ــــــ کہ اپنوں کی محبت بھی طبیعت پر گراں کر دی
اسیر آنکھیں کہاں سے سیرِ گلشن کے لئے لائیں ــــــ نظر جتنی بھی تھی صرفِ تلاشِ آشیاں کر دی

میکشوں نے پی کے توڑے جام مے ــــــ ہائے وہ ساغر جو رکھے رہ گئے

ہر شورشِ حیات سے بدظن بنا دیا ــــــ دُنیا کو اہلِ امن نے مدفن بنا دیا
اظہارِ دردِ دل کا تھا اک نام شاعری ــــــ یارانِ بیخبر نے اسے فن بنا دیا
اک ربطِ باہمی کا جو امکاں نہ ہو سکا ــــــ گل جمع بھی ہوئے تو گلستاں نہ ہو سکا
دل بجھا شمعِ کائنات گئی ــــــ زندگی کی اُجالی رات گئی
دل کا چراغ جب تلک تجھ سے جلے جلائے جا ــــــ رات بھی ہے اگر تو کیا رات کو دن بنائے جا

سرِ محشر یہی پوچھوں گا خدا سے پہلے ــــــ تو نے روکا بھی تھا مجرم کو خطا سے پہلے
اشک آنکھوں میں ہیں ہونٹوں پہ بکا سے پہلے ــــــ قافلہ غم کا چلا بانگِ درا سے پہلے
اُڑ گیا جیسے یکایک مرے شانوں پر سے ــــــ وہ جو اک بوجھ تھا تسلیمِ خطا سے پہلے
راز ہے نوشی ملا ہوا افشا ورنہ ــــــ کیا وہ بدمست نہ تھا لغزشِ پا سے پہلے

آئینہ رنگینِ جگر کچھ بھی نہیں کیا ــــــ کیا حسن ہی سب کچھ ہے نظر کچھ بھی نہیں کیا
ناگفتہ اشارے بھی ہیں جن کے مجھے احکام ــــــ ان پر مرے نالوں کا اثر کچھ بھی نہیں کیا
مانا مرے جلنے سے نہ آنچ آئے گی تم پر ــــــ لیکن مرے جلنے میں ضرر کچھ بھی نہیں کیا

نہر وہ ہے خاک کے ذرے جو کر دے زرنگار ــــــ اونچی اونچی چوٹیوں پر نور برسانے سے کیا
عرش بریں پہ چمکا آج اور اک ستارہ ــــــ کس نے خلوصِ دل سے سر رکھدیا زمیں پر
ذرہ ذرہ پہ لکھا ہے مرا افسانۂ دل ــــــ پہلے تقصیر نے پھر ذوقِ جبیں سائی نے

پیہم رہِ طلب میں مشکل کا سامنا ہے ــــــ ہر گام پر فریبِ منزل کا سامنا ہے
ہشیار حسن حیرت ارمان بن چلی ہے ــــــ پہلے فقط نظر تھی اب دل کا سامنا ہے

ظالم مری حیات کا دورِ شباب ہے
ہاں ہاں تری جفا پہ بھی جینے کی تاب ہے

قفس والے نہ گل دیکھیں نہ سبزہ
نظر جتنی ہے صحنِ آشیاں ہے

گلِ خنداں ابھی غافل ہے شاید
وہی گلچیں بھی ہے جو باغباں ہے

ارماں کو چھپانے سے مصیبت میں ہو جاں اور
شعلہ کو دباتے ہیں تو اٹھتا ہے دھواں اور

اتنا بھی مرے عہدِ وفا پر نہ کرو شک
ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں کہ ہے رسمِ جہاں اور

اب کوئی صدا میری صدا پر نہیں دیتا
آوازِ طرب اور تھی آوازِ فغاں اور

تابِ جلوہ بھی تو ہو وہ سوئے بام آیا تو کیا،
چشمِ موسیٰ کے لئے گر عشق تشنہ کام آیا تو کیا

مدعائے دل سمجھ لیں گے اگر چاہیں گے وہ
میرے ہونٹوں تک سوالِ ناتمام آیا تو کیا

ظرفِ سائل بھی بدل اے رحمتِ سائل نواز
مے سے پُر ان کانپتے ہاتھوں میں جام آیا تو کیا

پُر ہے تیرے ذکر سے اپنی حدیثِ زندگی،
اس میں بھولے سے کہیں دل کا بھی نام آیا تو کیا

خونِ دل ضایع نہ ہو، مجھ کو بس اتنی فکر ہے
اپنے کام آیا تو کیا، غیروں کے کام آیا تو کیا

ہیں ابھی خاکسترِ ملّا میں کچھ چنگاریاں
شعلۂ ہستی قریبِ اختتام آیا تو کیا

اشک بن کر آ گئی ہیں وہ التجائیں چشم تک
جن کے کہنے کے لئے ہونٹوں میں گویائی نہیں

تیری اُجڑی ہوئی جنت کو بسانے والا
وہی غصے میں نکالا ہوا انساں نکلا

ابھی شباب ہے کر لوں خطائیں جی بھر کے
پھر اس مقام پہ عمرِ رواں ملے نہ ملے

دل ہے اک دولت مگر درد آشنا ہونے کے بعد
اشک موتی ہیں مگر غم کی جلا ہونے کے بعد

تا بہ دامن آئی اک بے رنگ سی پانی کی بوند
تھا ہی کیا آنسو میں حرفِ التجا ہونے کے بعد

اسی کا نام جینا ہے جگر خوں ہو تو ہو جائے
نقوشِ دہر میں اک خاص اپنا رنگ بھر جانا

گزری حیات وہ نہ ہوئے مہرباں کبھی
سنتے تھے ہم کہ عشق نہیں رائگاں کبھی

آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار
گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی

ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہِ لطف
پھر خوں کو یوں رگوں میں نہ دیکھا رواں کبھی

مری باتوں پہ دُنیا کی ہنسی کم ہوتی جاتی ہے
مری دیوانگی شاید مسلّم ہوتی جاتی ہے،

ابھی سن لو تو شاید سُن سکو تم دل کے نغموں کو
کہ اب اس کی صدا کچھ خود بخود کم ہوتی جاتی ہے

تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے
ترے ہاتھوں بہت توہینِ آدم ہوتی جاتی ہے

خالی ہے مرا ساغر تو ہے ساقی کو اشارا کون کرے
خودداریِ سائل بھی تو ہے کچھ بار تقاضا کون کرے

دنیائے محبت بھی ہے عجب دو دل ملنے کو راضی ہیں — لیکن یہ تکلف حائل ہے پہلا وہ اشارا کون کرے
جب دل تھا شگفتہ گل کی طرح ٹہنی کانٹا سی چبھتی تھی — اب ایک فسردہ دل لیکر گلشن کی تمنا کون کرے
بسنے دو نشیمن کو اپنے پھر ہم بھی کریں گے سیرِ چمن — جب تک کہ نشیمن اُجڑا ہے پھولوں کا نظارا کون کرے

نہ شاخ میں یہ کہیں سوکھ جائیں پھول مرے — جو توڑنا ہوں تو اب توڑ، انتظار نہ کر
مآلِ زیست سے گھبرا کے کر نہ خونِ شباب — خزاں کے خوف سے رسوائی بہار نہ کر

جس کے خیال میں ہوں گم اُس کو بھی کچھ خیال ہے — میرے لئے یہی سوال سب سے بڑا سوال ہے،

رُخ اپنا آئینہ مجھ کو بنا کے دیکھ لیا — مری نگاہ کے پردے میں آ کے دیکھ لیا
اب اور اس سے سوا چاہتے ہو کیا ملاؔ — یہ کم ہے اُس نے تمھیں مسکرا کے دیکھ لیا

جو اپنی موت سے دُنیا میں کچھ کمی نہ ہوئی — تو زیست مستحقِ نامِ زندگی نہ ہوئی

اور دنیا میں کہیں تیرا ٹھکانا ہی نہیں — اے مرے دل کی تمنا لبِ خاموش میں آ
عشق کرنا ہے تو پھر عشق کی توہین نہ کر — یا تو بیہوش نہ ہو، ہو تو، نہ پھر ہوش میں آ

مجھے یہ ڈر ہیں کچھ کہہ نہ دے نظر تیری — انھیں گلہ کہ پیامِ نظر زباں پہ نہیں
حیاتِ فکرِ نشیمن میں کاٹنے والو، — چمن کا کیا کوئی حق اہلِ آشیاں پہ نہیں
کسی کے پاؤں کا روندا ہوا نہیں ملاؔ — وہ ہے تو گرد مگر راہِ کارواں پہ نہیں

ہم نے بھی کی تھیں کوششیں، ہم نہ تمھیں بھلا سکے — کوئی کمی ہمیں میں تھی یاد تمہیں نہ آسکے
زیست کی راحتوں میں بھی غم نہ ترا بھلا سکے — لب سے ہنسے ہزار بار دل سے نہ مسکرا سکے
قفل سا اک زباں پہ تھا آنکھ میں کچھ نمی سی تھی — ہوش نہیں کہ دل کا بھید کہہ گئے یا چھپا سکے
اپنے ہی شوق کی خطا اپنی ہی آنکھ کا قصور — وہ تو اُٹھا چکا نقاب ہم نہ نظر اُٹھا سکے

کام، عشق بے سوال آ ہی گیا — خود بخود اس کو خیال آ ہی گیا
تم نے پھیری لاکھ نرمی سے نظر — دل کے آئینہ میں بال آ ہی گیا
غم بھی ہے اک پردۂ اظہارِ شوق — چھپ کے آنسو میں سوال آ ہی گیا
بچ کے جاؤگے کہاں ملاؔ، کوئی — ہاتھ میں لیکر کلال آ ہی گیا

مری بات کا جو یقیں نہیں مجھے آزما کے بھی دیکھ لے — تجھے دل تو کب کا میں دے چکا اسے غم بنا کے بھی دیکھ لے
یہ تو ٹھیک ہے کہ تری جفا بھی ہے اک عطا مرے واسطے — مری حسرتوں کی قسم تجھے کبھی مسکرا کے بھی دیکھ لے
میں آج ہی اسے کیوں حرفِ دل نہ کر ڈالوں — یہ خوں کی بوند مجھے کل یہاں ملے نہ ملے

متاعِ شوق کو اشکوں کے ساتھ بھیج بھی دوں
پھر اس کے بعد کوئی کارواں ملے نہ ملے

میرے جگر کی تاب دیکھ رخ کی شگفتگی نہ دیکھ
فطرتِ عاشقی سمجھ، قسمتِ عاشقی نہ دیکھ

تجھ پہ عیاں ہے رازِ دل جان کے بن نہ بے خبر
معنیٔ خامشی سمجھ، صورتِ خامشی نہ دیکھ

تری محفل میں ہوں میں بھی مگر بیگانۂ محفل
کسی زنجیر میں جُڑتی نہیں شاید کڑی اپنی

وہ بھی آتے ہیں بن کے شکلِ بہار
وہ جو خونِ بہار کے دن ہیں

فسردہ ہوتے ہوئے ڈالیوں پہ پھولوں کو
خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہو اور خزاں میں نہیں

اپنے جی میں یہ کہ دُنیا چھوڑ دیں
اور دنیا کو ہمیں سے کام ہے

جل چکے چشمِ اعزہ میں چراغ
سو بھی جا تلا کہ وقتِ شام ہے

رہروِ صادق اُٹھاتا ہے قدم کس شوق سے
ہاں مگر جب تک نظر کے سامنے منزل نہیں

کچھ بھی کہنے کی مجھے ان سے ضرورت نہ پڑی
آ گیا کام مرا بے سروساماں ہونا،

اُسی کو جس نے نہ کی بھول کر بھی بات کبھی
بغیر یاد کئے کٹ سکی نہ رات کبھی

بس ایک پھول نمایاں ہے دل کے داغوں میں
یہاں رُکی تھی تری چشمِ التفات کبھی

وہ اک زمانہ کو اپنے ناز و ادا کے جلوے دکھا رہے ہیں
مری نظر سے جو لے گئے ہیں وہی خزانے لٹا رہے ہیں

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

وہ دیکھتے تو ہیں مجھکو مگر چرا کے نظر
حجاب ٹوٹ رہے ہیں مگر حجاب کے ساتھ

جو گل تھے قبر انھوں نے سنواری غریب کی
جو ننگِ گل تھے زینتِ دستار ہو گئے

میری اُلفت نے انھیں کر تو لیا ہے اپنا
اب فقط شرم کی سینہ سپری باقی ہے

تری ہستی سے منکر ہوتے جاتے ہیں جہاں والے
سنبھال اپنی خدائی کو ارے او آسماں والے

سوکھنے پائے نہ دل میں دیکھ خوئے آرزو
سینکڑوں دریا تنک آبی سے صحرا بن گئے

امرِ اُلفت مثل میرے کوئی سمجھا ہی نہیں
آج تک میں نے انھیں جی بھر کے دیکھا ہی نہیں

پھر ہوسِ نظارہ کر بزمِ جمالِ یار میں
پہلے نظر کو تاب دے آتشِ انتظار میں،

ایک جگر کا سوز و ساز کشمکشِ امید و یاس
ایک فسانۂ حیات دفن ہے ہر مزار میں

سختیٔ زیست عشق سے دور نہ ہو سکی مگر
پھول تو کچھ کھلا دئے دامنِ کہسار میں،

مجھ کو غمِ انساں کی حقیقت نظر آئی،
دُنیا ابھی محتاجِ محبت نظر آئی

تم جس کو سمجھتے ہو کہ ہے حسن تمہارا
مجھکو تو وہ اپنی ہی محبت نظر آئی

ناطق گلاوٹھوی

میرا نام ابوالحسن ہے۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی ظہور الدین حسن تھا۔ وطن مالوف قصبہ گلاوٹھی ضلع میرٹھ۔ غالباً ۱۱ نومبر ۱۸۸۶ء کو شہر کامٹی میں جو ناگپور سے ۹ میل ہے پیدا ہوا۔ سلسلۂ نسب سادات گیلان سے ملتا ہے۔ ہندوستان میں مولانا سید منہاج الدین صاحب مورث اعلیٰ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تشریف لائے جن کا میں ساتواں پوتا ہوں۔ جدی جایداد کا غدر ۱۸۵۷ء میں خاتمہ ہوگیا جبکہ میرے ایک تایا صاحب کو پھانسی بھی دی گئی۔ والد صاحب نے جو کچھ پیدا کیا تھا اُسے چھوٹے بھائی نے میری عدم موجودگی میں ختم کیا اور مر بھی گیا خدا اُس کی مغفرت کرے۔ والد صاحب کو بھی ذوق سخن تھا مگر وہ لکھ کر جمع کرنے کے عادی نہ تھے۔ میرے تایا سید فیض الحسن صاحب جو بھاولپور کے وزیر اعظم ہوکر وہیں سو رہے ہیں ایک زبردست عالم ادیب اور شاعر تھے مگر اُن کے صاحبزادے نے اُن کا سب کچھ برباد کر دیا۔ زمانۂ تعلیم وطن مالوف میں گزرا اور دارالعلوم دیوبند سے علوم عربیہ کی سند حاصل کی۔ میرے زمانہ کے اساتذہ مولانا شیخ الہند مولانا خلیل احمد سہارنپوری مولانا محمد حسن مرادآبادی اور مولانا ماجد علی صاحب جونپوری تھے اور اس وقت کے طلبہ میں مولانا انور شاہ مولانا حسین احمد مدنی تھے خود میں کیا تھا یہ معلوم نہیں۔ انگریزی کہیں پڑھی نہیں مگر ضرورت زمانہ نے یہ زبان بھی سکھائی اور اس میں بھی تحریر و تقریر کی ضرورتوں کو پورا کر لیتا ہوں شاعری ۱۹۰۰ء میں شروع کی ۱۹۰۲ء میں حضرت داغ سے تلمذ حاصل کیا اور ہنوز چار چھ غزلوں پر اصلاح لینے پایا تھا کہ اُن کا انتقال ہوگیا پھر کسی کو کلام دکھانے کا خیال نہیں کیا ہمیشہ اپنے لکھے پر خود اصلاح کی۔ عرصۂ دراز سے بسلسلۂ تجارت خاص شہر ناگپور میں مقیم ہوں۔

ممالک متوسط کے غیر موزوں ماحول کی بدولت مدت دراز سے مشق سخن غائب ہے عرصہ سے یہ ہو رہا ہے کہ کوئی سال ایسا نہیں آیا جس میں پانچ سے زیادہ غزلیں لکھنے کا اتفاق ہوا ہو اور ایسے بھی کئی سال گزرے ہیں جن میں ایک غزل بھی نہیں کی۔ فی الحال زندہ ہوں مگر تندرست نہیں موت کے استقبال کو آمادہ ہوں مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ سخت جانوں کو موت جلدی نہیں آیا کرتی۔

ناچیز ناطق - ۲۵ ستمبر ۴۰ء

پست ہمت نہ کہیں دیدۂ گریاں ہونا   اب بہت دور نہیں گھر سے بیاباں ہونا

تو تو جا مونسِ غم، فکرِ دلِ زار نکر،
میرے اللہ کو آتا ہے نگہباں ہونا

یہ خدا کی شان تو دیکھئے کہ خدا کا نام ہی رہ گیا
مجھے تازہ یادِ بتاں ہوئی جو حرم سے شورِ اذاں اُٹھا

مرے صبر نے بھی غضب کیا کہ عدو کی جان پہ بن گئی
یہ کہاں کی چوٹ کہاں لگی یہ کہاں کا درد کہاں اُٹھا

وصفِ جمال، ذوق ہے اہلِ نگاہ کا
حیرت کہوں کہ شور کہوں واہ واہ کا

رکھتا ہے تلخ کام غمِ لذتِ جہاں،
کیا کیجئے کہ لطف نہیں کچھ گناہ کا

عالم کون و مکاں نام ہے ویرانے کا
پاس وحشت نہیں گھر دور ہے دیوانے کا

کہنے والے وہ سننے والا میں،
ایک بھی آج دوسرا نہ ہوا

اب کہاں گفتگو محبت کی
ایسی باتیں ہوئے زمانہ ہوا

ناز اُدھر دل کو اُڑا لینے کی گھاتوں میں رہا
میں اِدھر چشمِ سخن گو تری باتوں میں رہا

بیمار ہے ہیں دوست مجھے آ رہا ہے دوست
کیا موت کو بھی آج ہی مرنا ضرور تھا

اسے بادہ کش گئی ہے مئے عیش کس کے ساتھ
ہر اک نے سے کے جام کو آگے بڑھا دیا

مجھ پہ اتنا تو کرم گردشِ دوراں ہوتا
یہ تو ہوتا کہ کہیں بیٹھ کے گریاں ہوتا

جس کی حسرت تھی اُسے پا بھی چکے کھو بھی چکے
اب کسی چیز کا ہم کو نہیں ارماں ہوتا

خراب، خانۂ خانہ خراب ہو نہ سکا
یہاں کوئی اثر انقلاب ہو نہ سکا

اُسی کی دین ہے غم میں گلا نہیں کرتا
قبول ہو کہ نہ ہو اب دعا نہیں کرتا

ملے مراد ہماری مگر ملے بھی کہیں
خدا کرے مگر ایسا خدا نہیں کرتا

سرد ہو جاتی ہے فکرِ جاہِ دُنیا جس کے بعد
وہ ذرا سا ہے خیال ایدل کہ پھر کیا اس کے بعد

بیخودی آئی تھی اُن کے بعد بزمِ ناز میں
پھر نہیں معلوم ہم کون آیا کس کے بعد

غم کی دنیا ہے خاطرِ ناساز
واہ رے بیکسی ترا انداز

زندگی کا ثبوت نالۂ زار
وہ بھی کیا اک مری ہوئی آواز

صیاد اب قفس کی مصیبت گراں نہیں
میں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ آشیاں نہیں

صحرائے زندگی سے نہ بھاگوں تو کیا کروں
آخر کہاں تک اس میں بھٹکتا پھرا کروں

باقی نہیں جہان میں کوئی مانگنے کی چیز
اب ہاتھ بھی اُٹھاؤں تو میں کیا دعا کروں

شامِ غم کو تو ابھی دیر ہے آنے کے لئے
دو گھڑی دن سے نہ ہم کوچ کا ساماں کر دیں

آج بھی کچھ یوں تو اس دنیا میں کل سے کم نہیں،
ہے وہی عالم مگر افسوس وہ عالم نہیں

دیکھ لو اہلِ چمن رسوائیِ صبحِ بہار
کون سا گل ہے کہ جس پر قطرۂ شبنم نہیں

مٹ گیا کھو کر شریکِ عیش ذوقِ اختلاط
غم ہے اور ہم اب ہمیں فکرِ شریکِ غم نہیں

چارہ گر مست کی دنیا ہے زمانے سے جدا
ہوش میں آگئے جہاں ہم ہیں وہاں ہوش نہیں

یاد کرنے کی تو باتیں ہیں بہت سی ناطق
پہلے وہ بھول تو جاؤں جو فراموش نہیں

یہ زندگی ہی ناطق آزارِ زندگی ہے
میں خارِ پیرہن ہوں خود اپنے پیرہن میں

ابھی ہم جان دیکر سوئے ہیں دم لیکے اُٹھیں گے
نہ چھیڑ اے شورِ محشر ہٹ ذرا آرام لیتے ہیں

نہیں کچھ کام لینے کا اگر بازارِ دُنیا میں
تو اچھا لاؤ دیدو ہم دلِ ناکام لیتے ہیں

کیف آمادۂ ہستی دلِ رنجور نہیں
اب تو غم ہو کہ خوشی کچھ ہمیں منظور نہیں

لوٹ چل عمرِ رواں بڑھ کے ملا لیتے ہیں
ابھی گزرے ہوئے ایام گئے دور نہیں

فراہم کر رہا ہوں اپنی بربادی کا افسانہ
جو کلیاں میں نے دیکھیں تھیں وہ کلیاں دیکھتا ہوں میں

خیالِ خواب راحت حسرتِ سامانِ دلجمعی
نہیں سوتا مگر خوابِ پریشاں دیکھتا ہوں میں

وہ بزمِ ناز وہ اُس جلوۂ جہاں بخش کا عالم
جہاں لوگوں نے جیتی جاگتی دیکھی ہیں تصویریں

ہوا ایمان تازہ شورِ ناقوسِ برہمن سے
مری بھولی ہوئی یاد آ رہی ہیں مجھکو تکبیریں

فردوس کو احباب کی محفل تو بنا دو
پہلے مری کھوئی ہوئی دُنیا مجھے لا دو

حدودِ مہد سے اے رہروانِ منزلِ پیری
کہیں شاید نظر آئے جوانی دیکھتے جاؤ

ہمارے بعد جو دنیا کہے گی وہ بھی سُن لینا
ابھی تو تم ہماری بے زبانی دیکھتے جاؤ

میں کہوں کیا کوئی کہنے نہیں دیتا مجھکو
آپ سُن لیجئے کیا کہتی ہے دُنیا مجھکو

کہتے ہیں جسے وحشت وہ بات کہاں صاحب
کیا کہتے ہو مجنوں ہے دیکھا ہوا دیوانہ

جب ذکر نکلتا ہے بیتابیِ خاطر کا
سو طرح مچلتا ہے چھیڑا ہوا افسانہ

اس دور میں بھی ناطق جویائے محبت ہے
کس وہم میں پھرتا ہے کھویا ہوا دیوانہ

لاتا صنم کدے سے تھی کیا مجال واعظ
جی ہاں ہمیں اُٹھا تا ہم راہ میں پڑے تھے

نوائے سازِ ہستی نالۂ پیہم سے پیدا ہے
ابھی تارِ نفس پر چل رہی ہیں اُنگلیاں میری

فشارِ قبر کا مارا ہوا ہوں اُٹھ نہیں سکتا
سنبھال اے حشر سب ٹوٹی ہوئی ہیں ہڈیاں میری

جنھیں ذوقِ شورِ وجود تھا وہ اسی ہوس میں فنا ہوئے
جو اُٹھے تو اُٹھکے کہیں نہ تھے یہ ہوا کہ بانگِ درا ہوئے

جو تھی اِدھر ہو تھی اُدھر تو کہاں ہیں سب مرے ہم نظر
دمِ جلوہ تم نے یہ کیا کیا وہ جو دیکھتے تھے وہ کیا ہوئے

ہاں آگ لگانے کے لئے میرے گھر آئے
قاصد وہ اسی واسطے آئے مگر آئے

تھی راہِ نہاں خانۂ دل بامِ نظر سے
وہ آنکھ بچا کر مرے گھر میں اتر آئے

عدو سے وعدہ کیا وعدہ کر کے ٹال گئے
چلو وہ اب بھی بہت بات کو سنبھال گئے

ملال کر گئے کہکر کہ اب نہ آئیں گے
وہ جاتے جاتے تڑپتے پہ ہاتھ ڈال گئے

ڈھونڈتی ہے اضطرابِ شوق کی دنیا مجھے
آپ نے محفل سے اٹھوا کر کہاں رکھا مجھے

اے نگاہِ مست اس کا نام ہے کیفِ سرور
آج تو نے دیکھکر میری طرف دیکھا مجھے

یار سے ہو کر جدا جورِ فلک کا غم نہیں،
ہو چکی وہ بات تھی جس بات کی پروا مجھے

ساتھ بھی چھوڑا تو کب جب سب برے دن کٹ گئے
زندگی تو نے کہاں آکر دیا دھوکا مجھے

ہچکیوں پر ہو رہا ہے زندگی کا راگ ختم
جھٹکے دیکر تار توڑے جا رہے ہیں ساز کے

نالۂ پیہم ہے اندازِ سکوتِ اہلِ درد
ہیں کہاں پہچاننے والے مری آواز کے

کیا ارادے ہیں وحشتِ دل کے
کس سے ملنا ہے خاک میں مل کے

اے دلِ شکوہ سنج کیا گزری
کس لئے ہونٹ رہ گئے سِل کے

مٹتے جاتے ہیں راہِ عمر میں دوست
مل رہے ہیں نشان منزل کے

چھوڑ ناطق فضائے بزمِ شکست
اٹھ کے ٹکڑے سنبھال لے دل کے

پریشاں خاطری تو اے دلِ اندوہ گیں نکلی
جگر کی پھانس تھی اچھا ہوا جانِ حزیں نکلی

بلا کی مردنی چھائی ہے بزمِ آفرینش پر
یہ کس کے منہ سے آئینِ فنا پر آفریں نکلی

پھر وہی ہم ہیں وہی شیشہ وہی پیمانہ ہے
توبہ کیا ہے رند کی اک لغزشِ مستانہ ہے،

کیا کروں بیکار کوشش مسکرانے کے لئے
کس کی لے آؤں ہنسی ہونٹوں تک آنے کے لئے

یہ رہی صورت کہ منہ تکتا رہا سامانِ عیش،
آشیاں تھا ہم نہیں تھے آشیانے کے لئے

ختم ہوتی ہے کہیں منزلِ آلام ابھی
پوچھتا کیا ہے چلا چل دلِ ناکام ابھی

ہم کو شیرینیٔ راحت کی تمنا یعنے
کم ہے کچھ تلخیٔ ذوقِ دہن و کام ابھی

یہ مدت ہستی کی آخر یوں بھی تو گزر ہی جائے گی
دو دن کے لئے میں کس سے کہوں آسان مری مشکل کر دے

کون آئے مرنے کو وہ ہماری بستی ہے
زندگی جہاں آکر موت کو ترستی ہے.

رازِ بیخودی ہے مے اہلِ ہوش کے لئے
مہت اس کو کیا جانیں کس گلی میں بستی ہے -

اب کہاں ہیں دن ناطق لطفِ چشمِ ساقی کے
اب کہاں ہے وہ دنیا مے جہاں برستی ہے

گئے ہیں جب سے وہ اپنے بھی آئے غیر بھی آئے
سب آئے بھی گئے بھی گھر کی ویرانی نہیں جاتی

نظر آتا ہے کیا میں کیا کہوں اشکالِ ہستی میں
کوئی دیکھی ہوئی صورت ہے پہچانی نہیں جاتی

برا سُنکر بھی ہم سے بُرا مانا نہیں جاتا
وہاں یہ ہے کہ اچھی بات بھی مانی نہیں جاتی

وہ گئے، ہمت گئی رخصت شکیبائی ہوئی
رفتہ رفتہ اپنی دُنیا ہی، گئی آئی ہوئی

اپنی رسوائی کا غم تھا جب ہمیں وہ دن گئے
اب تو یہ غم ہے کہ ایسی پھر نہ رسوائی ہوئی

جانتے ہیں یہ کہ پہچانا نہیں کوئی ہمیں،
یہ نہیں معلوم کس کس سے شناسائی ہوئی

کیا کہا میں اور تمنا عشرتِ گمگشتہ کی
وہ مری سو بار کی کھوئی ہوئی پائی ہوئی

آتا ہے میرے حال پہ اہلِ ہوس کو رشک
ان کو بھی آرزو ہے کہ رسوا کرے کوئی

میں زندگی کے کھیل کو سمجھا نہیں ہنوز
کچھ ہو رہا ہے جیسے تماشا کرے کوئی

اُن کا حریمِ ناز مرا پردۂ نگاہ،
چھپتے ہیں اس ادا سے کہ دیکھا کرے کوئی

مرے غم کی اُنھیں کس نے خبر کی
گئی کیوں گھر سے باہر بات گھر کی،

گئے تھے پوچھنے اپنا پتہ آج،
ہمیں اُس نے بتا دی راہ گھر کی،

بتاؤں کیا وہ دل لیتے ہیں کیونکر
ذرا سی اک صفائی ہے نظر کی

مشکل رہِ عدم کو ہم آساں نہ کر سکے
جلدی میں جلدئے کوئی ساماں نہ کر سکے

شرط اُن کی جستجو تھی نہ پایا نہیں سہی
یہ تو نہیں ہوا کہ ہم ارماں نہ کر سکے

کچھ ہم پہ اہلِ دیں نے عنایت تو کی ضرور
کافر بنا دیا جو مسلماں نہ کر سکے

رہ غربت میں اپنا زور پائے ناتواں تک ہے
مگر اس کا بھروسہ کیا ہے یہ بھی ہے جہاں تک ہے

میں بھی کوئی چیز تھا لیکن نہ پہچانا تجھے
بندہ پرور قدر ہی تمنے نہیں جانی مری

کھا رہا ہوں رنج اگلی صحبتوں کی یاد میں
ہے پُرانے دوستوں میں آج مہمانی مری

ناز تھا روز مسرت پہ کسے اے شبِ غم،
ہم نہ ہوتے تو کوئی اور پشیماں ہوتا

شدتِ درد ہی ہوتی کہیں غارتِ گرِ ہوش
بخت اتنا تو نہ برہم زنِ ساماں ہوتا

وہ آنکھ تو دل کو لینے تک بس دل کی ساتھی ہوتی ہے
پھر لیکر رکھنا کیا جانے دل لیتی ہے اور کھوتی ہے

یا دُنیا ہم پر ہنستی تھی یا ہم ہنستے ہیں دُنیا پر
جب ہم رو بیٹھے دنیا کو تو دُنیا ہم کو روتی ہے

کیا بیفکری کی نیند اس کو آئی ہے تیرے پہلو میں
اے مستِ خوابِ ناز کہاں ناطق کی قسمت سوتی ہے

ناطق لکھنوی

نام سعید احمد اور تخلص ناطق ہے۔ آپ سید محمد عبدالبصیر حضور زیدی واسطی بلگرامی کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کے جدِّ اعلیٰ نواب امیر الحسام مبلغ و مجدد بغداد سے ہندوستان آئے۔ اور بارہ بنکی کے ضلع میں قصبۂ دیوا آباد کیا۔ جناب ناطق صاحب کا سنہ ولادت ۱۸۷۸ء ہے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہوئے۔ ابتدا میں تصنیف و تالیف کو ذریعۂ معاش قرار دیا تھا۔ اب تیس برس سے طبابت کر رہے ہیں۔

ہر ذرہ کائنات ہے اک کائنات کا
موصوف کل صفات ہے ہر جز صفات کا

کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس جا درد ہے
میں سراپا دل ہوں دل میرا سراپا درد ہے

اپنا اپنا حال کہہ لینے دو ناطق سب کو تم
جانتا ہے وہ کہ کس کے دل میں کتنا درد ہے

جو نہ سنبھلا ابتدائے عشق میں
پھر وہ آخر تک سنبھل سکتا نہیں

رسا ہے خضرِ منزل کون اسکے آستاں تک ہے
وہیں تک مجھ کو پہونچا دے نظر میری جہاں تک ہے

کرم ہے اس کا جو عشق و ہوس پہلو بہ پہلو ہیں
یہ دُنیا ورنہ اُن کی اک نگاہِ امتحاں تک ہے

داغ افسردہ مرا سرمایہ دارِ نور تھا
بجھ گیا تھا دل مگر بھی چراغ طور تھا

اک فریب حسرتِ دیدار تھا جلوہ ترا
نور سمجھے تھے جسے وہ بھی حجاب نور تھا

کوئی نہ سُن سکا مرا قصہ زمانے میں
اتنا اثر بھی ہو نہ کسی کے فسانے میں

گزاری دیکھنے میں اسکی ساری زندگی میں نے
مگر یہ شوق ہے دیکھا نہیں گویا کبھی میں نے

محبت ایک مدت سے ہے یہ معلوم ہوتا ہے
تمھیں ہر چند پہلی بار دیکھا ہے ابھی میں نے

خیالِ دوستی میں محو تھا مجھکو معافی دے
نہ پہچانا جو تجھ کو اے نگاہِ دشمنی میں نے

میکشوں کی کمی بیشی پہ ناحق جوش ہے
یہ تو ساقی جانتا ہے کس کو کتنا ہوش ہے

کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

ابتدا سے آج تک ناطق یہی ہے سرگزشت
پہلے چپ تھا پھر ہوا دیوانہ اب بیہوش ہے

کئے جا یاد ساری عمر اس حلّال مشکل کی
کسی دن ایک ہچکی میں گرہ کھل جائے گی دل کی

مبارک تجھکو جلوہ اور چشم خوں فشاں مجھکو
ترا نظارہ کرلوں اس قدر فرصت کہاں مجھکو

ہر بزم میں وہ مجھکو تنہا نظر آتا ہے
دریا میں ہر اک قطرہ دریا نظر آتا ہے

وہ بے نقاب کہیں بے نقاب ہوتا ہے
کہ آفتاب خود اپنا حجاب ہوتا ہے

چھلک کے گر جو گئی مے مرے مقدر کی
ضرور لڑ گئی ساقی سے آنکھ ساغر کی

مجال کس کی جو دے ساتھ اسکی منزل تک
کہیں وہی نہ ہو صورت بدل کے رہبر کی

جو زندگی ہو تو کیوں امید ہی کیا ہے
امید بھی ہو تو امید زندگی کیا ہے

سب سے بہتر ہیں کہ میرا ذکر اس محفل میں ہے
مجھسے بہتر وہ کہ جس کی یاد اسکے دل میں ہے

مجھسے چھپ سکتی نہیں ہے آپ کی کوئی ادا
دل مرا آئینہ ہے اور آپ کی محفل میں ہے

جس سے پوچھو میزباں ہے جس کو دیکھو منتظم
پھر کہاں محفل اگر وہ فتنۂ گر محفل میں ہے

راز اگر کونین کے ظاہر ہوئے ناطق تو کیا
کاش وہ معلوم ہو جائے جو اسکے دل میں ہے

یہ دل نہیں، نور کا ہے شعلہ کسی سے اس کو مفر نہیں ہے
مثال برق شرر ہی لیکن مزاج برق و شرر نہیں ہے

حجاب ہے اک مشاہدہ بھی وہ روبرو ہے مگر نہیں ہے
نقاب ہے ایک اسکے رخ کی نظر ہماری نظر نہیں ہے

یا جدائی کے ہیں دن نزدیک یا مرنے کے دن
کہہ رہے ہے وہ کہ اب کوئی جفا باقی نہیں

ڈوبتا ہوں میں مدد میری کرے جو کوئی ہو،
مجھکو احساس خدا و ناخدا باقی نہیں

مری نظر ہی پہونچتی نہیں مرے دل تک
رسا نہیں ہے کوئی راہ تیری منزل تک

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

ان جفاؤں پر بھی دل کیا جانے کیوں گرویدہ ہے
عشق ہے اک راز جو عاشق سے بھی پوشیدہ ہے

گل پیرہن گریباں بلبل مرید نالہ
میری معاشرت کا شہرہ چمن چمن ہے

فرقت میں یہ تو پوچھو کیونکر ہے زندگانی
کچھ ضبط جوشش الفت کچھ ربط جان و تن ہے

ذوق فنا کا بھی کوئی حاصل نہیں رہا
مرتا ہوں میں کہ مرنے کے قابل نہیں رہا

چھپ کر ہوا کے جھونکوں میں آتی ہیں بجلیاں
ناطق چمن یہ رہنے کے قابل نہیں رہا

سر آنکھوں پر غم دنیا و عقبیٰ،
مگر اب دل میں گنجائش کہاں ہے

وہ نازک وقت آیا آخر کار
کہ ہر رنگ اب طبیعت پر گراں ہے

ہے بزم محبت میں دل کا عجب افسانہ　　جب شمع نہیں ہوتی جلتا ہے یہ پروانہ

آنکھوں کو بچائے تھے ہم اشک شکایت سے　　ساقی کے تبسم نے چھلکا دیا پیمانہ

دل شکن ثابت ہوا ہر آسرا میرے لئے　　کوئی دنیا میں نہیں میرے سوا میرے لئے

شاہراہ عام سے رسوائی منزل نہ کر　　کچھ نئی راہیں نکال اے رہنما میرے لئے

امتحاں دیکر بھی دے سکتا نہیں اُنکو فریب　　جانتے ہیں وہ کہ آساں ہے وفا میرے لئے

روح کا عقدہ اُلجھکر عقدۂ مشکل بنا　　پھر وہ عقدہ پیکرِ انسانیت میں دل بنا

عشق کی خاطر سے انساں عشق کے قابل بنا　　در دِ پہلے بن چکا تھا بعد اس کے دل بنا

دیر و حرم میں بحث یہ تھی دل کہاں رہے　　آخر کو طے ہوا کہ یہ بے خانماں رہے

سو تیر زمانے کے اک تیرِ نظر تیرا　　اب کیا کوئی سمجھے گا دل کس کا نشانہ ہے

یہ اثر آیا کہاں سے اک شکستہ ساز میں　　تیری ہی آواز ہے مظلوم کی آواز میں

تبسم ان کے لب پر ایک دن وقتِ عتاب آیا　　اسی دن سے ہماری زندگی میں انقلاب آیا

نہ تقریروں کی حاجت ہے نہ تحریروں کی زحمت ہو　　جہاں دل میں سوال آیا وہیں اس کا جواب آیا

چلو دیکھیں تو ناطق اپنی حد سے بڑھ نہ آیا ہو　　اُٹھا ہے شور کعبہ میں کہ اک خانہ خراب آیا

حسرتوں سے شاد ہے آباد ہے　　دل کی بربادی کی یہ بنیاد ہے

دفعتہً اُس کی نگاہِ التفات　　عشق میں سب سے بڑی آواز ہے

ہے وہی دیوانِ مطبوعہ مرا　　جس قدر لوگوں کو ناطق یاد ہے

وقت بیہوشی جب آجائے جبھی آلام ہے　　دل مسافر کا جہاں ڈوبے وہیں پر شام ہے

ہر رنگ کے جلوے کا ہے پرتو مرے دل میں　　آئینہ کسی شکل سے بیگانہ نہیں ہے

اس بزم میں یوں اہلِ غرض محوِ غرض ہیں　　پروانہ کو جیسے غمِ پروانہ نہیں ہے

ناطق سے چلو پوچھ لیں اسرارِ محبت　　فی الجملہ غنیمت ہے کہ دیوانہ نہیں ہے

نگاہیں باغباں کی بار بار اُٹھتی ہیں اس جانب　　گرے جاتے ہیں ایک ایک کرکے سب تنکے نشیمن سے

یہی شاید بجھا جاتا ہے شمع تربت ناطق　　وہ دیکھو منھ چھپائے جا رہا ہے کوئی دامن سے

کبھی دامانِ دل پر داغ مایوسی نہیں آیا　　اِدھر وعدہ کیا اس نے اُدھر دل کو یقیں آیا

محبت آشنا دل مذہب و ملت کو کیا جانے　　ہوئی روشن جہاں بھی شمع پروانا نہیں آیا

دو عالم سے گزر کے بھی دل عاشق ہے آوارہ　　ابھی تک یہ مسافر اپنی منزل پر نہیں آیا

مری جانب سے اُن کے دل میں کس شکوے پہ کینہ ہے
وہ شکوہ جو زباں پر کیا ابھی دل میں نہیں آیا

حیاتِ بیخودی کچھ ایسی نامحسوس تھی ناطق
اجل آئی تو مجھ کو اپنی ہستی کا یقیں آیا

نہ قابو میں ہے دل میرا نہ کہنے میں زباں میری
کوئی ہو رازداں میرا تو کہدے داستاں میری

شرار و برق و شمع و گل ہوں یا پروانہ و بلبل
جسے ہے یاد جتنی کہہ رہا ہے داستاں میری

مزے پر قصہ آیا تھا کہ نظمِ زندگی بگڑا
کہاں پر ختم کر دی بیوفا نے داستاں میری

ان کے لب پر ذکر آیا بے حجابانہ مرا
منزلِ تکمیل تک پہونچا اب افسانہ مرا

تجھ سے جو کی ہیں باتیں ہر بات میں اثر ہے
بیمار ہے جو تیرا اوروں کا چارہ گر ہے

دل میں ہے سرمایۂ کونین راحت کے سوا
دونوں عالم ہیں مرے قبضے میں قسمت کے سوا

عشاق میں غضب کی ناز آفریں ادا ہے
جو عشق کا ہے بندہ وہ حسن کا خدا ہے

آواز دلکش اس کی دل میں کچھ ہے ایسی
دھیمے سروں کا نغمہ ہر سانس کی صدا ہے

دل کے ٹکڑے جلوہ زار روئے جانانہ بنے
آئینہ جب ٹوٹ جائے آئینہ خانہ بنے

اپنے قطرے کو کبھی دریا ڈبو سکتا نہیں،
آپ سے جو مل چکا ہے اب وہ کھو سکتا نہیں،

ضبط کرنا چاہئے گو ضبط ہو سکتا نہیں،
آنکھ میں آنسو بھرے بیٹھا ہوں رو سکتا نہیں

محبت انسان کی ہے فطرت، کہاں ہو امکانِ ترکِ الفت
وہ اور بھی یاد آرہا ہے میں اس کو جتنا بھلا رہا ہوں،

زباں پہ لبیک ہر نفس میں زمیں پہ سجدہ ہے ہر قدم پر
چلا ہوں یوں بتکدہ کو ناطق کہ جیسے کعبہ کو جا رہا ہوں،

جوشِ گریہ اور اندھیری رات ہے
کیا گھٹا ہے کیا بھری برسات ہے

دیکھ کر ان کو نظر میں یہ اثر ہوتا ہے
جس طرف دیکھئے اک حسن نظر آتا ہے

دل ہے کس کا جس میں ارماں آپ کا رہتا نہیں
فرق اتنا ہے کہ سب کہتے ہیں میں کہتا نہیں،

سکون جب سے ہے خطرہ یہ دل کو ہر دم ہے
کہیں وہ پوچھ نہ بیٹھے کہ درد کیوں کم ہے

تمام بزم پہ اک بیخودی کا عالم ہے
حریم ناز کا ہم میں سے کوئی محرم ہے

یہ کون ہے متحرک کہ جس کی وجہ سے دل،
کسی کا نام نہیں اور ذکر پیہم ہے

دوبارہ دل میں کوئی انقلاب ہو نہ سکا
تمہاری پہلی نظر کا جواب ہو نہ سکا

کہاں دل اور کہاں دل کے مانگنے کی ادا
غرض سوال سے بہتر جواب ہو نہ سکا

اُس کی آنکھوں کا مرے دل میں اگر نور نہ ہو
غیرتِ حسن کو نظارہ بھی منظور نہ ہو

اک قیامت ہے عبارت آپ کے وعدہ کی بھی
دن گزرتے جائیں گے معنی بدلتے جائیں گے

موت بھی ناطق ہے اک افتاد اُٹھو آگے چلو،
رہروانِ عشق تو اکثر گرے اکثر اُٹھے

یوں کھلی ہے چشمِ معمور اُسکی خوابِ ناز سے
جس طرح جادو جگا کر کوئی جادوگر اُٹھے

ہم سخن اُس سے رہوں ناطق مرا مطلب یہ ہے
ورنہ کچھ معنی نہیں ہوتے میری تقریر کے

جو نہ سنبھلا ابتدائے عشق میں
پھر وہ آخر تک سنبھل سکتا نہیں

یہ بھی تھا ایک رُخ نگہِ لطفِ یار کا،
ارمان سوال کا دلِ سایل میں رہ گیا،

جواب صاف سنکر پا گیا سب کچھ فقیر اُن کا
صدا دینے سے مطلب تھا فقط آواز سُن لینا

ان کے تیور بھی نہ بگڑے بات بھی اپنی بنی
حال ہم کہتے رہے وہ داستاں سمجھا کئے

برق سے کیا ہم کو چشمک باغباں سے کیا خلش،
بات یہ ہے آشیاں کو آشیاں سمجھا کئے

ہر اشارہ میں ہے اک معنیِ بے لفظ نہاں
گفتگو کب تری محتاجِ صدا ہوتی ہے

اپنے فریبِ وعدہ کا اب خود علاج کر
آتی نہیں قضا ترے امیدوار کو

اسلام و کفر دونوں میں دیکھے گا ایک حُسن،
لا دل کی روشنی میں ذرا نور و نار کو

اک فریبِ حسرتِ دیدار تھا جلوہ ترا،
نور سمجھے تھے جسے وہ بھی حجابِ نور تھا

لوگ کہتے ہیں کہ دُنیا بھر سے ہے بیگانہ وہ
دیکھتا ہوں میں کہ بے رونق کوئی محفل نہیں

گرتا ہے کوئی آگ میں کیا کیجئے مگر
شبنم کو آفتاب کی قربت پسند ہے

اپنے ہی پیروں سے ہوا ہو جو پائمال
میں راہ میں وہ نقشِ قدم ہوں مٹا ہوا

نار کو نور کر دیا سرورِ کائنات نے
وہ جو لگی تھی طور پر آکے بجھی حجاز میں،

خوش و ناخوش مجھے جنت میں بسر کرنا ہے
اک ذرا رنگِ طبیعت کا بدلنا ہوگا

ساقی کا عکس کھینچا تھا پورا شراب میں
مجبور اپنے ظرف سے پیمانہ ہو گیا،

اُس نے رخصت آہ کی دی مضطرب دل دیکھکر
شمع کی لو کانپتی ہے رنگِ محفل دیکھکر

دیکھے اک امید نے دھوکا ڈبویا ہے ہمیں،
غرقِ دریا میں ہوئے ہم عکسِ ساحل دیکھکر

فغاں سے چھیڑ پہلو میں جو دل ہے
لئے پھرتا ہے سازِ بے صدا کیا

بزرگانِ سلف جب تک رہے رونق رہی ناطق
جب آخر ہو گئی محفل تو ہم پہونچے ہیں محفل میں

اک سنہری سطر تھی جس کی شعاعِ برقِ طور
آج وہ خط صاحبِ معراج کے نام آگیا

مزاج دانوں میں روح القدس بھی ہیں، ہم بھی
یہ دیکھنا ہے کہ کون انتخاب ہوتا ہے

دیکھئے سب سے تو باتیں بے تکلف کیجئے
آپ کا جو لفظ ہے وہ میرے دل کا راز ہے

میرے نالوں کی شکایت صاحبِ محفل سے کی
یہ اسی کی بزم کا چھیڑا ہوا اک ساز ہے

شاید قبول ہونے کا وقت آگیا قریب
طاقت جواب دینے لگی ہر سوال میں

کیا ہوا پہونچا خدا تک ان کا عاشق گر کوئی
ہر اسیر اپنے حدودِ قید میں آزاد ہے

عشق نے حسن کی طرف پھینک دیا تھا دل کا پھول
دستِ قضا سے آگرا دامنِ روزگار میں

غربت کی بیکسی پر کرلوں گا صبر یارب
واپس مگر نہ کرنا اس حال سے وطن میں

آزادیوں کا حق نہ ادا ہم سے ہو سکا
انجام یہ ہوا کہ گرفتار ہو گئے

اب دور ہوا ختم مری زیست کا شاید
آغاز میں تھا درد جہاں آج وہیں ہے

مرنے میں ہم اک روح نئی پھونک رہے ہیں
شاید کوئی نغمہ تری آواز سنا دے

ادب یہ روز حقیقت کا اسے مجاز رہے
کہ امتیاز نہ ہو پھر بھی امتیاز رہے

خلل پذیر ہوا سجدۂ محبت بھی
دماغ میں نہ رہا فرقِ ساجد و مسجود

نگاہ سوزِ محبت میں اب گناہ کہاں
نکل رہا ہے یہ آنکھوں سے شعلۂ بے دود

علیحدہ نہ کر الفاظ سے معانی کو
مجاز ہی میں حقیقت کا راز رہنے دے

پیشانیٔ خیال تعین سے صاف رکھ
پیدا نہ کر شکن نظرِ امتیاز کی

صیاد سے بھی اُنس رہائی کا شوق بھی
اک دل مرا قفس میں ہے اک آشیانے میں

میری جگہ نہیں کسی دل میں وہ ساز ہوں
محمود میرا کوئی نہیں اور ایاز ہوں

اوروں کو ہجر میں ہے سہارا امید کا
مشکل مرے لئے ہے کہ میں پاکباز ہوں

ناطق بغیرِ مے ہے مری زندگی حرام
خود اپنی میکشی پہ دلیلِ جواز ہوں

غرق کر دیتی ہے کشتی ناخدا کی بیخودی
چھوڑ دے وہ میکدہ ساقی جہاں مدہوش ہو

سفر میں سعی کامل ہو نکلے راہ منزل کی
کہ دریا کی روانی سے بنا پڑتی ہے ساحل کی

حقیقت آدمی کی کیا ملائک جان دیتے ہیں
جہاں ہو روح پر قبضہ وہاں پرستش رنگ لکی

چھپاؤں سب سے منھ کب تک بتا اپنا نشاں مجھکو
کہ تیری جستجو میں ڈھونڈتا ہے اک جہاں مجھکو

اگر یکساں ہو میرے ساتھ اس کا ظاہر و باطن
تو میں سمجھوں کہ گویا مل گئے دونوں جہاں مجھکو

گدائے میکدہ تھا اب ہوں میں شیخِ حرم ناطق
کہیں ایسا نہ ہو پہچان لے کوئی یہاں مجھکو

لہراتی ہے اک بجلی سینے کے حجابوں پر
جنبش میں حرم کا جب پردہ نظر آتا ہے

بڑھی نہ قطرے کی وسعت حباب سے آگے
مگر دکھا تو گیا اک جھلک سمندر کی

نوح ناروی

یکم شوال بروز جمعہ بوقت صبح صادق سنہ ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸؍ستمبر ۱۸۷۹ء اپنے ننہال بھوانی پور تحصیل سلون ضلع رائے بریلی اودھ - اپنے نانا شیخ علم الہدےٰ صاحب کے دولتکدہ پر پیدا ہوا - پہلے حافظ قدرت علی صاحب و مولوی یوسف علی صاحب ساکنان نارہ پھر حاجی عبدالرحمٰن صاحب جائسی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے۔ ان صاحبوں کے بعد میر نجف علی صاحب سے فارسی کی انتہائی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی کچھ دنوں تک نجی طور پر اپنے مکان واقعہ قصبہ نارہ ضلع الٰہ آباد ہی میں انگریزی بھی پڑھی - شعر و سخن کا شوق میر نجف علی صاحب کی صحبت میں پیدا ہوا، شروع میں اُنھیں سے اصلاح لیتا رہا اور پھر جناب امیر مینائی لکھنوی کو دو تین غزلیں دکھائیں پھر جناب جلالؔ لکھنوی سے پانچ چھ غزلوں میں مشورۂ سخن لیا اور آخر میں نواب فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی کا شاگرد ہو گیا - دو تین سال ہی گزرے تھے کہ حضرت داغؔ نے خود اپنے پاس دوبارہ بلالیا اور سنہ ۱۹۰۱ء میں حیدر آباد پہونچا اور یہاں حضرت داغؔ و جناب ظہیر دہلوی سے مہری و دستخطی سندیں حاصل کیں - حضرت داغؔ دہلوی کے انتقال کے بعد اُن کی جانشینی کے جھگڑے بہت دنوں تک چلتے رہے اور بطور خود اس کے مدعی بہت سے لوگ تھے، لیکن سائلؔ صاحب دہلوی نے خیال کیا کہ ایک ہی شخص پر یہ شرف کیوں محدود کیا جائے جتنے قابل قابل شاگرد ہیں وہ سب جانشینی کے مستحق ہیں لہٰذا سب سے پہلے مجھکو جانشینی کی سند عطا کی - میرے دو دیوان سفینۂ نوحؔ و طوفان نوحؔ چھپ چکے ہیں - تیسرا دیوان اعجاز نوحؔ مکمل ہو چکا ہے مگر ابھی طبع نہیں ہوا - میرے شاگردوں کی تعداد ..... سے کسی طرح کم نہ ہوگی اس میں چالیس پچاس اشخاص نہایت اچھے کہنے والے ہیں اور بجائے خود صاحب دیوان و صاحب تلامذہ ہیں - انتخاب کلام یہ ہے :-

نوحؔ ناروی

وفا و مہر کے بعد آپ کا مغرور ہو جانا — یہ ایسا ہے کہ جیسے پاس ہو کر دور ہو جانا
دکھائے پانچ عالم اک پیام شوق نے مجھکو — اُلجھنا روٹھنا لڑنا بگڑنا دور ہو جانا

رودادِ شوق و شرحِ محبت نہ پوچھیے — بس جان جائے مری حسرت نہ پوچھیے
کیوں کر بسر ہوئی شبِ فرقت نہ پوچھیے — سب مجھ سے پوچھیے یہ مصیبت نہ پوچھیے
کعبہ یہی ہے دیر یہی طور بھی یہی، — اس بے دلی سے دل کی حقیقت نہ پوچھیے

نکھر آئی نکھار آئی سنور آئی سنوار آئی
گلوں کی زندگی لے کر گلستاں میں بہار آئی

مشیت کو نہیں منظور دو دن پارسا رکھنا
اِدھر کی میں نے توبہ اور اُدھر فوراً بہار آئی

اسیرانِ قفس کو واسطہ کیا ان جھمیلوں سے
چمن میں کب خزاں آئی چمن میں کب بہار آئی

مجھے گلشن سے اے جوشِ جنوں صحرا کو اب لے چل
یہاں اس کے سوا کیا ہے خزاں آئی بہار آئی

ہمیشہ بادہ خواروں پر خدا کو مہرباں دیکھا
جہاں بیٹھے گھٹا اُٹھی جہاں پہونچے بہار آئی

آپ ہیں ہم ہیں مے ہے ساقی ہے
یہ بھی ایک امر اتفاقی ہے

ہو گئیں ختم ہجر کی گھڑیاں
اور تھوڑی سی رات باقی ہے

بے پئے نام تک نہیں لیتا،
مجھکو یہ احترامِ ساقی ہے

مرنا خیالِ حق میں معراجِ زندگی ہے
دار و رسن سے سنئے منصور کا فسانہ

دل ہے تو اُسی کا ہے جگر ہے تو اُسی کا
اپنے کو رہِ عشق میں برباد جو کر دے

ناکام مقاصد نہ رہیں اہلِ تمنا
تقدیر بھی تدبیر کو امداد اگر دے

میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو اس سے نفرت ہے
مگر اتنا سمجھ رکھو محبت پھر محبت ہے

اور تو ہم نے کچھ بھی نہ جانا لیکن اتنا جان گئے
دنیا میں نادان آئے نادان رہے نادان گئے

اللہ اللہ اُس کا جلوہ ہم جلوے کو مان گئے
دیکھیں تو کیا حال ہوا اپنا بے دیکھے قربان گئے

ہم اُن سے کیوں کہیں آزار دینا ملتوی کر دو
طبیعت رفتہ رفتہ خوگرِ غم ہوتی جاتی ہے

تیرِ نظر کے شوق میں دل بے قرار ہے
دیکھیں نہ دیکھیں اب یہ انھیں اختیار ہے

کیا کام اُس کو پُرسشِ جرم و قصور سے
کچھ اور خیر رحمتِ پروردگار ہے

کم بخت کبھی جی سے گزرنے نہیں دیتی
جینے کی تمنا مجھے مرنے نہیں دیتی

ہر صدائے عشق میں اک راز ہے
نالۂ دل غیب کی آواز ہے

کچھ نہ کہنا بھی کسی کے سامنے
اک طرح کا انکشافِ راز ہے

عشق نے دل کو پکارا اس طرح
میں یہ سمجھا آپ کی آواز ہے

اُن سے مل کر میں انھیں میں کھو گیا
اور جو کچھ ہے وہ آگے راز ہے

حُسن کے جلووں کو اپنے دل میں دیکھ
لن ترانی دور کی آواز ہے

وسعتِ تنظیمِ قدرت دیکھنا
ایک دل میں دو جہاں کا راز ہے

میں غم کا فسانہ کس سے کہوں غمخواروں سے گھر خالی ہو
کون آنے جانے والا ہے سانس آنے جانی والی ہے

نہ حسرت جوشِ وحشت کی نہ فصلِ گل کا ارماں ہے — جو خود ہی چاک ہو جاتا ہے وہ میرا گریباں ہے
یہ فرضی رکھ لئے دو نام دستورِ محبت نے — حقیقت میں مرا دل ہے نہ ارماں ہے نہ پیکاں ہے

کیوں رندی و مستی میں لہرائے نہ میخانہ — بہتا ہوا دریا ہے چلتا ہوا پیمانہ
رنگینیِ عالم کی ہر عکس یہ تصویریں — سو گل ہیں مگر عالم ہر گل کا جدا گانہ
قبروں کے مناظر نے کروٹ نہ کبھی بدلی — اندر وہی آبادی باہر وہی ویرانہ

رہِ طلب میں بنے وہ نشترِ ادھر سے جاتے اُدھر سے آتے — چبھے جو کانٹے قدم قدم پر ادھر سے جاتے اُدھر سے آتے
کہیں نہ تھک کر رُکے کوئی دم طوافِ بزمِ حبیب میں ہم — چلے ہیں دیر و حرم بھی اکثر ادھر سے جاتے اُدھر سے آتے

بہکانے والے بہکائیں شوق سے اکثر ہم کو تم کو — آنا جانا ملنا جلنا چھپ کر کھل کر ہم کو تم کو
پھر گردوں پر بدلی چھائی بدلی میں بجلی لہرائی — پیتے جائیں دیتا جائے ساقی ساغر ہم کو تم کو
کتنے دنوں تک بزم آرائی آپس میں پھر ہوگی جدائی — ایک جگہ رہنے ہی نہ دے گا چرخِ ستمگر ہم کو تم کو

دلِ مضطر کو اظہارِ وفا کی یہ نئی سوجھی، — فغاں کرتا ہے پہلے پھر تمہارا نام لیتا ہے

وہ نادم ہوئے قتل کرنے کے بعد — ملی زندگی مجھکو مرنے کے بعد
رہا زندہ در گور مرنے سے قبل — خدا! جانے کیا ہوگا مرنے کے بعد
ترے عشق کا خاتمہ ہو گیا، — مرے کون اب میرے مرنے کے بعد

اب اور اس سے سوا حالِ زار کیا ہوگا — وہ مجھ کو دیکھنے آئے مگر نہ دیکھ سکے،
وہ برق کیا جو دوبارہ نہ طور پر چمکی، — وہ حسن کیا جسے ہم دیکھ کر نہ دیکھ سکے

حسن کے ناز جدا عشق کے انداز جدا — ہے یہ مشکل مری دنیا تری دنیا ہو جائے
دینے والے نے فقط دل کو یہ قدرت دی ہو — ابھی گلشن ابھی صحرا ابھی دریا ہو جائے
عشق میں ضبطِ غمِ عشق کی خوبی ہے یہی، — دم بخود میں رہوں لیکن کوئی رسوا ہو جائے

محفلِ عالم کی رونق میں کمی ممکن نہیں، — چل بسے میخوار لیکن دور چلتے ہی رہے
وادیِ اُلفت میں دیکھی ہم نے کب منزل کی شکل — گر پڑے گر کر اُٹھے اُٹھ کر سنبھلتے ہی رہے

جہاں میں اک نہ اک مرنے کی نئی کہانی ہے اور ہم ہیں — ابھی تمنا ہے اور دل ہے ابھی جوانی ہے اور ہم ہیں
غرورِ تیغِ بجرمِ ستم نہ کیوں ہوں یہ جاں فشانی ہے اور ہم ہیں — کہ آپ ہیں آپ کی چھری ہے چھری کا پانی ہے اور ہم ہیں،

شکوۂ غم مجھے روا بھی نہیں — اور پھر حلم آپ کا بھی نہیں
ہم بڑی دیر سے یہ دیکھتے ہیں — اس طرف کوئی دیکھتا بھی نہیں

وحشت کلکتوی

میں ۱۸؍ نومبر سنہ ۱۸۸۱ء میں متولد ہوا۔ شہر کلکتہ میرا مولد و مسکن ہے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں میرا دیوان شایع ہوا جس میں کچھ فارسی کلام بھی شامل ہے۔ مولانا حالی علامہ شبلی حضرت ظہیر دہلوی (شاگرد ذوق) اور دیگر اکابر عصر نے اس کی بہت تحسین کی۔ بقول مولانا حالی اس حقیر نے تتبع غالب کا حق ادا کیا۔

میں اسلامیہ کالج کلکتہ میں اُردو کا پروفیسر تھا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں سرکار سے خطاب خان بہادر عطا ہوا۔ فی الحال پنشن پاتا ہوں

انتخاب اشعار یہ ہے:-

وحشت

خود نما جلوہ ترا، ذوقِ طلب ناز ترا
کون ہے تیرے سوا پردہ درِ راز ترا

ہمارے پاؤں میں تو تم نے زنجیرِ وفا ڈالی
تمہارے ہاتھ سے کیوں رشتۂ مہر و کرم چھوٹا

تغافل تو ادا ہے، پُر خطر ہے التفات اُس کا
مصیبت آئے گی اُس وقت جب وہ مہرباں ہوگا

ابھی تو تیری مایوسی سے اطمیناں ہے اے دل
مجھے اُس وقت ہوگا خوف جب تو شادماں ہوگا

تہِ مرقد قرار آئے گا کیونکر مرنے والوں کو
جو تم کو دوستوں کا غم نصیبِ دشمناں ہوگا

پھر نوازش آپ کی حد سے زیادہ ہو گئی
پھر دلِ آفت رسیدہ بدگماں ہونے لگا

پھر ہوا میرے لئے شوق آفریں اُس کا شباب
پھر مرا دل عہدِ پیری میں جواں ہونے لگا

ہوئی جو چشمِ ہوس کامیاب نظارہ
کرم ہے یہ بھی ترے شوقِ خود نمائی کا

جو مجھکو ڈر ہے تو یہ ڈر ہے طیِ منزل میں
شکستہ دل نہ کرے غم شکستہ پائی کا

بہارِ گلشنِ اُمید کا مآل نہ پوچھ
وہ خواب رونقِ گلدستۂ خیال ہوا

جہانِ شوق میں کیا کیا رہا ہے شور انگیز
فسونِ عشق کہ افسانۂ جمال ہوا

گئے وہ دن کہ حصہ تھا ترا تیرِ نظر میرا
ابھی تک اُس خلش کو یاد کرتا ہے جگر میرا

مجھے اب طعنۂ افسردگی دیتا ہے تو اے دل
کبھی طوفان تھا میں بھی، زمانہ یاد کر میرا

وہ سنگِ در کو اپنے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں
خدا لائے کہاں ہے وحشتِ شوریدہ سر میرا،

ہر چند اُس نے رسمِ تغافل کو راہ دی
شوقِ جنوں مزاج نہ واقف ذرا ہوا

عبرت کی داستاں ہوں بس اے ہمنشیں نہ پوچھ
انجامِ کار و بارِ تمنا کا کیا ہوا

گو حیا نے جنبشِ لب کی نہ دی رخصت انھیں
میں شہیدِ طرزِ پرسشہائے پنہاں ہو گیا

میں تیری بزم سے کچھ نامراد بھی نہ پھرا
بقدرِ شوق اگر بامراد آ نہ سکا،

کسی سے کہتی ہے چتون کسی کی
کہ تو کیا اور تیرا مدعا کیا.

معاذ اللہ اتنی ناامیدی
کبھی کی وہ نگاہِ آشنا کیا

مجالِ ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی
خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

نشانِ منزلِ جاناں ملے ملے نہ ملے
مزے کی چیز ہے یہ ذوقِ جستجو میرا

موافقت کی توقع ہے مجھ کو عالم سے
نہیں ہے دہر میں میرے سوا عدو میرا

تغافل تو قیامت ہے ترے ایذا پسندوں کو
جفا کرتا اگر تو واقفِ رسمِ وفا ہوتا

نجانے ناز کرتی کس قدر بلبل گلستاں پر
اگر اک پھول بھی شرمندۂ بوئے وفا ہوتا

بارہا بے التفاتی دیکھ کر صیاد کی
خود بخود بیتاب ہو کر میں تہِ دام آ گیا

گو کہ میں بیٹھا تھا وحشت بزم میں بیگانہ وار
اُس نگاہِ آشنا کا مجھ کو پیغام آ گیا

مانعِ فریاد ہے کچھ طبع کی افسردگی
کچھ سکوت آموز ہے پاسِ ادب صیاد کا

نرگسِ مستانہ میں کیفیتِ جامِ شراب
قامتِ رعنا پہ عالم مصرعۂ اُستاد کا

اُس نگاہِ شرمگیں نے کر دیا رسوا ہمیں
ہائے وہ افسوں کہ جو آخر کو افسانہ ہوا

ہے نظر بازوں میں ہلچل، سب ہیں گرمِ جستجو،
وہ پری ہے کون، وحشت جس کا دیوانہ ہوا

وہ آنسو باوجودِ ضبط جو نکلے، قیامت تھے
غمِ طولانیِ دل کو بشکلِ مختصر دیکھا

دلِ آشفتہ کو گم گشتۂ کوئے وفا پایا
سرِ شوریدہ کو منت گزارِ سنگِ در دیکھا

اندیشۂ سود و زیاں زنجیرِ پائے شوق ہے
کچھ جذبۂ دل کی بھی سُن، اے عقل خودداری نہ کر

ایمان اگر جاتا رہا اُس بُت کی وحشت کیا خطا
ہم بھی خدا لگتی کہیں تو بھی طرفداری نہ کر

خود بخود آ ہی گیا کچھ شیوۂ عرضِ نیاز
اُس سراپا ناز کو اپنے مقابل دیکھ کر

بیخبر منزل سے ہیں وہ سالکانِ راہِ عشق
جو قدم رکھتے ہیں راہِ رسمِ منزل دیکھ کر

گویا ہے کوئی اور بھی ہامن زمانے میں!
مایوس ہو کے اُٹھتے ہیں اُس آستاں سے ہم

تیور ترے کچھ اور خبر دیتے ہیں ہمیں،
گھبرا رہے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

اک یادِ عیش جس پہ ہو قرباں ہزار عیش
لیکر چلے ہیں ساتھ تری انجمن سے ہم

کیا رنگ انتقامِ خزاں کا ہو دیکھئے
ڈرنے لگے ہیں جوشِ بہارِ چمن سے ہم

ہمارے آگے سے وہ جب کبھی گزرتے ہیں
ہم اپنے کھوئے ہوئے دل کو یاد کرتے ہیں

یہ کیا ہجومِ تمنا ہے، خیر ہو یا رب
ہم اُن سے ڈرتے نہیں، اپنے دل سے ڈرتے ہیں

دل کے کہنے پہ چلوں عقل کا کہنا نہ کروں
میں اسی سوچ میں ہوں کیا کروں اور کیا نہ کروں

کس طرح حُسنِ زباں کی ہو ترقی وحشت
میں اگر خدمتِ اُردوئے معلیٰ نہ کروں

جو حق پوچھو، کتابِ آرزو کا حرفِ باطل ہوں
مٹا دیں کیوں نہ وہ مجھکو، مٹا دینے کے قابل ہوں

خفا تم جرمِ اُلفت پر، خجل میں جرمِ اُلفت سے
نہ تم ملنے پر آمادہ نہ میں ملنے کے قابل ہوں،

ملتفت وہ نہیں ہوتا جو مرے دل کی طرف
دلربائی کی اسے خاص ادا کہتے ہیں،

سادہ دل کتنے ہیں اربابِ محبت ہے ہے
کہ ترے عشوۂ پنہاں کو حیا کہتے ہیں

وہی غواص ہیں جو ڈوبکر اُبھرے نہ دریا سے
نہیں ہے عشق میں اُن کی سند جو پار اُترتے ہیں

ضرورت تم کو کیا مجھ سے تکلف کی، تواضع کی
یہی انداز وہ ہیں جو مجھے مایوس کرتے ہیں

بنایا میں نے دلکش اور بھی نقشِ محبت کو
وفا کا رنگ بھر کر اُس کی تصویرِ خیالی میں

اِس دلنشیں ادا کا مطلب کبھی نہ سمجھے
جب ہم نے کچھ کہا ہے وہ مسکرا دئے ہیں

کچھ شوخ کر دیا ہے چھیڑوں سے ہم نے تم کو
کچھ حوصلے ہمارے تم نے بڑھا دئے ہیں

جھوم رہا ہوں بیٹھ کر وادیِ کوہسار میں
جاؤں چمن کی سیر کو، ہوش کہاں بہار میں

ہوگئی زندگی عذاب کیسی کشاکش آ پڑی
شوقِ سبک خرام ہیں عقلِ گراں وقار میں

کبھی جو دیکھتے تھے خواب ہم جمعیتِ دل کے
وہ اب نذرِ خیالاتِ پریشاں ہوتے جاتے ہیں

جنوں انگیزیاں بڑھتی چلی ہیں اُس کے گیسو کی
بہت سے ہاتھ اب صرفِ گریباں ہوتے جاتے ہیں

نشانِ زندگیِ دل ہے بیقراریِ دل
ہے دل کی موت اگر چین آگیا دل کو

فریب کھاتا ہے ہر ہر قدم پہ منزل کا
وہ کیا کرے کہ نہ دیکھا ہو جس نے منزل کو

بزمِ اغیار میں معذور نہ تھے وہ وحشت
بات اگر کر نہیں سکتے تھے، اشارا کرتے!

تابکے شکلِ مجازی میں تری جلوہ گری
اُس حقیقت کو جو پوشیدہ ہے عریاں کردے

اک حد ضرور ہوتی ہے صبر و قرار کی
اب نوبت آئی نالۂ بے اختیار کی،

آنکھوں نے تیری ہوش اڑائے شراب کے — چہرے نے تیرے بات بگاڑی بہار کی

آپ اپنا روئے زیبا دیکھئے — یا مجھے محوِ تماشا دیکھئے
حسرتوں کا ہائے رے دل میں ہجوم — آرزوؤں کا نتیجہ دیکھئے

مرہم کا ذکر کس نے عداوت سے کر دیا — یہ کیا نئی خلش مرے زخم کہن میں ہے
ہیں اہلِ انجمن کی جو بے التفاتیاں — خلوت کا لطف مجھکو تری انجمن میں ہے
اور ہوں گے وہ نکالیں گے جو دل کی آرزو — وہ تمنا جان ہے میری جو میرے دل میں ہے
جس سے چاہو پوچھ لو تم میرے سوزِ دل کا حال — شمع بھی محفل میں ہے پروانہ بھی محفل میں ہے

یقینِ نامرادی پر بھی حالت ہے وہی دل کی — تمھیں سے چاہتا ہوں داد اپنی سعیِ باطل کی

چشم کو میں نے بہر سو نگراں دیکھا ہے — نہیں معلوم ترا جلوہ کہاں دیکھا ہے
شرم ہے ایک ادا ورنہ تری آنکھوں میں — ہم نے اک میکدۂ شوق نہاں دیکھا ہے

عجب نعمت ہے سوزِ عشق بھی جس کو میسر ہو — نہ جل سکتا ہو جو دل وہ جلا دینے کے قابل ہے

فقط بیگانہ خوئی ہی نہیں ہے شانِ محبوبی — کتابِ آشنائی دیکھ اٹھا کر طاقِ نسیاں سے

کوئے جاناں کے لئے میں ہی نہیں ہوں مضطرب — کوئے جاناں بھی ہے آتش زیرپا میرے لئے
اب خفا ہونے لگے ہو مجھ سے ہر ہر بات میں — تم کہ ہو جاتے تھے دشمن سے خفا میرے لئے

دونوں نے کیا ہے مجھ کو رسوا — کچھ درد نے اور کچھ دوا نے
بیجا ہے تری جفا کا شکوہ — مارا مجھکو مری وفا نے

کیوں میرے فایدے کو بدلے نظامِ قدرت — پروا ہو دشتِ غم کو کیا اک شکستہ پا کی
ارمان کا نتیجہ حرماں نہ ہو الٰہی — حسرت ہے آشنا کو دیدارِ آشنا کی

ہے یہ اندیشہ کہیں دل کو نہ ہو جائے خبر — آنکھ دیکھی ہے تری اور دلستاں بدلی ہوئی

خزاں کا شکوہ کریں کیا کہ ہم بہار میں بھی — ہلاکِ جلوۂ رنگینیٔ بہار رہے
اُس انجمن میں کہ بہتی ہو بیخودی کی شراب — وہ ہوشیار نہیں ہے جو ہوشیار رہے

گئے وہ دن جبکہ اس چمن میں ہوائے نشو و نما تھی ہم کو — خزاں کو دیکھا نہیں ہے ہم نے خواہشِ رنگ و بو کریں گے؟

وطن میں آنکھ چُراتے ہیں ہم سے اہلِ وطن، — تڑپتے رہتے تھے غربت میں ہم وطن کے لئے!

نیازِ عشق اپنی حد کو پہونچا وائے ناکامی — ابھی نیرنگیاں باقی ہیں نازِ فتنہ پرور کی
سرِ بالیں ذرا آجاؤ تم بیمارِ ہجراں کے — کہ اک ہچکی میں؛ وہ کہدے، کہانی زندگی بھر کی

نگاہ ناز تیری میرے حق میں اک معما ہے
سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے کیا ارشاد ہوتا ہے

عجب حسرت فزا ہوتی ہیں وہ شبہائے تنہائی
کہ میں ہوتا ہوں اور میرا دلِ ناشاد ہوتا ہے

قفس میں عمر گزری نالہ و آہ و فغاں کرتے
ہم آخر کس توقع پر خیالِ آشیاں کرتے

پتا ملتا نہیں جنسِ وفا کا اب زمانے میں
کہیں سے ہاتھ اگر لگتی تو نذرِ دوستاں کرتے

مزا آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ
کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے

نہ پروا کی ہماری کارواں نے جب تو پھر ہم بھی
بچھڑ کر کارواں سے کیا تلاشِ کارواں کرتے

دمِ عشرت مجھے اندیشۂ انجام ہوتا ہے
مرا دل کانپتا ہے دور میں جب جام ہوتا ہے

رہی یک چند نقشِ آرزو کی دل میں رنگینی
وہ اک بیکار سی تحریر تھی، میں نے مٹا ڈالی،

تری بیگانہ خوئی پردہ دارِ رازِ الفت تھی
کیا وحشت کو رسوا جب نگاہ آشنا ڈالی

ہنسا ہوں حال پر اپنے جہاں رونے کا موقع تھا
کیا ہے تشکر کے پردے میں قسمت کا گلا میں نے

حریفِ غفلتِ ہستی نہیں تحریکِ بیداری
نہ اُٹھنا تھا نہ اُٹھا گو سُنی بانگِ درا میں نے

ہے ہدایت کے لئے موجود خود تیرا ضمیر
گوشِ دل سے سُن حقیقت کی یہی آواز ہے

کس طرح وحشت کروں عرضِ نیازِ بندگی
بے نیازِ سجدہ اُس کا آستانِ ناز ہے

گو میں ہوں تجھ سے دور تری آرزو تو ہے
تیرا پتا ملے نہ ملے جستجو تو ہے

وہ آئیں یا نہ آئیں اُنھیں اختیار ہے
اے ذوقِ انتظار میں خوش ہوں کہ تو تو ہے

پروانے کی ہے موت پہ اے شمع مجھکو رشک
تیرا شہیدِ ناز ترے روبرو تو ہے

اُنھیں علم ہو چکا ہے مری طاقت و تواں کا
وہ کریں گے خاک پروا مرے نالہ و فغاں کی

سرِ شاخ آشیاں بھی مجھے خوف تھا قفس کا
نہ ہوئی نصیب دل کو کبھی راحت آشیاں کی

مرے گریۂ الم پر نہ بہائے جائیں آنسو،
کہیں تم ہنسی نہ کرنا مری چشمِ خونفشاں کی

مجھے ہمنوا نہ دینا کہیں زحمتِ تکلم
کہی جائے گی قفس میں نہ حکایت آشیاں کی

ہو رسائی کیا وہاں تک بس اک آسرا یہی ہے
کہ اُنھیں کو یاد آئے کبھی اپنے ناتواں کی

مجھے اب شگفتگی کی ہو قفس میں کیا توقع
گئی ساتھ آشیاں کے جو تھی بات آشیاں کی

چین آئے گا کہاں دل کو خدا ہی جانے
دشت سے بھی وہی وحشت ہے جو تھی گھر سے مجھے

ساقیِ بزم ہے کہتی ہے ہماری توبہ
کہ تو ٹکرا دے چھلکتے ہوئے ساغر سے مجھے

یگانہ چنگیزی

میرزا واجد حسین یگانہ چنگیزی ابن میرزا پیارے صاحب ابن میرزا آغا جان ابن میرزا احمد علی ابن میرزا حسن بیگ چغتائی۔ یہ سلسلۂ نسب چنگیز خاں تک پہونچتا ہے۔ میرے ننھیالی بزرگ جس کا سلسلہ نواب میرزا آغا جان تک پہونچتا ہے، لکھنؤ سے عظیم آباد چلے گئے اور مرشد آباد سے بھی ان کے تعلقات تھے۔

میری ولادت کی ٹھیک تاریخ تو معلوم نہیں مگر اتنا معلوم ہے کہ سنہ ۱۳۰۱ھ ذی الحجہ کی آخری تاریخوں میں سے کوئی تاریخ تھی۔ عظیم آباد کا محلہ مغلپورہ میرا مولد ہے .... میری ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید صاحب حسرت عظیم آبادی کے مدرسہ میں ہوئی۔ اُس کے بعد عظیم آباد کے محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخل ہوا۔ اول سے آخر تک وظیفے، تمغے اور انعام پاتا رہا۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا۔ میرے مذاقِ سخن کی اصلاح سب سے پہلے حضرت اُستاذی مولوی سید علی خاں صاحب بیتاب عظیم آبادی نے کی اور بعد ازاں اپنے اُستاد خان بہادر مولانا سید علی محمد صاحب شاد کے سپرد کر دیا جن کی ذاتِ گرامی سے خاکسار کو بہت کچھ فیض پہونچا ہے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں میں نے کلکتہ اور مٹیا برج کا سفر کیا جہاں پرنس میرزا محمد مقیم بہادر (سلطانِ عالم حضرت میرزا محمد واجد علی شاہ بہادر کے نواسے) کے مرشد زادوں یعنی محمد یعقوب علی میرزا اور محمد یوسف علی میرزا کا کچھ دنوں معلم رہا۔ مگر مٹیا برج کی آب و ہوا نے صحت پر بہت خراب اثر کیا۔ کچھ دنوں علیل رہکر عظیم آباد واپس آیا یہاں بھی صحت درست نہ ہوئی۔ آخر کار لکھنؤ پہونچا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۹۰۵ء کا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اور رنگا رنگ دلچسپیوں نے مجھ پر کچھ ایسا اثر کیا کہ یہیں کا ہو رہا۔ وقتاً فوقتاً عظیم آباد جا کر اور جایداد کا کچھ حصہ فروخت کرکے لکھنؤ میں بے فکری سے بسر کرتا رہا۔ حسنِ اتفاق سے ایک سال میرے مکرم و محترم نواب نبا صاحب موج عظیم آبادی اپنے علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے اور انھیں کی وساطت سے لکھنؤ کے اک معزز متوسط گھرانے میں میری شادی ہوئی۔ یہ واقعہ سنہ ۱۹۱۳ء کا ہے۔ میرے خسر جناب حکیم میرزا محمد شفیع صاحب اور نواب نبا صاحب موج سے دیرینہ مراسم تھے۔ کتنے شایستہ کتنے پاکیزہ مزاج لوگ تھے خدا جنت نصیب کرے۔

خاکسار میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی۔ سب جج لارڈ (سرکارِ نظام)

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

پیامِ زیرِ لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا،
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا
گناہِ زندہ دلی کہئے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لئے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا!
سمجھتے کیا تھے۔ مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا!
بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا!

جنھیں ذوقِ حضوری خواب و بیداری میں حاصل تھا
خداوندا وہ آنکھیں کون سی تھیں کون سا دل تھا؟
تماشا گاہِ حیرت میں کہاں کا تو کہاں کا میں
بس اتنا تھا کہ آئینے سے آئینہ مقابل تھا!
نگاہِ شوق کی دُنیا خدا جانے کہاں تک ہے
جہاں دیکھا وہی حُسنِ یگانہ۔ شمعِ محفل تھا!

قصہ کتابِ عمر کا کیا مختصر ہوا؟
رُخ داستانِ غم کا اِدھر سے اُدھر ہوا!
ماتم سرائے دہر میں کس کس کو روئیے
اے وائے۔ دردِ دل نہ ہوا دردِ سر ہوا

ادب نے دل کے تقاضے اُٹھائے ہیں کیا کیا
ہوس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا کیا!
اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور؟،
اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا!
پیامِ مرگ سے کیا کم ہے مژدۂ ناگاہ؟،
اسیر چونکتے ہی تلملائے ہیں کیا کیا!
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا!
بلند ہو تو کھُلے تجھ پہ زور پستی کا،
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا!
خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے
وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا!
خدا ہی جانے یگانہؔ میں کون ہوں کیا ہوں؟
خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا!

سب ترے سوا کافر۔ آخر اس کا مطلب کیا؟
سر پھرا دے انساں کا ایسا خبطِ مذہب کیا؟
روح پھونک دیتی ہے ایک جنبشِ لب کیا
دیکھئے دکھاتا ہے وعدۂ مذبذب کیا؟
ہو رہے گا سجدہ بھی جب کسی کی یاد آئی
یاد جانے کب آئے؟ زندہ دارئِ شب کیا؟
آندھیاں رُکیں کیونکر۔ زلزلے تھمیں کیونکر
کارگاہِ فطرت میں پاسبانئِ رب کیا؟

تو کیا ہمیں ہیں گنہگار، حُسنِ یار نہیں؟
لگاوٹوں کا گنا ہوں میں کیا شمار نہیں؟
بدل نہ جائے زمانے کے ساتھ نیت بھی
سنا تو ہوگا جوانی کا اعتبار نہیں؟
کرے گا پرورشِ نخلِ آرزو کے دن
وہ بدنصیب جسے ذوقِ انتظار نہیں!

حاصلِ فکرِ نارسا کیا ہے؟
تو خدا بن گیا بُرا کیا ہے؟
کیسے کیسے خدا بنا ڈالے؟
کھیل بندے کا ہے خدا کیا ہے؟

نہ سُنا ہوگا راگ فطرت کا
جانتے ہو مری صدا کیا ہے؟

دیدۂ دل سے دیکھ اپنی طرف
چشمِ حیراں تجھے ہوا کیا ہے؟

اپنے ہی عکس پر ہو چیں بہ جبیں؟
کیوں یگانہ یہ ماجرا کیا ہے؟

مستانہ رقص کیجئے گردابِ حال میں
بیڑا ہے پار۔ ڈوب کر اپنے خیال میں

ترسی ہوئی نگاہوں پہ اب رحم کیجئے
کب تک یہ امتیاز۔ حرام و حلال میں

ہاں کیوں نہ پار اُتر چلوں خمیازہ جھیل کر
ڈوبے مری بلا۔ عرقِ انفعال میں

کیا زندگی کے بعد بھی ہے کوئی زندگی؟
پھر جان آچلی چمنِ پائمال میں!

آوازِ بازگشت پہ کیا دیتے ہو صدا
کس سے اُلجھ رہے ہو جواب و سوال میں

واللہ قفس میں آتے ہی کیا مت پلٹ گئی!
آخر ہمیں تو ہیں کہ پھڑکتے تھے جال میں

کیا بزم اتحاد ہے کیا حُسنِ اتفاق
بیگانہ و یگانہ ہیں سب ایک حال میں

ہنوز زندگیِ تلخ کا مزہ نہ ملا،
کمال صبر ملا۔ صبر آزما نہ ملا،

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں تھی
مزاج اُس دلِ بے اختیار کا نہ ملا،

امیدوار رہائی قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیقِ غائبانہ ملا

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

بس ایک نقطۂ فرضی کا نام ہے کعبہ
کسی کو مرکزِ تحقیق کا پتا نہ ملا،

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم؟ گھر کا راستا نہ ملا!

خوشا نصیب جسے فیضِ عشق شور انگیز
بقدرِ ظرف ملا۔ ظرف سے سوا نہ ملا

سمجھ میں آگیا جب عذرِ فطرتِ مجبور
گناہگارِ ازل کو نیا بہانہ ملا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے؟
وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

نگاہِ یاس سے ثابت ہے سعیِ لاحاصل
خدا کا ذکر تو کیا بندۂ خدا نہ ملا

پیمانہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی؟
دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر

کیوں انقلابِ عشق یہ کیسی ہوا چلی،
جی سن سے ہوگیا رخِ بیمار دیکھ کر

غیرت سے رنگِ نامۂ اعمال اُڑ نہ جائے
کیفیتِ نگاہِ گنہگار دیکھ کر،

آئینہ رکھ کے آپ بھی سجدے میں جھک گئے
اب کیا کہیں بگے کا فردِ دیندار دیکھ کر

گردن ہی اپنی جب کسی قابل نہ ہوگی یاس،
پھر کیا بڑھے گا دل رسن و دار دیکھ کر

خزاں کے دور میں دل کی لگی بجھتی تو کیا بجھتی ؟
پیامِ غفلتِ جاوید ہے جلوہ حقیقت کا
اُٹھو اے سونے والو سر پہ دھوپ آئی قیامت کی
ارے او جلنے والے کاش جلنا ہی تجھے آتا

قفس میں بوئے مستانہ بھی آئی دردِ سر ہو کر
نگاہِ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے
کہاں پر نارسائی کی ہے پروانوں کی قسمت ہے
عدو کیا زہر دیتا ہے ہم ایسے تلخ کاموں کو
دیارِ بیخودی میں امتیازِ روز و شب معلوم
نگاہِ یاس کا عالم جو آگے تھا سو اب بھی ہے

نقشِ باطل ہو چلا خوابِ پریشانِ بہار
چشمِ پر خون نے مجسم کر دیا موہوم کو
اپنا ہاتھ اپنا گریباں اپنا سودا اپنا سر
کیوں قفس پر دوش پھرتے ہیں اسیرانِ ہوس
اے خزاں، پروردہ دل فکرِ چمن سے باز آ
قافلے کا قافلہ یارا ہوائے دہر نے
اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے حال میں
دیکھ لیتا ہوں چمن کو دور سے بیگانہ وار

بہارِ زندگی ناداں بہارِ جاوداں کیوں ہو
کوئی ناگفتنی مطلب ہے ان نیچی نگاہوں کا
گنہگارِ محبت کو اسی عالم میں رہنے دے
زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں
یہ ناہموار ہی ہموار ہو جائے تو کیا کم ہے
کہاں خواب و خیال اتنے۔ حقائق ہر طرف جتنے
یگانہؔ فکرِ حاصل کیا ؟ تم اپنا حق ادا کر دو

ہمیں خود آشیاں سے اُڑ گئے ہوتے دھواں ہو کر
سما جائے نہ آنکھوں میں کہیں خوابِ گراں ہو کر
کہیں یہ دن نہ ڈھل جائے نصیبِ دشمناں ہو کر
یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جائے دھواں ہو کر

نویدِ ناگہاں پہونچی ہے مرگِ منتظر ہو کر
مُبادا رنگ و بو اُڑ جائے پامالِ نظر ہو کر
پڑے ہیں منزلِ فانوس پر بے بال و پر ہو کر
لہو کا گھونٹ اُتر جاتا ہے جب شمشیر و شکر ہو کر
بلا آئی ہے بدمستوں پہ شامِ بے سحر ہو کر
ہزاروں گل کھلے بازیچۂ شام و سحر ہو کر

دیدۂ حیران میں کھپکر آ گئی جانِ بہار
ورنہ بے تعبیر تھا خوابِ پریشانِ بہار
استخارہ کر چکے پابندِ فرمانِ بہار
ننگِ یارانِ چمن، ناخواندہ مہمانِ بہار !
اپنے اوپر رحم کر اے، دشمنِ جانِ بہار
رہ گئے سوتے کے سوتے سب حسینانِ بہار
کوئی حیرانِ خزاں کوئی پشیمانِ بہار
یاس مجھ سے کیوں کھٹکتا ہے نگہبانِ بہار؟

یہ دنیا ہے تو ہر کروٹ وہی آرامِ جاں کیوں ہو
زباں تک آ نہیں سکتا تو آنکھوں سے بیاں کیوں ہو
سزا واجب سہی لیکن بہشتِ جاوداں کیوں ہو
کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو
زمیں سے جب نہیں فرصت تو فکرِ آسماں کیوں ہو
نگاہِ نارسا یہ نقدِ فطرت رایگاں کیوں ہو
بلا سے تلخ گزرے زندگانی رایگاں کیوں ہو

آزاد انصاری

الطاف احمد مشہور نام، نظیر حسین تاریخی نام، ابوالاحسان کنیت، آزاد تخلص، والد کا اسم گرامی محمد حسن خلف امیر احمد، نسلاً شیخ انصاری جس کا سلسلہ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے، والدۂ ماجدہ کا پدری سلسلۂ نسب بھی انصاری ہی ہے مگر مادری سلسلہ صدیقی ہے۔ سالِ ولادت ۲۷ رجب سنہ ۱۲۸۹ھ، مقام ولادت ناگپور جہاں والد ماجد اس وقت اوورسیری کے عہدے پر فایز تھے۔

ہم نے اٹھارہ اُنیس سال کی عمر تک مختلف درس گاہوں میں فارسی و عربی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد ہماری شادی ہوگئی اور تعلیم چھوٹ گئی۔ لیکن کچھ مدت بعد مولانا حکیم نورالدین صاحب سہارنپوری اور ڈاکٹر احمد خاں صاحب لکھنوی اور ان کے علاوہ دیگر اساتذہ فن سے تعلیم حاصل کی اور مولوی حکیم معین الدین صاحب نانوتوی سے جو ہماری والدہ کے ماموں زاد بھائی ہوتے تھے سند طبی حاصل کرنے کے بعد سنہ ۱۹۰۰ء میں دہرہ دون میں جاکر مطب کھولا اور پھر سنہ ۱۹۰۲ء سے سنہ ۱۹۰۹ء تک کانپور میں یہی مشغلہ جاری رکھا، یہاں ہماری اہلیہ کا انتقال ہوگیا اور سہارنپور چلے آئے، ایک سال بعد جب یہ صدمہ کم ہوا تو ہم نے انبالہ چھاؤنی (پنجاب) میں جاکر مطب جاری کیا اور قریباً آٹھ سال تک وہاں علاج و معالجہ کا کام کرتے رہے، سنہ ۱۹۱۹ء میں ہم علی گڈھ آگئے، وہاں ہمارا ڈیڑھ سال تک قیام رہا۔ مگر جب وہاں ہم نے اپنا کاروبار مطب چلتے نہ دیکھا تو ہم دہلی چلے آئے اور اواخر سنہ ۱۹۲۳ء تک دہلی میں رہ کر بسر اوقات کرتے رہے، اس کے بعد ۲ اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء کو حیدرآباد دکن پہونچ گئے اور کاروبار مطب چھوڑ کر عینک کی تجارت اختیار کرلی جس پر آج تک گزر اوقات ہے۔ مجھے مولانا حالی مرحوم سے تلمذ حاصل ہے۔

آزاد انصاری

اچانک نزولِ بلا ہوگیا | یکایک ترا سامنا ہوگیا
طبیعت ہی درد آشنا ہوگئی | دوا کا نہ کرنا دوا ہوگیا

سی بھی تلافی اسوقت تک بہت تھی | بھیر کوششیں کروگے اور فایدہ نہ ہوگا،
یوں یاد آؤگے ہمیں اصلاً خبر نہ تھی | یوں بھول جاؤگے، ہمیں وہم وگماں نہ تھا۔
آہ کس نے مجھے دُنیا سے مٹانا چاہا | آہ ! اُس ہنے کہ جسے حاصل دُنیا جانا

ظاہر ہے کہ بے کس ہوں، ثابت ہے کہ بے بس ہوں   جو ظلم کیا ہوگا، برداشت کیا ہوگا،
بیدل بھی ہوں، شاداں بھی، شاکی بھی ہوں، نازاں بھی   جو داغ دیا ہوگا، دلچسپ دیا ہوگا،

اک دن گلۂ غفلت سننے کو ترسیئے گا   اک دن المِ فرقت کچھ دیکے سلا دے گا
امید سکوں رخصت، تسکین دروں رخصت   اب درد کی باری ہے، اب درد مزا دے گا

تم اور دل آزاریٔ اربابِ محبت   اربابِ محبت کا یہ شیوہ نہیں ہوتا
اک وہ ہیں کہ بے خوف و خطا گرم شکایات   اک ہم ہیں کہ اظہارِ تمنا نہیں ہوتا

وہ اک حیرت فزا ساعت، وہ اک بالکل نئی حالت   وہ اک جلوہ نظر آنا، وہ اک عالم گزر جانا

تم اور چارۂ غمِ فرقت، خوشا نصیب!   دکھ کو دوا نصیب، مرض کو شفا نصیب

زلفوں والو! یہ اندھیر   دُہرے دُہرے کالے ناگ

شاد کر، ہم غمزدوں کو شاد کر   یاد کر حق ہائے خدمت یاد کر

طالب ہوں مگر ناکام، سائل ہوں مگر محروم   تقدیر مری تقدیر، مقسوم مرا مقسوم
قسمت سے وہ ملزم ہوں، شامت سے وہ مجرم ہوں   جو داد سے بھی محروم، بیداد سے بھی محروم
غمخوار یہ کہتے ہیں، "ارمانِ غم آساں ہے"   آثار یہ کہتے ہیں، "خیریت جاں معلوم"

خیالِ نگاہِ محبت عبث   کہ تابِ نگاہِ محبت کہاں

جو اُٹھے ہیں تو گرمِ جستجوئے دوست اُٹھے ہیں،   جو بیٹھے ہیں تو محوِ آرزوئے یار بیٹھے ہیں

وہ دل جس میں تمنا کی خوشی تھی،   اُسے صرفِ تمنا دیکھتا ہوں

کبھی دن رات رنگیں صحبتیں تھیں   اب آنکھیں ہیں، لہو ہے اور میں ہوں

نزاکت ہے کہ قرباں ہے تری ترکیبِ اعضا پر   قیامت ہے کہ پنہاں ہے ترے بے ساختہ پن میں

ترا گلشن وہ گلشن جس پہ جنت کی فضا صدقے   مرا خرمن وہ خرمن جس پر انگارے برستے ہیں

اگر کارِ الفت کو مشکل سمجھ لوں،   تو کیا ترکِ الفت میں آسانیاں ہیں

سزائیں تو ہر حال میں لازمی تھیں   خطائیں نہ کرکے پشیمانیاں ہیں

آؤ، پھر عہدِ وصال، یار کی باتیں کریں   داستانِ لطف چھیڑیں، پیار کی باتیں کریں

ارمانِ التفاتِ دلِ دوستاں درست   شایانِ التفات دلِ دوستاں کہاں

اب آنکھوں کے آگے وہ جلوے کہاں   اب آنکھیں اُٹھانے سے کیا فائدہ

الٰہی! کامیابی رہنما ہو،   کوئی امیدوارانہ چلا ہے

اب فریبِ مہربانی رائگاں ۔۔۔ زندگی بھر کو نصیحت ہوگئی

جب ہمیں بزم میں آنے کی اجازت نہ رہی ۔۔۔ پھر یہ کیوں پرسشِ حالات ہو، یہ بھی نہ سہی

تو اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے ۔۔۔ امید تو نہیں ہے، مگر ہاں خدا کرے

میں اور انحراف، مگر بدنصیب دل ۔۔۔ میرا کہا کرے، نہ تمھارا کہا کرے

اب حالِ دل نہ پوچھ کہ تابِ بیاں کہاں ۔۔۔ اب مہرباں نہ ہو کہ ضرورت نہیں رہی

اک پائمالِ جور سے امیدِ شکرِ جور ۔۔۔ جا شکر کر کہ تاب شکایت نہیں رہی

میں تو اظہارِ درد کرتا ہوں ۔۔۔ کوئی دردآشنا نہیں، نہ سہی

ترکِ حاجت بھی ممکنات سے ہے ۔۔۔ کوئی حاجت روا نہیں، نہ سہی

ترا بارِ گرانِ مہربانی کون اُٹھا سکتا، ۔۔۔ ترا نامہرباں ہونا کمالِ مہربانی ہے

ستم شعار! ستا لیکن اس قدر نہ ستا ۔۔۔ کہ شکر شکلِ شکایات اختیار کرے

خدا کے واسطے آ اور اس سے پہلے آ ۔۔۔ کہ یاس چارۂ تکلیفِ انتظار کرے

ہائے وہ راحت کہ جب تک دل کہیں آیا نہ تھا ۔۔۔ ہائے وہ ساعت کہ جب تم سے شناسائی ہوئی

حیف اے اظہارِ حرفِ شوق کے اقدام حیف ۔۔۔ وہ نظر جھیپی ہوئی، وہ آنکھ شرمائی ہوئی

مرے شوق سزا کا خوفناک آغاز تو دیکھو ۔۔۔ کسی کا جرم ہو، اپنی خطا معلوم ہوتی ہے

سمجھتا ہوں کہ تم بیداد گر ہو ۔۔۔ مگر پھر داد لینی ہے تمھیں سے

فسوں گر! میں تجھے پہچانتا ہوں ۔۔۔ وہیں سے بات کرنا بس وہیں سے

اک گدائے راہ کو ناحق نہ چھیڑ، ۔۔۔ جا، فقیروں سے مذاق اچھا نہیں

کرم ہیں اور طلب سے بھی زیادہ ۔۔۔ ستم ہے اور بہ اندازِ دگر ہے

تیرا عدیل کوئی تیرے سوا نہ ہوگا ۔۔۔ تجھ سا کہاں سے لاؤں، تجھ سا ہوا نہ ہوگا

منزل کی جستجو سے پہلے کسے خبر تھی ۔۔۔ رستوں کے پیچ ہوں گے اور رہنما نہ ہوگا

اک روز دلِ رہزن خود راہ نما ہوگا ۔۔۔ اک روز یہی دشمن منزل کا پتا دے گا

کس نے تا منزل رفاقت کی طلب کے شوق نے ۔۔۔ کون رہبر ہوگیا، اللہ رہبر ہوگیا

یہ مانا ہم نے تم کو ایک حد تک خاص کر جانا ۔۔۔ مگر کیا جس قدر ارمانِ دل تھا، اُس قدر جانا

تمھارا ماننا طاقت سے باہر تھا، مگر مانا ۔۔۔ تمھارا جاننا امکاں سے خارج تھا، مگر جانا

حق بنا، باطل بنا، ناقص بنا، کامل بنا ۔۔۔ جو بنا نا ہو، بنا لیکن کسی قابل بنا

زباں تک شکوۂ محرومئ دیدار آنا تھا
خطاب آیا کہ "جا اور طاقتِ دیدار پیدا کر"

غمِ فانی خوشی عطا کر دی
اے غمِ دوست! تیری عمر دراز

اُٹھو، درد کی جستجو کر کے دیکھیں
تلاشِ سکونِ طبیعت کہاں تک

دیدار کی طلب کے طریقوں سے بے خبر!
دیدار کی طلب ہے تو پہلے نگاہ مانگ

جو چاہتا ہے، چاہ۔ مگر قاعدے کے ساتھ
جو مانگنا ہے، مانگ۔ مگر راہ راہ مانگ

نشانِ راہ ہاتھ آیا تو کس سے، صرف اُلفت سے
کمالِ رہبری پایا تو کس میں، صرف رہزن میں

نجاتیں کس کے قبضے کی، تری قدرت کے قبضے کی
پناہیں کس کے دامن میں، تری رحمت کے دامن میں

آؤ، پھر موقع ہے، کچھ اسرار کی باتیں کریں
صورتِ منصور بہکیں، دار کی باتیں کریں

بیانِ رازِ دل کی خواہشیں اور وہ بھی ممبر پر
خبر بھی ہے، یہ باتیں دار پر کہنے کی باتیں ہیں

کوئی دونوں جہاں سے ہاتھ اُٹھا بیٹھا تو کیا پروا،
تم اِن مولوں بھی سستے ہو، تم ان داموں بھی ارزاں ہو

نازِ خودداری غلط ثابت ہوا
عادتِ تسلیم ڈالی جائے گی

دل اور ترے خیال سے راحت نہ پا سکے
شاید مرے نصیب میں راحت نہیں رہی

اسے بھی خوش نظر آیا، اُسے بھی خوش نظر آیا
ترے غم میں بہ حالِ شادماں کر دی بسر میں نے

طلبِ عاشقِ صادق میں اثر ہوتا ہے
گو ذرا دیر میں ہوتا ہے، مگر ہوتا ہے

مناسب ہو تو اب پردہ اُٹھا کر
ہمارا شک بدل ڈالو یقیں سے

تدبیر کیا ہے، آپ کی جانب سے حکم کار
تقدیر کیا ہے، آپ کا منشا کہیں جسے

یا درد کے احساس کو لذت بھی عطا کر
یا درد کے احساس سے بیگانہ بنا دے

بے خبر! کارِ خبر مشکل نہیں
بے خبر ہو جا، خبر ہو جائے گی

جو وہ ملتا نہیں ہے، آپ کھو جا
کہ اک یہ بھی طریقِ جستجو ہے

ترے ہوتے مری ہستی کا کیا ذکر
یہی کہنا بجا ہے، میں نہیں ہوں

ترے جلووں میں کھو جاتا مگر آہ!
جہاں تو جلوہ زا ہے، میں نہیں ہوں

اگر حد سے گزریں تو بے شک حرام
جو تھوڑی سی پی لی تو کیا ہو گیا،

آج وہ دن ہے کہ اک ساقی کے دستِ خاص سے
پی اور اتنی پی کہ میں حقدار کوثر ہو گیا،

عشقِ اصنام بھی ہے، دعوئے اسلام بھی ہے
تم کو آزاد! عجب مرشدِ کامل دیکھا،

نہ آزاد مَیکش، نہ شاہد پرست
وہ کم بخت بدنام ہے اور بس

اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں جچتا
توجا اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

کبھی شاہد و مے کا بھی حق ادا کر
لگاتار کفرانِ نعمت کہاں تک

یارائے زہد و تاب ورع کچھ طلب نہ کر
توفیق ہو تو صرف مجال گناہ مانگ

آزادگی و مے خواری آزاد کا حصہ تھی،
جب پی تو یہ کہکر پی "النادر کالمعدوم"

جو اہلِ حرم درپئے دشمنی ہیں
تو پروا نہیں، آستاں اور بھی ہیں

حضرت آزاد! آپ اور اتقا
کاش! ظاہر ہو کہ یہ کیا راز ہے

غیر ممکن ہے کہ اس بزم میں آزاد نہ ہو
کہ فقیروں کی توجہ میں اثر ہوتا ہے

یہ کیف بارشوں کے، یہ مستی سحاب کی
توفیق ہو تو نہر بہا دوں شراب کی

وہ دن گئے کہ معتکفِ خانقاہ تھے
اب ہم ہیں اور سنگِ درِ مے فروش ہے

کوئی آخر تلخ کامِ زندگی کب تک جئے
آج سے شغلِ مئے و شاہد روا رکھتا ہوں میں.

تم سے نظامِ دو جہاں، تم سے قیامِ دو جہاں
مرجعِ ہر دیار ہو - مرکزِ ہر مدار ہو،

ستم ہے، یوں سکونِ دل کے مٹنے کا ستم دیکھیں
تمھارے دردِ کا ردِّ عمل ہو اور ہم دیکھیں

ازل سے ربطِ حُسن و عشق ہے اور جاودانی ہے
نہ تیرا حُسن حادث ہے، نہ میرا عشق فانی ہے

عالم ترے وجود سے تکمیل پا گیا،
آیندہ ارتقا کی ضرورت نہیں رہی

ہمیشہ غم نصیب آزاد نے تیری خوشی چاہی
ہمیشہ راحتِ دُنیا کو ممنوعہ شجر جانا

کبھی عالم کی ہستی اصل پر مبنی سمجھتا ہوں
کبھی بالکل نمودِ سیمیا معلوم ہوتی ہے

افسوس! بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

اعتبارات سے بالا ہو جا
اعتبارات میں کیا رکھا ہے

آ، مگر اس قدر قریب نہ آ
کہ تماشا محال ہو جائے

بنایا، کھیل دیکھے، توڑ پھینکا،
یہ کیا اندازِ تخلیق جہاں ہے

جب رُخِ مقصد سے اک پردہ اُٹھا
اور لاتعداد پردے پڑ گئے

کبھی جس شوق کا وقتِ عمل تھا
اب اُس کی ساعتِ ردِّ عمل ہے

انسان کی بدبختی اندازے سے باہر ہے
کمبخت خدا ہو کر بندہ نظر آتا ہے

بندہ پرور! میں وہ بندہ ہوں کہ بہرِ بندگی
جس کے آگے سر جھکا دوں گا، خدا ہو جائے گا

افسر میرٹھی

میرا نام حامد اللہ اور تخلص افسر ہے۔ میرا وطن میرٹھ ہے اور سنہ پیدایش ۱۸۹۶ء۔ ابتدائی تعلیم حضرت مولانا مولوی احمد علی صاحب محدث کی نگرانی میں ہوئی اس کے بعد ایک مدت تک عربی فارسی کی تعلیم حضرت موصوف ہی کی نگرانی میں مدرسہ عالیہ عربیہ میرٹھ میں ہوتی رہی، پھر انگریزی زبان حاصل کی اور میرٹھ کالج سے بی' اے پاس کیا۔ شعر و شاعری کا شوق ابتدا سے تھا لیکن اس کو کسی پر ظاہر نہ کرتا تھا۔ سب سے پہلے بعض ہم جماعتوں کے اصرار سے ۱۹۱۶ء میں میرٹھ کے ایک مشاعرے میں شرکت کی اور جو غزل وہاں سُنائی وہ بہت مشہور ہوئی، لیکن اس کے بعد ایک مدت تک کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔ شعر گوئی کا شغل برابر جاری رہا طرح پر شعر کہنے سے ہمیشہ اُلجھن ہوتی تھی، غزل کہنے کا طرز ہمیشہ یہ رہا کسی واقعہ سے متاثر ہو کر ایک شعر کہا پھر اسی زمین میں اور شعر کہکر غزل پوری کرلی۔

حامد اللہ افسر

بھٹکتی ہیں نظریں مری ہر طرف
خدا جانے کس بھیس میں تو ملے

یہ جی چاہتا ہے مرا آج افسر،
ابھی اور تم سے کئے جاؤں باتیں

ایسی خلوت بھی کچھ نہیں افسر
کہیں آنے کے ہو نہ جانے کے

ہائے وہ جس کی امیدیں ہوں خزاں پر موقوف
شاخِ گل سوکھ کے گر جائے تو کاشانہ بنے

نہ شکوہ سنج مرا جوشِ سعی ہو کیونکر
محال ہی تو نہیں ہے محال ہونا بھی

بڑھا کے ریش تو مسجد کو گیا چلا افسر
یہ شکل اب کہیں ہوتی نہیں نمازی کی

رکھکر نظر کے سامنے تصویر خوابِ ناز
پہروں ترے خیال میں بیٹھا رہا ہوں میں

دل پر اپنا بس چلتا تو وحشت کا ہے کو ہوتی
اور کسی سے کیا مطلب ہے تو خود کیا کہتا ہوگا

کون بھلا روتا پھرتا ہے آدھی آدھی راتوں کو
اس بادل کے پردے میں بھی کوئی دل والا ہوگا،

جو غم حد سے زیادہ ہو خوشی نزدیک ہوتی ہے
چمکتے ہیں ستارے رات جب تاریک ہوتی ہے

وہ دولت جس کا دنیا نے مسرت نام رکھا ہے
ترے جلادوں کی داماں نظر میں بھیک ہوتی ہے

بزم میں ان مدبھری آنکھوں کو گردش دے اگر اس کا اندازہ تو کرے کس کو کتنا ہوش ہے
یہ نظر کی جنبشیں یہ چال اٹھلائی ہوئی کچھ تمھیں بھی آج اپنی بیخودی کا ہوش ہے

دکھا دے گے ہیں سب یہ دُنیا کے میلے بھری بزم میں ہم رہے ہیں اکیلے
انوکھے خیالوں کی محفل جمائے ہیں پڑے رہتے ہیں گھر میں افسر اکیلے

کچھ توجہ خاص ہوتی ہے عیاں نام لے لے کر نہ کوسا کیجیے
مصلحت کا ہے تقاضا احتیاط دل یہ کہتا ہے کہ دیکھا کیجیے

ہو قرب اور پھر وہی دلبستگی رہے ہیں اصل میں یہی تو محبت کے ولولے
واں اُن کو یہ گمان کہ دامن بھی تر نہیں یاں حال یہ کہ آگیا پانی گلے گلے

ہر خزاں کے غبار میں ہم نے کاروانِ بہار دیکھا ہے
کتنے پشمینہ پوش جسموں میں روح کو تار تار دیکھا ہے

اللہ رے جنوں کی یہ ذرہ نوازیاں بیٹھا ہوا ہوں دل میں بیاباں لیے ہوئے
زمانہ ڈھونڈتا ہے مجھ کو افسر خدا جانے کہاں کھویا گیا میں

کچھ قطعِ منازل کی نہیں فکر سفر میں ہر گام پہ منزل ہے تری راہ گزر میں
للہ یہ تم دیکھنے والوں سے نہ پوچھو کیا چیز ہو تم دیکھنے والوں کی نظر میں

میں تو نام کا مالی ہوں پھولوں کا رکھوالا ہوں، جس نے بیل اُگائی ہے خود پروان چڑھائے گا
افسر میرے کانوں میں کوئی یہ کیا کہتا ہے وہ سرکار ہماری ہے بے مانگے جو پائے گا

محوِ تلاشِ راحت تو یہ بھی جانتا ہے کہتے ہیں جس کو راحت وہ غم کی انتہا ہے

مذاہب کیا ہیں؟ راہیں مختلف ہیں ایک منزل کی، ہے منزل کیا؟ جہاں سب کچھ ہے پر راہیں نہیں ہوتیں

اُن کی پرواز انھیں تا بہ فلک لے پہونچی ہم یہی سوچ رہے ہیں کہ خیال اچھا ہے

اُف رے یہ ذوقِ عبادت کی عجائب کاریاں دل کہیں ہے میں کہیں سجدہ کہیں ہے سر کہیں،

موت ہے وہ راز جو آخر کھُلے گا ایک دن زندگی ہے وہ معما کوئی جس کا حل نہیں

کس نظر سے آشیاں کو آسماں دیکھا کیا اور تو اے چارہ سازِ بے کساں دیکھا کیا،
میں نے یوں دل کی کہانی کا اثر قایم رکھا ہر گھڑی تھم تھم کے رنگِ داستاں دیکھا کیا

تاروں کا گو شمار میں آنا محال ہے لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے
دُنیا میں اک سکوں کا ذریعہ ہو جب یہی انسان تجھ سے لو نہ لگائے تو کیا کرے

موت کے خواب کی تعبیر ہے تجدیدِ حیات
یعنی اول سے سنائیں گے پھر افسانے کو

مل جائے جو تجھ سے جا کر ایسا کس کا مقدر ہو
دریا میں جو قطرہ ہو وہ دریا ہے یا گوہر ہے

عمل کی جن میں قوت ہے انھیں ملتی ہیں تاثیریں
نمایاں ہو حیاتِ نو اگر ذروں کے دل چیریں

خدا توفیق دیتا ہے جنھیں وہ یہ سمجھتے ہیں
کہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں

تو بیچ میں رہ جائے تو یہ تیری خطا ہے
جنت جسے کہتے ہیں اُدھر بھی ہے اِدھر بھی

نہ سمجھا جب حقیقت کو کسی نے
خدا پیدا کیا ہر آدمی نے

تجھ کو پالینے میں یہ بیتاب کیفیت کہاں
زندگی وہ ہے جو تیری جستجو میں کٹ گئی،

نیچی غمِ رخصت سے وہ معصوم نظر ہو
اور مجھکو کہیں دور کا در پیش سفر ہو

فسانہ خواں تری آنکھیں قصور وار نہیں
میں جانتا ہوں خطا ہے مرے فسانے کی

قریب ہے مری منزل قریب ہے شاید
کہ اب نہیں رہی ہمت قدم اُٹھانے کی

ہائے انجام تجسس کی عجائب کاریاں
تم ملے اور ڈھونڈنے والے تمہارے کھو گئے

وہ آ رہے ہیں ستاروں کو نیند کے جھونکے
اثر کسی پہ تو ہوتا مرے فسانے کا

جہان بھر میں ہیں تنکے کہاں کہاں سے جنوں
صبا نے کر دیا کیا حال آشیانے کا

ہم جس کو موت سمجھتے ہیں پیغام حیات جدید ہے وہ
یہ پھول چمن میں جتنے ہیں پھر کھلنے کو مرجھاتے ہیں،

دو شخص جب ایسے ملتے ہیں آپس میں جن کو محبت ہو
خاموشی طاری ہوتی ہے لب کھُل کر رہ جاتے ہیں

جب خوشی کا خیال آتا ہے
دل مایوس کانپ جاتا ہے

مجھے فردا کی فکر کیونکر ہو
غمِ امروز کھائے جاتا ہے

سکھ میں ہوتا ہے حافظہ بیکار
دُکھ میں اللہ یاد آتا ہے

نظر کے سامنے آ جنگلوں میں بولنے والے
کوئی دھیمی رسیلی ہلکی آوازوں سے کیا سمجھے

رسیلا راگ چھیڑا آم کے باغوں میں کوئل نے
نہ ہو جب کوئی دل والا تو اس کا درد کیا سمجھے

پھر وحشیوں کو شوق ہوا کوہسار کا
شاید اسی کو کہتے ہیں موسم بہار کا

تیری بھی اے ابرِ نیساں ہر صورت دلکش ہوتی ہے
جب جانِ بہار ہے قطرہ ہے جب زیب تاج ہے موتی ہے

چمکتی ہے یہ بجلی ابر میں یا،
کسی سے کچھ اشارے ہو رہے ہیں

للہ یہ بتا دے اے جذبۂ محبت
کیا حسن ہے خدا میں کیا عیب آدمی میں

بادلوں کی سرزمیں پر نغمہ ہائے جانفزا،
مرغ خوش پرواز آزادی اسی کا نام ہے

اُردو کا رنگِ تغزل

دُنیا کی مختلف زبانوں میں سب سے پہلا شعر یا مصرعہ کب موزوں ہوا، اسے کوئی نہیں جانتا، اور شعر کیا، خود الفاظ کی پیدائش کا بھی صحیح علم کسی کو نہیں۔ آفرینشِ عالم کے کروروں سال بعد جب زمین پر انسان نمودار ہوا تو اس کے نشو و نما کے چند مخصوص خطے تھے۔ غالباً انھیں خطوں میں دو تین مختلف زبانوں کی بنیاد پڑی ہوگی اور انھیں دو تین بولیوں سے آج دُنیا کی ہزار دں بولیاں بن گئی ہیں

کسی چیز کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کا ذکر سنتے ہی سراپا توجہ بن جائیں اور اُس سے مانوس ہونے کے بعد بھی کبھی کبھی اس کے تصور سے چونک اُٹھیں۔ افلاطون کا قول ہے کہ فلسفہ یا عرفان، حیرت سے شروع ہوتا ہے، لیکن شاید وہ ختم بھی حیرت ہی پر ہوتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی زبان سے اس قدر مانوس ہیں کہ اس کی پیدائش یا نشو و نما کی کہانی بھول جاتے ہیں اور ہم میں سے اکثر وہ کہانی جانتے ہی نہیں۔ اُردو زبان، اُردو نثر، اُردو نظم کی کہانی بار بار کہی جا چکی ہے اور کہی جائے گی لیکن آج ایک سرسری گفتگو اُردو تغزل پر بھی سُن لیجئے

اُردو کی پہلی غزل، ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ کب کہی گئی، اس کا صحیح علم نہیں، لیکن اگر اس کو صحیح مان لیا جائے کہ اُردو تغزل فارسی تغزل کی نقل ہے تو شاید ہم ایک ناقص سا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُردو تغزل کی ابتدا کب سے ہوئی لیکن میرے نزدیک یہ خیال ہی قابلِ قبول نہیں کہ اُردو غزل گوئی، فارسی تغزل کی نقل ہے۔ یہ کہکر گویا ہم یہ مراد لیتے ہیں کہ اُردو غزل گوئی میں خود اپنی کوئی چیز نہیں ہے، درانحالیکہ فارسی تغزل میں خود مقامی رنگ اس قدر کم ہے کہ تقلید کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ اس کے جواب میں شاید گل و بلبل، شراب و ساقی، شیریں فرہاد، مقتل و خنجر، کعبہ و بت خانہ، منزل و کارواں صحرا و گلستان، جنون و گریباں وغیرہ کو پیش کریں گے، لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ "مقامیت" سے وسیع تر چیزیں ہیں اور ان کو صرف اسلامی یا ایرانی نہیں کہا جا سکتا۔ فارسی تغزل میں ان باتوں کا ذکر محدود یا مادی معنے میں بہت کم آیا ہے بلکہ ان کا استعمال عموماً تمثیلی حیثیت سے ہوا ہے، کیونکہ یہ الفاظ ہر زمانہ ہر مقام اور ہر تہذیب و تمدن میں انسانی زندگی کے داخلی پہلو کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے اُردو غزلوں میں یہ الفاظ شاید دس پندرہ فی صدی سے زیادہ ہونگے بھی نہیں

اور اس لئے اگر ان کو ہم بدیسی چیز خیال کریں تو بھی اس کا امتزاج اُردو تغزل میں بہت کم ہے اور جتنا ہے وہ بھی کوئی معیاری چیز نہیں سمجھا جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ تغزلِ جغرافی صنفِ سخن ہی نہیں، اس کا موضوع انسان و انسانیت ہے اور اس لئے اس میں ایران توران کی تفریق ہی خارج از بحث ہے

اس میں شک نہیں کہ اُردو غزل کی داغ بیل ہندوستان میں ادب پرست مسلمانوں نے ڈالی اور اسی لئے اس کے اسلوب میں وہ باتیں بھی آگئیں جن سے تعلیم یافتہ مسلمان طبقہ صدیوں سے متاثر و مانوس تھا یعنی فارسی تغزل لیکن خود فارسی تغزل پر مقامی رنگ اتنا تیز نہ تھا کہ وہ ہندوستان کے باشندوں کے لئے بالکل بدیسی چیز ہوتا ورنہ ظاہر ہے کہ اُردو شاعری میں غزل پیدا ہی نہ ہوتی اور ہوتی بھی تو اس قدر مقبول نہ ہوتی۔

اُردو غزل میں ان تمثیلات کا عنصر جنھیں ایرانی کہا جاتا ہے اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا خود ہماری زبان کا یعنی اُردو غزل میں خود ہماری بولی ٹھولی اس طرح گھلی ملی ہوتی ہے کہ سارا شعر اپنی جگہ اک مقامی چیز معلوم ہوتا ہے اور جن ٹکڑوں میں ہم اپنے دلوں کی دھڑکن محسوس کرتے ہیں، وہ اپنی زبان ہی کے ہوتے ہیں نہ کہ ایرانی تمثیلات کے!

غزل کی زبان عام طور پر سہل و نرم ہوتی ہے اور ہمیشہ انھیں شعراء کی غزل کو معیاری چیز سمجھا جاتا ہے جنکی غزل کی میں زبان ہندی سے مہذب اور رچے ہوئے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اس لئے غزل کو زبان و خیال، دونوں حیثیت سے اپنے دیس کی چیز ماننا پڑے گا، ورنہ اس کے ہزاروں اشعار اُن لوگوں کی زبان پر نہ ہوتے جو فارسی جانتے ہی نہیں۔ یقیناً غزل میں ہمارے کاروبار، بازار، دفتر، کارخانے اور کھیتوں کا ذکر نہیں ہوتا۔ نہ اس میں علوم و فنون کا بیان ہوتا ہے نہ دُنیا کی اقتصادی و سیاسی تحریکوں کا، لیکن اس میں ان سے زیادہ اہم اور اساسی چیزوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یعنی اس میں ہم آپ ہوتے ہیں، کائنات کے مجموعی تاثرات ہوتے ہیں اور ہمارے وہ مرکزی جذبات جن کی حیثیت عالمگیر ہے۔

غزل کو ہماری عملی زندگی کے مادی پہلو سے کوئی غرض نہیں۔ غزل کی شاعری ایک مہذب اور رچی ہوئی بیکاری ہے لیکن شاید ایسی بیکاری جو فلسفہ و تمدن کی روح و رواں بن سکتی ہے۔

انسان کیا کرے، اس سے زیادہ اہم سوال شاید یہ ہے کہ انسان کیا محسوس کرے اور غزل اسی مقصد کو اپنے خاص انداز میں پورا کرتی ہے۔ غزل میں سمیٹ اور لپیٹ ہوتی ہے اسکے اسلوب میں منتشر حقایق کو جامعیت و ترنم کے ساتھ دل کی گہرائیوں میں اُتار دینے کی صلاحیت ہوتی ہے، غزل میں ایک معاملہ یا کیفیت کا ہر پہلو اپنی پوری کلیت کے ساتھ وجدان پر چھا جاتا ہے اور یہیں سے غزل اور نظم کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ادھوری بات ہے جس حد تک وجدان، تخییل اور تصور کا تعلق ہے، نظم و غزل کی کیفیتیں بالکل ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ غزل کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اُس کا لہجہ مانوس ہو، اسی لئے شعورِ انسانی غزل کے اشعار سے فوراً حقایق تک پہونچ جاتا ہے اور اس کا ہر شعر ہمارے

وجدان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

اُردو تغزل پر کئی پہلوؤں سے نظر ڈالی جا سکتی ہے مثلاً دہلی اور لکھنؤ اسکول کا تغزل، تغزل میں حُسن و عشق کا معیار تغزل و اخلاق، تغزل و فلسفہ، تغزل و نفسیاتی حقایق وغیرہ وغیرہ، لیکن اس وقت ان میں سے کسی پر گفتگو نہیں کروں گا، بلکہ ان سب سے ہٹکر کچھ اور باتیں کہوں گا۔

اُردو غزل کا ذکر چھیڑتے ہی سب سے پہلے میر کا نام ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہر چند ان کے زمانہ میں اور بھی کئی شاعر ایسے ہوئے ہیں جن کی غزلوں میں جان ہے، لیکن غزل کو بلند ادب کا مرتبہ دینے میں اولیت کا فخر میر کو حاصل ہے اور اس کے بعد سودا اور درد کو۔

کہا جاتا ہے کہ اُردو غزل کا آغاز اور ایک صدی تک اس کا نشو و نما ہماری زندگی کے انحطاطی دور کی یادگار ہے جب ہندوستان میں ہندوستانی حکومت کا چراغ جھلملا رہا تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بابر و اکبر کے زمانہ میں، میر، سودا اور درد کی سی عشقیہ شاعری ممکن نہ تھی۔ شیکسپیئر اپنی قوم کے انتہائی عروج کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا پھر بھی اس کی شہرت کا راز اس کی المیہ تمثیلوں ہی میں پوشیدہ ہے۔

یہ درست ہے کہ زمانہ کی حالت سے شعوری یا غیر شعوری طور پر شاعر ضرور متاثر ہوتا ہے لیکن اس کلیہ کو استعمال کرنے میں کسی قدر احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ شاعر کے ذاتی حالات اور فطری افتادِ مزاج کو بھی اس میں بڑا دخل ہے ذوق کی عمر کا بڑا حصہ مفلسی میں گزرا، لیکن قناعت و خودداری انھوں نے کبھی نہ چھوڑی، برخلاف اس کے غالب کو دیکھئے کہ ہر طرف سے روپیہ ان کو ملتا رہا لیکن ان کی قنوطیت کا عنصر بدستور قایم رہا، یہی وجہ ہے کہ ذوق کا کلام ہمارے دل کی کلی کھلا دیتا ہے اور غالب ہم کو ہنساتا بھی ہے تو ہمارا دل دُکھ کر رہ جاتا ہے۔ بہر حال میر اور غالب کے زمانہ کی شاعری میں جو فرق پایا جاتا ہے اس میں دو خاص باتیں دیکھنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ حسن و عشق کے واردات میں کوئی تبدیلی نظر آتی ہے یا نہیں، دوسری بات زبان کی صفائی، روانی اور بندش کی چستی ہے۔ زبان تو خیر پیچیدہ بھی ہوتی گئی اور سلجھتی بھی رہی، لیکن جہاں تک جذبات محبت کا تعلق ہے، میر کا حوصلہ شکن احساس غالب کے دور میں بدل جاتا ہے اور عشق کی طبیعت اگر بہل نہیں جاتی تو کچھ سنبھل ضرور جاتی ہے۔

میر کے لہجہ میں جو وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے وہ اس کے معاصرین میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ میر کے یہاں محض غم و غصہ، سوز و گداز، حسرت و بیدلی ہی نہیں، بلکہ ایک خاص داخلی بصیرت بھی اس کے یہاں پائی جاتی ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اگر میر کے سے محبت کرنے والے اُس دور میں ہوئے بھی تھے تو وہ شاعر نہیں تھے اور اپنا درد دُکھ اپنے ساتھ قبروں میں لے گئے۔ رہا ذوق و غالب کا زمانہ سو یہ ہر اعتبار سے مختلف تھا۔ ظفر کی عشقیہ شاعری میں غم کے عناصر پائے جاتے ہیں لیکن کمزور اور بجھے بجھے سے۔ اس زمانہ میں مومن بیشک ایک ایسا شاعر ہوا ہے جس کی احساس کی شدت کو تسلیم کرنا

پڑتا ہے، لیکن وہ کلیجہ تھام کر رہ جانے کی جگہ نفسیاتی کیفیات کی تلخیاں پیش کرتا ہے جن سے ہمیں خاص دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے۔ وہ جذبات سے مغلوب ہونے کی بجائے، وقوفِ جذبات کو اپنی شاعری کا خاص مقصد قرار دیتا ہے۔

مومن پہلا شخص ہے جس نے نفسیاتی واقعیت کی داغ بیل اردو تغزل میں ڈالی جو ہمیں کھُل کر رونے دیتی ہے نہ کھل کر ہنسنے دیتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے غالب کے مقابلہ میں مومن کی طرف کم توجہ کی اور اسکا سبب غالباً یہ تھا کہ غالب کے یہاں صرف الفاظ کا اشکال ہے اور مومن کے یہاں مفہوم کا۔ غالب کا مشکل سے مشکل شعر آسان ہو جاتا ہے اگر آپ الفاظ کے معنے اور ان کی ترکیب کو سمجھ لیجئے، لیکن مومن کا آسان سے آسان شعر سمجھنا مشکل ہے اگر ہم کو جذبات کے نفسیاتی ادراک کا شعور حاصل نہیں۔

میر اگر اپنے زمانہ کا تنہا شاعر تھا، تو مومن بھی اپنے عہد کا ایک ہی شخص تھا اور ان دونوں کا فرق یہ تھا کہ میر کا فن دلوں میں آگ سلگاتا تھا اور مومن کا فن ہمارے سینوں کے اندر نشتر توڑتا۔ اس کے بعد بھی دلی میں، اچھے اچھے شاعر ہوئے، لیکن ان میں سے کوئی کسی ایسی خصوصیت کا حامل نہ تھا جسے مرکزی حیثیت دیجائے۔ البتہ داغ کے تغزل کو علیحدہ جگہ دینا پڑے گی، کیونکہ وہ میر اور مومن دونوں سے مختلف تھا، یعنی اس وقت تک لوگوں کی نگاہیں تغزل کی صرف وسعت اور گہرائی کی طرف تھیں، لیکن اب سطح پر بھی انھیں کچھ دلچسپیاں نظر آنے لگیں اور کھلنڈرے پن سے اُلجھنے لگیں۔ داغ کا رنگ میر و مومن کے رنگ کا انحطاط نہ تھا بلکہ ان سے علیحدہ بالکل دوسری چیز تھی جو دلی سے باہر کی پیداوار تھی، اور اس سلسلہ میں لکھنؤ اسکول کی شاعری کا ذکر ناگزیر ہے۔

جب دلی مٹی تو لکھنؤ کی زندگی میں ایک زمانہ ضرور ایسا آیا جس میں خاصی چہل پہل پائی جاتی تھی اور رنگ رلیوں کی بھی کمی نہ تھی، لیکن اس جگمگاہٹ میں آتشبازی کی روشنی سے زیادہ کوئی بات نہ تھی جسے ہم ایک "دلفریب انحطاط" کہہ سکتے ہیں۔

یہاں میر بھی آئے، سوز بھی آئے، لیکن "پورب کے ساکنوں" سے وہ گھُل مل نہ سکے اور نہ یہاں کا رنگ انکی شاعری میں کوئی تغیر پیدا کر سکا۔ البتہ مصحفی نے اُردو تغزل کو ایک معتدل مزاج عطا کیا اور اسی اعتدال کے بدولت وہ سنگلاخ زمینوں سے اس طرح گزر جاتا ہے جیسے پانی کا ریلا کنکر پتھر سے۔ مصحفی نے اُردو غزل کو گویا حُسن کا سکون اور حُسن کا خرام ناز عطا کیا جو معمولی بات نہیں۔

انشاء کی غزل گوئی کو لوگ دھیان میں نہیں لاتے، لیکن وہ چیز جسے انگریزی میں (Fancy) اور (Conceit) کہتے ہیں یعنی خیال و تصور میں گدگدی سی پیدا کرنا اور استعارات و تشبیہات سے کھیلنا صرف انشاء کے یہاں ملتی ہے۔ اسی طرح جرأت نے نفسیاتی کیفیات کی جتنی صحیح مصوری کی ہے وہ بھی اپنی جگہ بے مثل ہے یہاں تک کہ داغ بھی اس کی تقلید میں کامیاب نہ ہوا۔

مصحفی اور انشاء کے بعد ناسخ و آتش کا دور شروع ہوتا ہے۔ ناسخ نے خارجی تغزل کو ایسا گورکھ دھندا بنا دیا کہ

وہ خارجی بھی نہ رہا اور حُسن و عشق اس کے نمائندے۔ فیصدی اشعار سے اسطرح غائب ہوا کہ بڑے بڑے لڑکیوں کے کورس میں داخل ہونے کے لئے ناسخ کی غزلیں ہر وقت حاضر ہیں۔ آتش نے جہاں اس رنگ کی تقلید کی ناسخ کی طرح بگڑ گئے اور ناسخ نے جہاں آتش کی تقلید کی بن گئے۔ آتش کے کلام میں حسن و عشق زیادہ نہیں، لیکن جتنا کچھ ہے، وہ میر، غالب، مومن، جرأت، انشاء سب سے الگ ہے۔ آتش کی عشقیہ شاعری ایک صاحب باطن کی مجاز پرستی معلوم ہوتی ہے۔ آتش نے عشقیہ تغزل کو ایک نیا مزاج دیا، نیا بانکپن نئی سرمستی، نیا اُبھار، نیا نکھار، نئی ادبیت، نئی روحانیت بخشی اور مصحفی نے اس کی زبان کو کوثر و تسنیم بنا دیا۔ آتش کا تغزل اس شخص کا تغزل نہیں ہے جو انفرادی زندگی کے پیچیدہ مسائل کا حل ڈھونڈھ رہا ہو بلکہ اس شخص کا تغزل ہے جو ان مسائل کو حل کرنے کے بعد ہم کو بتا رہا ہے۔ یہ نشاط اور شگفتگی سودا کے یہاں بھی ہے لیکن آتش کے یہاں اس کی تہیں گہری ہیں۔ بہرحال ہندوستان میں مذاقِ زندگی اور مذاقِ محبت میر اور سودا کے زمانے سے آتش کے زمانے تک بدلا ہو یا نہ بدلا ہو لیکن شاعری کے اندر مذاقِ زندگی اور مذاقِ محبت دونوں بہت کچھ بدلتے رہے

اُردو تغزل کا جاندار حصہ اور رچا ہوا حصہ لکیر کا فقیر نہیں تھا اس کا قالب ہمیشہ بدلتا رہا اور یہ بات محض زبان اور انداز بیان کی تبدیلی تک محدود نہیں تھی۔

آتش اور ناسخ کے بعد امیر مینائی نے لکھنؤ میں غزل سرائی شروع کی اور ان کے تغزل میں ناسخ، مصحفی، آتش کے مختلف رنگوں کا امتزاج ہمیں ملتا ہے۔ امیر نے مصحفی کے رنگین البیلے پن کو ناسخ کے تصنع کی چاشنی دیکر اُردو تغزل کو نئے انداز سے رچایا اور سنوارا۔ ناسخ کے بگڑے ہوئے رنگ اور داغ کے خطرناک کامیاب رنگ کی لالچ میں پڑکر امیر نے اکثر غزل کو بگاڑا بھی مگر یہ حیرت سے خالی نہیں کہ امیر خاندان آتش و مصحفی کے فرد ہوتے ہوئے اپنے تغزل میں بار بار ناسخ کا زانو دبا کر بیٹھتے ہیں اور امیر سے کچھ ہی کم مشہور ان کے ہمعصر جلال خاندان ناسخ سے ہوتے ہوئے اپنے متعدد اشعار میں وہ سوز و گداز اور نغمگی بھر دیتے ہیں جن کی تاثیر و لطافت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب لکھنؤ کے اُجڑنے پر دہلی والے اور لکھنؤ والے سب رام پور پہونچ گئے تھے اور ایک دوسرے کے رنگِ تغزل سے متاثر ہو چلے تھے۔ امیر اور داغ حیدرآباد میں پیوندِ خاک ہوئے اور کچھ دنوں بعد جلال لکھنؤ میں۔ ان کے ساتھ اُردو تغزل کا ایک دور ختم ہو گیا۔ صرف اُردو تغزل کا نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی زندگی کا بھی۔ اب ہندوستانی سماج اور ہندوستانی کلچر اور ادب کی دُنیا بدلنے والی ہے۔ بیسویں صدی کا آغاز ہے۔

امیر، داغ اور جلال کے شاگردوں کی آوازیں ابھی فضا میں گونج رہی ہیں۔ ان کی جانشینی کے بھی چرچے ہیں ابھی یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ جن کی جانشینی کی بحثیں جاری ہیں وہ اپنی ملکیت اور ملوکیت لیکر دُنیا سے سدھار رہے ہیں لیکن امیر داغ اور جلال کے زمانہ ہی میں اُردو تغزل حالی پانی پتی، شاد عظیم آبادی، آسی غازیپوری کے ہاتھوں نیا قالب اختیار کر رہا تھا۔ ان کی آوازوں میں جو خلوص تھا جو معصومی تھی اور جو رس تھا وہ رفتہ رفتہ دلوں کو موہنے لگا کم سے کم ان

دلوں کو جنھیں دھڑکنا آتا تھا۔ یہ بھی سوفی صدی داخلی اور معنوی انقلاب تھا جس میں اگر کوئی دخل ہے تو ہماری تہذیب اور زندگی کی نئی بیداری کو اور شعراء کے انفرادی وجدان کو نہ کہ طرزِ بیان اور طرزِ ادا کو۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو تغزل کے ہر دور میں ایک طرح کی لفظ پرستی دوسری طرح کی لفظ پرستی سے بدلتی رہی ہے، وہ خود لفظ پرستی کے دام میں گرفتار ہیں۔ زندگی بدلتی رہی اس لئے اُردو غزل بدلتی رہی۔ جیسا ابھی گذارش کر چکا ہوں، ہندوستان کی دنیا بدل رہی تھی اور ہمارے ادب کی ہر صنف کا بدل جانا لازمی تھا۔ ناول میں سرشار کا دور ختم ہو کر فسانہ نگاری کا دور شروع ہونے والا تھا، پُرانے طرز کے قصاید اور قطعات کا دور ختم ہو کر آزاد، حالی، اسمٰعیل اور اکبر کا دور آنے والا تھا، پُرانے تذکروں کی جگہ حالی اور شبلی تاریخ و تذکرہ کو نئے راستہ پر لا رہے تھے، علمی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا دور شروع ہو گیا تھا۔ ہندوستان کا وسطی طبقہ مغربی کلچر کی روشنی اور آنچ کو جذب کر رہا تھا، شاعری کو سننے اور پڑھنے والوں کے دل و دماغ بدل رہے تھے، پُرانا نظام ہندوستان کو خیرباد کہہ رہا تھا۔ اگر ہندوستان کے اس عالمگیر ذہنی انقلاب کا احساس کسی کو ہو تو اس انقلاب میں اور اُردو غزل کی بدلی ہوئی آوازوں میں جو ہم آہنگی ہے وہ سمجھ میں آجائے گی گو یہ بات نہیں کہ نئے تغزل کے نمایندے کبھی کبھی قدما کی آواز پر آواز نہ دیں۔ لیکن ان کے یہاں جو چیز دیکھنے یا سننے کی ہے وہ ان کی بازگشت آوازیں نہیں بلکہ نئی آوازیں ہیں۔ اگر ہمارے کان کے پردے ان نئی آوازوں کو پہچان سکیں۔

دہلی (اور اس کے اطراف) میں غالباً داغ ہی کی کچھ کامیاب اور کچھ ناکامیاب تقلید ہوتی رہی اور لکھنؤ و جوار لکھنؤ میں امیر کی۔ لیکن لکھنؤ میں صفی، عزیز، محشر، نوبت رائے نظر وغیرہ نے بیسویں صدی کے ابتدائی دس پندرہ سال میں اُردو غزل کو نئی شستگی اور شایستگی دی اگرچہ ایسا کرنے میں انھوں نے بارہا مرثیت کا سہارا لیا۔ میں اسے جذباتی اسکول کی شاعری کہتا ہوں۔ اس اسکول کے کئی شاعر سنجیدگی اور خلوص پیدا کرنے کے لئے امیر مینائی کے نشاطیہ رنگ کے بجائے غم کا سہارا لیتے ہیں اور غم کو عموماً بسترِ علالت، نزع، جنازہ اور گورِ غریباں کے تصورات تک محدود کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہ اس اسکول کے تغزل میں حُسن و عشق کی داستان نہیں۔ قبل کی عشقیہ شاعری کے کچھ اثرات جذباتی مدرسہ کی عشقیہ شاعری میں ضرور نظر آتے ہیں، مگر اس اسکول کے اچھے عشقیہ اشعار محض قدما کی تقلید نہیں ہیں۔ غالب کی پرچھائیں اور کہیں کہیں میر کی ہلکی سی پرچھائیں ان اشعار پر ضرور پڑتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میر اور غالب کے جذبات میں وہ مرکزیت وہ گہرائی ہے کہ ان کی آوازیں پچاسوں اور سیکڑوں برس بعد بھی دلوں میں اُتر کر پھر اُبھرتی ہیں لیکن ان کے یہاں غالب کی آواز ایک نیا چیلاپن اور ایک نئی تلخی لئے ہوئے اور میر کی آواز بھی کچھ پُرانی کچھ نئی صورت میں نظر آتی ہے۔ وسعت و تنوع البتہ جذباتی اسکول کی عشقیہ شاعری میں کم ہے۔ اس شاعری میں جو نکھار ہے وہ عموماً ایک بند کلی کا نکھار ہے کھلے ہوئے پھول کا نکھار نہیں ہے۔ بہر حال یہ تو نسیے ہوئے غنچۂ سربستہ بھی ایک رنگ و بو رکھتے ہیں گو اس رنگ و بو میں سپاہی ایل فاسد خون کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔

اس رقّتی یا جذباتی اسکول سے ثاقب لکھنوی کا تغزل کچھ الگ تھلگ ہے اور کچھ ملتا ہوا بھی۔ ثاقب کے یہاں پرخلوص عشقیہ اشعار کا فقدان ہے اور حسن و عشق کا بیان جہاں جہاں ہے وہ لطافت و رنگینی سے خالی ہے انھوں نے حیات و کائنات پر ذاتی شکوہ و شکایت اور غم پرستی سے آگے بڑھ کر بہت کم کہا ہے۔ مگر گل و بلبل اور اردو تغزل کی روایتی تمثیلوں کی بنیاد پر ثاقب نے ایسے اشعار بھی ضرور کہے ہیں جن پر نگاہیں اٹھ جاتی ہیں۔ آرزو تو ثاقب سے بھی زیادہ جذباتی اسکول کے شعراء سے علٰحدہ ہیں۔ انھوں نے میر کی لمبی بحروں میں اور میر کے انداز کی مشابہت لئے ہوئے غزلیں کہی ہیں اور حسن و عشق کی کیفیات کی کہیں کہیں بڑی کامیاب مصوری کی ہے لیکن چونکہ بوساطت اپنے استاد جلال کے وہ خاندان ناسخ کے شاعر ہیں اس لئے زیادہ تر خارجی اور کم تر داخلی کیفیات حسن و عشق کی مصوری آرزو کے یہاں ملتی ہے۔ آرزو کے یہاں زبان و طرز ادا میں وہی سنگار اور بناؤ پایا جاتا ہے جو مسجع و مرصع نثر میں ہوتا ہے۔ الغرض ثاقب کی شاعری کے سرے تو جذباتی اسکول سے مل بھی جاتے ہیں۔ لیکن آرزو کو جذباتی اسکول کا شاعر نہیں کہا جا سکتا۔

جذباتی اسکول کی تپ زدہ شاعری کے عروج کا زمانہ سنہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۵ء یا اس کے کچھ پہلے بعد تک سمجھئے: لیکن آخر کار وہی ہوا جو ہونا تھا یعنی مرزا یاس نے ان منہ بند کلیوں پر وہ چنگاریاں برسائیں کہ ان کی افسردگی دھوئیں میں تبدیل ہو گئی۔ یگانہ کے تغزل میں حسن و عشق کی داستان بہت کم آتی ہے اور جب آتی ہے تو اس میں جذباتی اسکول کے نسائی جلاپے کے انداز نہیں ہوتے بلکہ مردانہ زور ہوتا ہے ان کے تخیل و احساس کی گرمی خود بخود لو دیتی ہے یگانہ عاشق نہیں لیکن ان کے عشقیہ اشعار میں حسن کا احساس و مشاہدہ ہے اس لئے وہ بڑے پتے کی کہ جاتے ہیں۔ یگانہ کے زیادہ تر اشعار براہ راست حسن و عشق کے بیان سے متعلق نہیں بلکہ حیات و کائنات کے دوسرے پہلوؤں سے متعلق ہیں اور ان اشعار میں بھی وہی چوٹ کھائے ہوئے تملاہٹ پائی جاتی ہے جو ان کی عشقیہ شاعری میں ہے۔ کلام یگانہ میں کڑی دھوپ کی آنچ ضرور ہے لیکن تو نسانے کے ساتھ ساتھ وہ ہمارے لئے ایک طاقت بخش فرحت بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔

یاس ادھر لکھنؤ کے رقت پسند جذباتی اسکول کی شاعری پر آگ برسا رہے تھے، ادھر حسرت موہانی قید فرنگ کی چکیوں کے سنگین پاٹوں سے جو چنگاریاں اڑتی تھیں، ان کو نرم اور رسیلے نغمہ میں تبدیل کر رہے تھے۔ حسرت نے اپنی ہستی کو روح تغزل میں بالکل حلول کر دیا تھا۔ جرأت، مصحفی اور مومن کے انداز احساس اور وجدان کی مختلف تعبیر اتوں کا وہ لطیف و مکمل امتزاج حسرت کے تغزل میں ملتا ہے جسے ہم اپنے قلب و گوش کے لئے صرف ایک نعمت کہہ سکتے ہیں۔ حسرت کے کلام کی واقعیت ایک ایسی نرم راست گوئی اور رنگین سچائی بن گئی ہے جسے ہم جانِ تغزل کہہ سکتے ہیں بیان و وجدان کی اس پختگی کی مثال حسرت کی غزلوں میں ملتی ہے ان کے اشعار میں شعور کی وہ سادگی و پرکاری اور کیف و اثر کی وہ رنگینی نظر آتی ہے جو بیک وقت سامنے کی چیز بھی معلوم ہوتی ہے اور درک انسانی کی آخری منزل بھی

اُردو تغزل میں اتنی لطیف و رنگین داخلیت اِس سے پہلے مفقود تھی۔ حسرت کا تغزل ہمیں تخیل کی بلند پروازیوں سے، فلسفیانہ معنویت سے اور تصوف و عرفانیت سے بے نیاز کر دیتا ہے اور وہ ہمارے اندر ایک ایسی رفاقت (Companionship) کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے جس کی مثال اُردو کے کسی غزل گو کے کلام میں نہیں ملتی یہاں تک کہ امیرؔ و غالبؔ کے کلام میں بھی نہیں۔

فانیؔ بدایونی نے بھی اپنے انداز تغزل سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا، لیکن ان کی غزل گوئی ایسی ہے جیسے چوٹ کھائی ہوئی بجھی ہوئی طبیعت کو کُرید کُرید کر خاک کی ڈھیر سے چنگاریاں اُڑائی جا رہی ہیں۔ وہ لکھنؤ کے جذباتی اسکول اور لکھنؤ کے عام رنگ سے کافی حد تک متاثر معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ لکھنؤ کے رنگ سے صرف غمگینی اور نکھرا ہوا اندازِ بیان لے لیتے ہیں اور مرثیت نہیں ہے۔ باقیات اور عرفانیات فانیؔ کو ہمدردی اور قدردانی کے ساتھ پڑھ چکنے کے بعد کائنات اور حیات بجائے کوئی وسیع ڈرامائی کیفیت رکھنے کے بہت چھوٹی چیز معلوم ہونے لگتی ہیں۔ فانیؔ کا شیوۂ تسلیم و رضا، محاسنِ کائنات و حیات کا احساس پیدا نہیں کرتا۔ ان کے یہاں نہ تحیّر ہے نہ تحیّر کی سپردگی۔ محبت کی تلخیاں ان کے یہاں شدید سے شدید تر یا تلخ سے تلخ تر تو ہوتی گئی ہیں، لیکن شاید مئے کہنہ ہونے کے بجائے وہ تیزابِ ہو کر رہ گئی ہیں۔

فانیؔ کے ساتھ ہی ساتھ اصغرؔ گونڈوی بھی اُبھرے۔ اصغرؔ نے اپنا پینتیس یا چالیس برس کی عمر تک کا کلام شایع ہونے سے روک دیا۔ مذہب کے اثر سے جو ذہنی و اخلاقی انقلاب چالیس برس کی عمر میں اصغرؔ کی زندگی میں ہوا اس نے ان کی طبیعت میں نئی لطافت پیدا کر دی تھی اور اسی لئے ان کے کلام میں داخلی طہارت، روحانی نشاط اور لطیف سرمستی کی کمی نہیں۔

اصغرؔ کے کلام میں انسان کا انسان سے عشق قریب قریب مفقود ہے۔ آب و گل کی دنیا، ماہ و انجم، دریا و صحرا، بادہ و ساغر یہاں تک کہ پیکرِ انسانی اور تمام مادی چیزیں اصغرؔ کے یہاں سماوی ہو گئی ہیں۔ بات شاید یہ ہے کہ اصغرؔ کی جوانی نے جنسیات و شہوانیات میں روحانیت کا عنصر پایا ہی نہیں تھا۔ عاشق و محبوب کے تعلقات جنسی کو ان کا شعور لطیف بنا ہی نہ سکا تھا، اسی لئے ان کی روحانیت سونی نظر آتی ہے۔

اسی کے ساتھ جگرؔ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ہماری گوشت و پوست کی رگوں پر زخمہ زن ہیں۔ ان کے تغزل میں ان کے پڑھنے کا انداز چار چاند لگا دیتا ہے۔ جگرؔ جیتے جی اپنی طرزِ زندگی کی وجہ سے ایک سنسنی پیدا کرنے والی روایت (tradition) بن گئے اور چونکہ ان کے تغزل میں دعوتِ فکر کم اور دعوتِ کام و دہن زیادہ ہے، اس لئے اپنی شاعری و شخصیت کے اُبال سے جلد اُبھر آئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جگرؔ کی شاعری میں والہانہ انداز ہے لیکن مجھے ایک ہیجانی اضطراب کی کیفیت نظر آتی ہے۔ بیمار کی لڑکھڑاتی ہوئی چال اور شرابی کی لغزشِ مستانہ میں جو

جو فرق ہے وہی جگر کے ہیجان اور سچے والہانہ انداز میں ہے۔ جگر کی کامیابی کا اک راز یہ بھی ہے کہ ان کے تغزل میں جتنی زندگی ہے اس سے کہیں زیادہ "شاعری" ہے اور زندگی بھی ایک بیتاب، نفسانی خواہش والی زندگی ہے اچھے اور بُرے دونوں معنوں میں جو "شاعری" جگر کی غزلوں میں پائی جاتی ہے اس کی وجہ سے ان کی کامیابی ایک حد تک لازمی تھی کیونکہ داغ دہلوی کی روایتیں اور لکھنؤ کی لفظ پرستی کی روایتیں اب تک شاعری کی دنیا میں جمہور کے لئے ایک کشش و دلفریبی رکھتی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ جگر کی زندگی اور شاعری کے یہ محرکات ان کے تغزل میں کوئی محاسن پیدا کر ہی نہیں سکے۔ کلام جگر کے اگر اس حصے کا انتخاب کیا جائے جو ذرا سنبھل کر کہا گیا ہے یا جہاں ان کے وجدان کا ہیجان اپنے رنگ میں کامیاب ہوگیا ہے تو یہ مجموعہ ہمارے کبھی کبھی کے توجہ کی چیز ضرور ہوگا۔ چونکہ ہیجان و اضطراب بہت جلد باسی ہو جانے والی اور حقیقی ...تی و والہانہ پن سدا بہار چیزیں ہیں اسی لئے جگر کا تغزل جتنا سنتے ہی متاثر کرتا ہے اتنا بعد کو نہیں۔ اس میں ٹھرّے کی بو اور اُڑان ہے لیکن شراب کہنہ کا دیرپا اثر اس میں نہیں جگر کے بہت کم اشعار ایسے ہیں جن میں وہ روک تھام ہو کہ ہم انھیں تنہائی کے لمحوں میں گنگنا گنگنا کر خاموش طور پر متاثر ہو سکیں، ان میں رنگِ مشاعرہ یا رنگ محفل زیادہ ہے اور خلوت کے جلوے بہت کم ہیں۔

سیماب اکبرآبادی کی غزلوں کا ایک خاصہ حصہ اچھا ہے لیکن کسی انفرادیت کے بدلے مشاقی ان میں زیادہ نمایاں ہے۔ سیماب کے اشعار بسا اوقات بہت اچھے ہوتے ہیں اور اسی دور کے تغزل کے جلوے ان میں نظر آتے ہیں لیکن ان کی کوئی اپنی آواز نہیں، اپنا لہجہ نہیں، اپنا جمالیاتی نظریہ اور اپنا وجدان نہیں ان کے اچھے سے اچھے شعر کو سن کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سیماب کی آواز ہے۔

حال میں اثر لکھنوی کا دیوان بہاراں شایع ہوا ہے۔ اُسے غور سے پڑھنے پر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ کلام نہایت متین، مہذب اور سنجیدہ ہے، بالکل مذاق سلیم کے مطابق اور زبان و بیان کے لحاظ سے مستند چیز ہے۔ اثر نے عشق کیا ہے حُسن کا مشاہدہ کیا ہے حُسن و عشق کے تاثرات اور ان کے نفسیات کا شعور حاصل کیا ہے۔ لیکن شاعری میں وہ چیز جسے ہم جادو کہتے ہیں اثر کے یہاں ہمیں نہیں ملتا، اسی لئے ان کی شاعری محض "سمجھنے" کی چیز ہے۔ اس میں ہم کھونا چاہیں تو کھو نہیں سکتے۔

آزاد انصاری کا تغزل بھی نہایت حساس اور واقفکارانہ ہے۔ وہ ایک ہنئے قابل قدر اور مخصوص اسلوب و انداز کے مالک ہیں اور ان کا کلام ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ ہے مختصر سا حال آج تک کے اُردو تغزل کا۔ دورِ حاضر کے اُردو تغزل کو ہم پچھلے ادوار کے تغزل سے کئی باتوں میں مختلف پاتے ہیں۔ "جذباتی"، "رقتی" یا "ماتمی" مدرسۂ تغزل کے بعد کے شعراء کسی ایک مدرسہ یا

اسکول کے نہیں ہیں۔ حسرتؔ، یگانہؔ، اصغرؔ، فانیؔ، جگرؔ ان سب کا الگ الگ مزاج ہے الگ الگ تغزل ہے۔ اب دلہجہ، آوازیں اور فضائیں ضرور دورِ حاضر کی ہیں لیکن جو تنوع و اختلافِ مزاج ان میں ہے وہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم انھیں دورِ حاضر کے متغزلین کا ایک گروہ کہیں نہ کہ ایک مدرسہ یا اسکول کا چند اور اُمور بھی قابلِ لحاظ ہیں۔ اُردو زبان و ادب پر خصوصاً اُردو شاعری پر اور اس سے بھی زیادہ اُردو غزل پر جو حکومت دہلی اور لکھنؤ کی تھی وہ جہاں تک تغزل کا سوال ہے حسرتؔ اور ان کے غیر دہلوی اور غیر لکھنوی معاصرین کے کارناموں کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ اُردو رسایل نے جہاں تک شہرت قایم ہونے یا قایم کرنے کا سوال تھا اب مشاعروں کی جگہ لے لی ہے۔ اس طرح ہر پڑھا لکھا آدمی ملک کے مشہور شعرا کو جان پہچان گیا ہے اور شعراء کی اہمیت کے متعلق اہلِ ملک کا خیال منظم ہو چلا ہے۔ اب ایک تعلیم یافتہ جمہوریت اس کا فیصلہ کرتی ہے کہ کون شاعر کیسا ہے اور اُسے کتنا بڑا اور کتنا چھوٹا سمجھا جائے۔ یونیورسٹیوں میں اُردو ادب کے مطالعہ اور رسایل میں تنقیدی مضامین کے اثر نے نئی آزادی اور نئی ذمہ داری اُردو خواں پبلک کے لئے پیدا کر دی ہے۔ اُردو ادب کی یہ ترقی ہندوستان کی اس نشاۃ ثانیہ کا نتیجہ ہے جو غدر کے بعد شروع ہوا اور جس نے پچھلے پندرہ بیس سال کے اندر ہمارے ملکی ادب میں ایک انقلاب رونما کر دیا۔

یہ عہد اُردو ادب کا عہد زرّیں ہے اور نثر میں بھی خوب کام ہو رہا ہے ـــــ یوں کہئے کہ پچھلی چوتھائی صدی میں جتنے مصنف اور جتنی کتابیں نثر کی نکلی ہیں وہ تعداد و اہمیت کے لحاظ سے ایسی ہیں کہ اُردو ادب کی پچھلی تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ نظم اور غزل میں صرف چوٹی کے شعرا نہیں بلکہ قریب پچاس ساٹھ شعراء نے اسی چوتھائی صدی میں مقدار، تعداد، تنوع اور ادبی اہمیت کے لحاظ سے جو کچھ کہا ہے وہ دو سو برس کے اُردو کارناموں پر بھاری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی طور پر ہمارا ذہن اُگ آیا ہے۔ جس کا ثبوت چوٹی کے غزل گو شعراء کے علاوہ دوسری اور تیسری صف کے شعراء کے کلام سے بھی ملتا ہے۔

دورِ حاضر کے تغزل کی خصوصیتوں میں معنویت، سنجیدگی، وقوفِ جذبات، اور حسن و عشق کی کیفیتوں کا تجزیہ اور کلام کی ہمواری، ترنم کا عنصر ایک رچا ہوا مذاق، سطحی یا رسمی شکوہ و شکایت سے بچنا اور حسن و عشق کے احساس کے ذریعہ سے حیات و کائنات کی نئی تنقید۔ اور ان سے متعلق نئے اشارات، نفسیات انسانی کی تحلیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اُردو تغزل میں علاوہ ان باتوں کے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے خود عشق یا غمِ زندگی محض جنسی محرکات تک محدود نہیں تھا۔ بلکہ یہ الفاظ اُس تہذیب یا زندگی کے ان اُصول کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو زندگی کو خشک بنجر ہو کر رہ جانے سے بچاتے ہیں، جو زندگی کو طاقت و تازگی بخشتے ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو اُردو تغزل کا وہ حصّہ جس میں معاملہ بندی یا مخصوص طور پر حسن و عشق کا حال نہیں بیان کیا گیا ٹکسال باہر سمجھا جاتا۔ جو لوگ تغزل کو صرف عورتوں یا

معشوقوں سے بات چیت تک محدود رکھنا چاہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ تغزل میں اُصولِ زندگی اور زندگی کے مستقل عناصر سے متعلق ہر موضوع شامل ہے، شرط صرف یہ ہے کہ ایسے اشعار میں شعریت ہو، کیف و اثر ہو۔ دورِ حاضر کے تغزل میں حسن و عشق کا بیان ہی پہلے کے عشقیہ اشعار سے مختلف نہیں بلکہ حیات و کائنات پر جو حکم لگائے گئے ہیں وہ بھی بسا اوقات نئے احساسات کے حامل ہیں اور نئے نئے نظریئے پیش کرتے ہیں۔

میں نے اب تک جان بوجھ کر اُردو تغزل میں اس انقلاب کا ذکر نہیں کیا جو اقبالؔ کے ہاتھوں رونما ہوا۔ اب تک اُردو تغزل میں عشق و زندگی کے جو اُصول پیش کئے گئے تھے ان میں انفرادی زندگی کے لئے جو کچھ بھی کہا گیا ہو لیکن اجتماعی زندگی کا موضوع اور اجتماعی زندگی کے اُصول بیان نہیں کئے گئے تھے۔ غزل کی زبان بڑی حد تک اس کام کے لئے ناموزوں تھی۔ اگرچہ اس دور کے تغزل میں بہت وسعت و تنوع ہے پھر بھی اجتماعی زندگی اور اسکے اُصول اجتہاد اور ایجاد چاہتے تھے۔ یہ کام اقبالؔ نے کیا۔ انسانی تاریخ اور اجتماعی زندگی کا فلسفہ انھوں نے اپنے زاویۂ نگاہ سے اپنی غزلوں کے سیکڑوں اشعار میں بیان کیا۔ کچھ پُرانی زبان سے مدد لی اور کچھ اپنی زبان خود بنائی۔ انسانیت کے عروج و زوال سماجی زندگی کے پیچیدہ مسائل انسانی تاریخ کے رجحانات سائنس اور جدید فلسفہ کی روشنی میں پیش کرنے کی ضرورت ہے لیکن ایسے غزل گو اب آئیں گے۔ اس کے لئے مغربی علوم سے محرکات ملیں گے۔ اشتراکیت، جمہوریت، دہریت، حسن و عشق، حیات اور کائنات کے نئے نظریئے علاوہ نظم گو شعرا کے، آنے والے غزل گو شعرا پیش کریں گے۔ اقبالؔ نے موضوع میں اہم وسعت ضرور پیدا کر دی لیکن اقبالؔ کا نظریہ جو ایک شخصی آسمانی خدا اور دینیاتی ملت و نظام پر قایم ہے اب اس کے بھی دن بیت چکے ہیں۔

میں نے دورِ حاضر کے جن بڑے متغزلین کا نام لیا ہے یعنی حسرتؔ، یگانہؔ، فانیؔ، جگرؔ اور اقبالؔ ان سب کے کام ختم ہو چکے۔ اُن میں جو زندہ ہیں ان کی عمر پچاس سال یا اس سے زاید ہے، اُردو کا کوئی غزل گو جس کی عمر پچیس سال سے چالیس بیالیس سال تک ہو ایسا نہیں ہے جس پر نگاہیں اُٹھیں۔ برعکس اس کے اُردو نظم گو شعراء جن کی شہرت قایم ہو چکی ہے ان میں ایک جوشؔ ملیح آبادی کو چھوڑ کر اور جتنے ہیں سب لگ بھگ تیس برس کے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ آیندہ پچیس تیس سال تک اُردو غزل ایک لمبی نیند سوئے گی۔ اُردو تغزل کو پھر سے زندہ کرنے والا جو شاعر ہوگا وہ یا تو آج بالکل بچہ ہے یا دو چار برس بعد پیدا ہوگا اور مزاج، تعلیم و تربیت، ذہنی فضا اور زندگی کے لحاظ سے بالکل نیا انسان ہوگا۔ مگر اُردو تغزل کے اس خوابِ گراں کو اُردو تغزل کی موت نہ سمجھنا چاہئے۔ تغزل ہمارے نخلِ ادب کا اولین ثمر تھا اور آخری ثمر بھی تغزل ہوگا کیونکہ غزل کا اسلوب وہ بنیادی و انتہائی چیز ہے کہ ہمارے کلچر کی پختہ ترین شکل غزل ہی کے اشعار میں نظر آئے گی، غزل ہی ہمارے ادب کے دل کا چور ہے۔ غزل ہی ہمارے ہر دور کی آخری منزل کی نمایندگی کر سکے گی اور غزل ہی میں ہمارے کلچر کی تکمیل کے آثار نظر آئیں گے

امیر و داغ کے بعد ہی معیاری اور حقیقی اُردو تغزل کے مطالبے سخت تر ہوتے گئے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ عزیز، حسرت، یگانہ، فانی اور ان سے پہلے حالی وغیرہ نے جو غزلیات کے مجموعے چھوڑے وہ اشعار کی تعداد کے لحاظ سے میر، مصحفی، ناسخ، آتش، امیر اور داغ کی پُرگوئی کے مقابلے میں بہت مختصر ہیں۔ بیسویں صدی کے اُردو تغزل نے چوتھائی صدی تک قدم قدم پھونک پھونک کر آگے بڑھایا ہے اور اب اگر اُسے دورِ حاضر کی منزل پر منید آگئی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ابتک کی غزل گوئی اور تیس چالیس برس آگے کی غزل گوئی کے درمیان ایک دُنیائے خواب حایل ہے۔ اس دوران میں ہماری زندگی اور ہمارے ادب کی تکمیل کئی طرح سے ہوتی رہے گی جب نئی تہذیب نئی زندگی نیا ادب اپنی پوری جوانی پر آجائیں گے تو ان میں شباب کا آخری نکھار پیدا کرنے کے لئے اُردو تغزل آنکھیں ملتا ہوا، انگڑائیاں لیتا ہوا پھر اُٹھ بیٹھے گا۔

اُردو تغزل پر بہ حیثیت مجموعی حکم لگاتے وقت ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک اس میں عموماً آفاقی لب ولہجہ (Cosmic note) نہیں رہا۔ غزل گو شعراء یہی نہیں کہ اجتماعی زندگی اور انسانیت کا زور اپنے کلام کے زیر و بم میں نہیں بھر سکے بلکہ انفرادی اثرات میں بھی آفاقی وسعت پیدا نہیں کر سکے۔ بلند آہنگی ضرور سودا اور کبھی کبھی ناسخ یا دیگر شعراء نے اپنے تغزل میں پیدا کی لیکن قصیدہ نما بڑے بول اور آفاقی وسعت میں فرق ہے اُن کے انفرادی احساس اور تجربے سے آفاقی قوتوں کی سرحدیں نہیں ملتیں۔ کائنات سے ہم آہنگی کا پتہ نہیں ملتا۔ عبرانیت (Hebraism) تخصیصیت (Particularism) اور تثنیت (Dualism) کے محرکات اب تک زیادہ کار فرما تھے۔ معصومیت اور خیر و برکت کی شان، امرت میں ڈوبی ہوئی آواز کی عموماً بہت کمی رہی ہے۔ اُردو تغزل کو محض حیات نُما نہیں ہونا ہے بلکہ حیات بخش ہونا ہے۔ اُردو کے غزل گو کو بلندیوں اور گہرائیوں میں پہنچنا ہے اس کو حیات، کائنات حسن و عشق سے از سرِ نو مانوس ہونا ہے۔ اُسے زندگی کی نئی قدروں کو دریافت کرنا ہے۔ حُسن و عشق کو جدید سائنس، جدید فلسفہ، جدید نفسیات، جدید محرکات کی روشنی میں محسوس کرنا اور پیش کرنا ہے۔ انسان کا آفاق میں کیا مقام ہے اس کا شاندار مستقبل کیا ہے۔ اس احساس کی تھرتھراہٹ آیندہ کی غزل کے زیر و بم میں ہونا چاہیئے۔ غرضکہ اُردو تغزل کے داخلی، معنوی اور وجدانی اجزائے ترکیبی اب بالکل بدل جائیں گے۔ جس شاعر کا تخیل میر، غالب، آتش، بلکہ حسرت یا اقبال تک کے تخیل سے بوجھل ہو جائے گا، اُس کے ہاتھوں سے تغزل کی داغ نہ پڑ سکے گی

اب تک کے اُردو تغزل میں ایک بات ہمیں اور نظر آئی ہے۔ آپ اُردو غزلوں کا کوئی دیوان اُٹھا لیجئے۔ اول، دویم، سویم، ہر درجے کے اشعار آپ کو ملیں گے لیکن ایسے شعر بہت کم ملیں گے جو احساس و تفکر کے لحاظ سے یہ پتہ دیں کہ ان اشعار کا شاعر چالیس یا پچاس برس پہلے زندگی کا یہ احساس کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ایسے اشعار جو شاعر کے داخلی و ذہنی ارتقا کا ثبوت دیں بہت کم ملیں گے۔ زیادہ تر ہماری غزل گو بیس پچیس برس کی عمر کے تجربے یا محرکات ہی کو عمر بھر تختۂ مشق بناتے رہے۔ یا

پھر لفظوں سے کھیلتے رہے۔ اس لئے مستقبل کا غزل گو بہت سے اُستادوں کے کلام سے استفادہ کر ہی نہیں سکے گا، ہاں میرؔ، غالبؔ، آتشؔ، اقبالؔ اور چند دیگر متغزلین کے کلام سے بالکل آزادطور پر اپچ کی لینا سیکھے گا۔ اس کام میں اُردو کی نظم و نثر، مغربی ادب اور نئی تہذیب سے بہت سہارا مل سکے گا۔ اب پُرانی شاگردی و اُستادی کے دن گئے، عروض کی کتابیں پڑھکر غزل گو ہونے کے دن گئے اور پُرانی ذہنیت کے زیر اثر اظہار جذبات کے دن بھی گئے۔ اب تو حسن و عشق کی شاعری کے لئے بھی نئے احساسات نئے معلومات اور نئے ادراک کی ضرورت ہے۔ آج جو ہم ادبی مذاق رکھنے والوں کو نظم کی طرف زیادہ راغب و مایل پاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ اُردو میں نئے تغزل کا منتظر ہے اور ابھی نئے تغزل کا وقت نہیں آیا ہے نہ اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہم میں ابھی پیدا ہوئی ہے، نظموں نے ہمیں بہت کچھ دیتے ہوئے بھی ہمارے تخیل و ادراک کو ذرا آسان پسند بنا دیا ہے۔ آیندہ کا تغزل شاعر اور شعر فہم دونوں سے نسبتاً سخت مطالبہ کرے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عام پسند ادب کی تخلیق عموماً ناولوں، افسانوں، نظموں، ڈراموں کی صورت میں ہو اور غزل، ادب کا مخصوص ترین اور لطیف ترین حصہ ہو جائے لیکن اگر اُردو تغزل عام پسند ہوا بھی تو صرف اس کا ایک حصہ عام پسند ہوگا۔ اس کا سب سے قیمتی حصہ انھیں کے لئے ہوگا جن میں ادب عالیہ سے متاثر و مستفید ہونے کی خاص صلاحیت ہو۔ آیندہ کے تغزل کے لئے خاص دل و دماغ کی ضرورت ہوگی۔ غزل میں ہمارے کلچر کا عطر ہوگا۔ تغزل ہمارے شعور کو وہ لطیف و نازک نکھار عطا کرے گا جو غالباً کسی اور صنف سخن کے لئے ممکن نہ ہو۔ دیگر اصناف سخن ممکن ہے شاعری کے لئے مخصوص ہو جائیں لیکن زندگی شاید غزل کی آواز ہی پر آواز دے گی۔

نقاد

"نگار" کے پچھلے پرچے

سنہ ۲۶ء: جنوری ۸ر۔ سنہ ۲۷ء: اگست عہ۔ سنہ ۲۸ء: مئی عہ، جون عہ۔ سنہ ۳۰ء: مئی ۱۲ر۔ سنہ ۳۱ء: جولائی تا دسمبر ۸ر فی پرچہ۔ سنہ ۳۲ء: جنوری ۱۲ر۔ فروری، مارچ، مئی، جون، جولائی، ستمبر، نومبر ۸ر فی پرچہ۔ دسمبر عہ۔ سنہ ۳۳ء: فروری ۸ر۔ سنہ ۳۴ء: فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ فی پرچہ۔ سنہ ۳۶ء: دسمبر ۱۲ر۔ سنہ ۳۷ء: فروری، مارچ ۱۲ر فی پرچہ۔ اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ر فی پرچہ۔ ستمبر، اکتوبر، دسمبر ۱۲ر فی پرچہ۔ سنہ ۳۸ء: فروری، اپریل تا دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ سنہ ۳۹ء: فروری تا جولائی ۴ر فی پرچہ۔ اکتوبر و نومبر ۸ر فی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

بقیہ بزم نگار

جناب امید کا شمار ان پڑھے لکھے شاعروں میں سے ہے جنکی قابلیت و ذہانت کو اُردو شاعری کے علاوہ کوئی اور میدان تلاش کرنا چاہیئے تھا۔ انھوں نے اُردو میں شاعری اس لئے نہیں کی کہ خود انھیں اس کی خواہش تھی، بلکہ وہ خود ان کا فن ہوکر رہ گئی۔ جناب امید فارسی کے نہایت اچھے شاعر ہیں اور اس زبان پر ماہرانہ عبور رکھتے ہیں، لیکن لکھنؤ میں رہنا اور اُردو غزل نہ کہنا، اُمید صاحب کی رنگینی طبیعت سے دشوار تھا۔ آپ نے کچھ دن جلال لکھنوی سے مشورہ لیا اور پھر خود اپنے ذوق کو اپنا رہبر بنایا۔ آپ کی سخن فہمی کا حال آپ کے انتخاب کلام سے ظاہر ہے کہ اگر میں خود یہ خدمت انجام دیتا تو شاید اس سے بہتر انتخاب نہ کر سکتا۔

امیر مینائی مرحوم کے ایک اور جید شاگرد جناب دل شاہجہانپوری بھی اس بزم میں شریک ہیں اور اس خصوصیت کے لحاظ سے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں، اپنے اُستاد کے بہترین تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کے کلام میں وہ بلندی پائی جاتی ہے جس سے اکثر لکھنوی شعراء متاخرین کا کلام خالی نظر آتا ہے۔ ان کا انتخاب بھی اچھا ہے گو بہت اچھا نہیں۔

لکھنؤ اسکول کے سلسلہ میں مجھے یاس کا ذکر بھی کر دینا چاہیئے۔ گو ان کا وطن عظیم آباد ہے، لیکن وہ آتش کی شاعری سے اس قدر متاثر ہیں کہ ان کو لکھنوی اسکول کی پیداوار سمجھنا چاہیئے۔ یاس سے جو معرکے یہاں لکھنؤ میں ہوئے ہیں ان کی یاد اب بھی بعض لوگوں کے دلوں میں باقی ہے۔ یاس پہلا شخص تھا جس نے لکھنؤ کے روتے اور بسورتے ہوئے رنگِ تغزل پر کاری ضرب لگائی اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ یاس ہی نے سب سے پہلے اپنے زمانہ کے لکھنوی شاعروں کے اُس رنگِ تغزل کو بدلا جو اپنا اصلی رنگ چھوڑ کر بے تمیزی کے ساتھ غالب کی تقلید پر آمادہ ہو گئے تھے۔ یاس نے غالب کے متعلق جو کچھ لکھا، میں اسے ردِ عمل سمجھتا ہوں اس شدید مخالفت کا جو لکھنوی مقلدین غالب کی طرف سے یاس کے باب میں ظاہر کی گئی اور جسے یاس ایسے حساس انسان کے دماغ کو واقعی بری طرح متاثر کرنا چاہیئے تھا، ورنہ یاس کی فطرت شاید اس کو گوارا نہ کرتی۔ یاس کی شاعری حسن و عشق کا وہ مرقع نہیں ہے، جس میں محبت کی فتادگی، خواری و تذلل تک پہونچ جاتی ہے بلکہ اس میں ہمیں ایک ایسے عشق خود دار کی جھلک نظر آتی ہے جس کا سینہ تو ضرور خونچکاں ہے لیکن لب پر آہ و فغاں نہیں۔ افسوس ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کا انتخاب بادلِ ناخواستہ کیا، ورنہ انکے یہاں جواہر ریزوں کی کمی نہیں۔

دہلی اسکول کے تین اور شاعر آپ کو اس بزم میں نظر آئیں گے۔ ایک حسرت موہانی، دوسرے آزاد انصاری تیسرے نوح ناروی حسرت کے رنگِ تغزل کے متعلق کچھ لکھنا حقیقتاً ایسا ہی ہے جیسے ہم دن کو دن کہیں۔ حسرت کی شاعری ایک ایسا آفتاب ہے جو بغیر کسی دلیل کے اپنی روشنی و حرارت ساری دنیا سے تسلیم کرا لیتا ہے۔ یہ ہر چند امیر اللہ تسلیم کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے خاندان مومن سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن سچ پوچھیے تو ان کلام میں میر، مومن و مصحفی تینوں کا اتنا صحیح امتزاج پایا جاتا ہے کہ شاید اب زمانہ اسکی دوسری مثال پیش نہ کر سکے۔

حسرت کا کلام اپنی سادگی و پُرکاری کے لحاظ سے اتنی حسین و دلکش چیز ہے کہ بجائے سننے کے اسے کلیجے میں رکھ لینے کو جی چاہتا ہے۔ ہندوستان میں اس وقت حسرت ہی تنہا شاعر ہے جس کے کلام کی داد سوائے خاموشی کے اور کسی طرح نہیں دی جا سکتی۔

حسرت کی یہ خصوصیت کہ باوصف اسی دُنیا کی شاعری کرنے کے وہ ہمارے سامنے کوئی اور آسمان و زمین پیش کر دیتا ہے ، حسرت ہی کا حصہ ہے اور اسی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے ۔

آزاد انصاری ، حالی کے شاگرد ہیں اور اُن کے تغزل میں حالی ہی کی سی سادگی نظر آتی ہے ۔ ان کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور الفاظ کی تکرار سے اپنے بیان میں بہت زور و اثر پیدا کر دیتے ہیں اور بعض شعروں میں انکا یہ انداز واقعی سحر حلال کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے

نوح ناروی ، داغ کے شاگرد ہیں اور غالباً صفِ اول کے شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے ۔ زبان کی صفائی ، محاورات کا برمحل استعمال ان کی وہ خصوصیت ہے جسے شاید انھیں کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے ۔

اب پہلے گروپ میں صرف وہ شعرا رہ گئے ہیں جن کا تعلق دہلی و لکھنؤ اسکول سے نہیں ہے اور ان میں سب سے پہلے وحشت کا نام سامنے آتا ہے ۔ وحشت بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں اور اُردو تغزل میں فارسی ترکیبوں کو گوارا و خوشنما صورت سے استعمال کرنا دفا رامپوری کی طرح ان کا خاص کارنامہ ہے ۔ پڑھا لکھا آدمی جب غزل میں اپنی قابلیت کے اظہار پر آجاتا ہے تو غزل کو بالکل برباد کر دیتا ہے ، لیکن وحشت کی خوش ذوقی نے کبھی یہ نقص اپنے کلام میں پیدا ہونے نہیں دیا ۔ ان کے یہاں یہ سب کچھ بہت توازن اور سلاست روی کے ساتھ پایا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس حیثیت سے بڑی عزت کے مستحق ہیں ۔

ناطق گلاؤٹھوی بھی تغزل کے دیرینہ گرفتار ہیں اور باوصف کسی خاص اسکول کے پابند نہ ہونے کے ان کا انداز بیان ہمیں اساتذۂ دہلی کی یاد دلاتا ہے ۔ یہ معاملات حسن و عشق کو اسی زبان میں ادا کرتے ہیں جو تغزل کے لحاظ سے معیاری چیز سمجھی جاتی ہے اور بعض اوقات یہ اپنے خیال کو ایسے پہلو سے پیش کرتے ہیں کہ سننے والا دفعتاً چونک پڑتا ہے ۔ ان کے کلام میں ایک خاص تیکھاپن پایا جاتا ہے ، جو پُرانی بات میں بھی نئی کیفیت پیدا کر دیتا ہے ۔ سلاست و روانی جو تغزل کی جان ہے ان کے کلام میں ہر جگہ پائی جاتی ہے ۔

تاجور نجیب آبادی نے گو نظمیں بھی کہی ہیں ، لیکن ان کا شمار غزل گو شعراء میں کیا جائے گا ، کیونکہ ان کا فطری ذوق جسے وہ پنجاب لیکر گئے ، یہی تھا ۔ افسوس ہے کہ یہ اپنے کلام کی شیرازہ بندی کی طرف سے بہت بے نیاز واقع ہوئے ہیں ورنہ ان کا دیوان آج سے بہت پہلے شائع ہو گیا ہوتا ۔ ان کے کلام کی خصوصیت الفاظ کا رکھ رکھاؤ اور خیال کی بلندی ہے ۔ ادنیٰ جذبات یا سخیف خیالات سے ان کی غزلیں بالکل پاک ہیں ۔

سیماب اکبر آبادی ، اپنے آپ کو آگرہ اسکول کا شاعر سمجھتے ہیں ، حالانکہ آگرہ اسکول دہلی اسکول سے علٰحدہ کوئی چیز نہیں ہے سیماب اس وقت ہندوستان کے مشہور اساتذہ میں شمار کئے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں انھوں نے اسوقت تک کافی خدمت اُردو ادب کی انجام دی ہے ۔ آپ کی شاعری کا آغاز بھی غزلوں ہی سے ہوا ہے اور یہ ماننا پڑے گا کہ تقلید و فرسودگی کو انھوں نے اپنی شاعری کا نصب العین کبھی قرار نہیں دیا ۔ جو اُپج ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں نظر آتی ہے وہی اب بھی موجود ہے اور انکی پُرگوئی ان کے غیر معمولی ملکۂ شاعری کا کافی ثبوت ہے ۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور اسی لئے ان کی لغزش مستانہ میں

بھی اک خاص قسم کی فرزانگی و ہوشیاری پائی جاتی ہے، جو ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ایک مرتبہ ان کے کلام کو سُنکر دوبارہ پڑھا بھی جائے اور سمجھا بھی جائے۔ افسوس ہے کہ ان کے انتخاب میں بہت سے ایسے اشعار نظر نہیں آتے، جن کو سب سے پہلے نظر آنا چاہئے تھا۔

فانی کی شاعری کی یہ خصوصیت کہ ہم اس سے اُن کی زندگی کا پورا حال معلوم کر سکتے ہیں، بہت کم دوسرے شاعروں میں نظر آتی ہے فانی نے اپنی عمر کا سارا حصہ سوگوارانہ بسر کیا اور یہ کیفیت ان کے ان اشعار سے بھی ظاہر ہے، جنھیں عالم سرخوشی کی پیداوار کہنا چاہئے ان کے سوز و گداز میں نہ میر و درد کی سی کیفیت ہے، نہ لکھنوی آہ و بُکا کی، بلکہ سقراط والا فلسفیانہ قسم کا صبر و ضبط پایا جاتا ہے، جسے خود اپنے سینے میں خنجر بھونک لینا کہہ سکتے ہیں۔

جگر خالص غزل گو شاعر ہیں اور ان کی یہ خصوصیت مجھے بہت عزیز ہے۔ وہ غزل کے لئے پیدا ہوئے اور انھوں نے ہمیشہ غزل ہی کہی۔ ان کے یہاں رنگینی، سوز و گداز، جوش و ولولہ، عجز و فتادگی، بیخودی و سرشاری سبھی کچھ پایا جاتا ہے اور اس قدر توازن و تناسب کے ساتھ کہ ہر شعر کانٹے کی تُلی ہوئی چیز معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام کا انتخاب مجموعہ کو سامنے رکھکر نہیں کیا بلکہ جو اشعار بے اختیار انکی زبان پر آتے گئے، انھیں کو قلمبند کر لیا اور اس میں شک نہیں کہ اس سے بہتر انتخاب انکے کلام کا ہو بھی نہ سکتا تھا

فراق اپنی اور اپنی شاعری کی عمر کے لحاظ سے دوسرے گروپ میں آتے ہیں لیکن چونکہ ان کا ذوق صرف غزل گوئی ہے اسلئے پہلے گروپ کی چیز ہیں۔

فراق کی شاعری کے متعلق میں بہت بلند رائے رکھتا ہوں جس کا اظہار میں ایک مستقل مضمون کے ذریعہ سے کر چکا ہوں۔ فراق ایک نقاد شاعر ہیں اور اس خصوصیت میں اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں۔ وہ شعر نہیں کہتا، زندگی اور محبت کے نکات پر تبصرہ کرتا ہے اور اتنا لطیف و عمیق تبصرہ کہ شاعری سے علحدہ ایک مستقل لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ فراق کی شاعری پختگی سے قبل ہی ایک ایسی حلاوت اپنے اندر رکھتی ہے کہ ہمیں اس کی پختگی کی طرف سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے گروپ میں، بینے محروم - جوش - علی اختر اختر - حفیظ - افسر - اختر شیرانی، انند نراین ملا - روش اور احسان دانش کو رکھا ہے ـــ تلوک چند محروم بہت پرانے نظم نگار ہیں، لیکن غزل کہنے کی حیثیت سے وہ اس سے زیادہ پرانے ہیں، یہی حال قریب قریب دوسرے گروپ کے تمام شعراء کا ہے جنھوں نے پہلے غزلیں کہیں اور پھر نظم کی طرف متوجہ ہو گئے ـــ ان میں حفیظ اور انند نراین ملا کو چھوڑ کر باقی تمام شعراء کے انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انھیں واقعی نظم لکھنے کے لئے پیدا کیا تھا، کیونکہ ان کی غزلوں میں بھی زیادہ تر نظم ہی کا انداز پایا جاتا ہے ـــ حفیظ کی غزلوں میں البتہ غزل کا سرایا پن موجود ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کی نظم نگاری انکا فطری میلان نہیں ـــ انند نراین ملا نے غزلیں بہت کم کہی ہیں، لیکن ان کی یہ خصوصیت کہ وہ نظموں میں بھی غزلوں کا سا لطف پیدا کر دیتے ہیں، کسی دوسرے نظم گو شاعر میں نہیں پائی جاتی ـــ افسر کی غزلوں میں بھی بہت نرمی پائی جاتی ہے اور اختر شیرانی کے یہاں بھی کافی رنگینی موجود ہے۔ جوش، علی اختر، روش اور احسان کے متعلق تفصیل سے میں اُس وقت لکھوں گا جب خالص نظم نگار شاعروں کے لئے میں دوبارہ "بزمِ نگار" منعقد کروں گا ـــ افسوس ہے کہ اپنا انتخاب جو "سلسلۂ دوآتشہ" کے عنوان سے پیش کرنے والا تھا ملتوی کر دینا پڑا۔ امید ہے کہ جلد اس وعدہ کو پورا کروں گا اور اسی وقت ہر شاعر کے متعلق تفصیلی تبصرہ بھی کروں گا۔